ماہنامہ

# دوشیزہ

مارچ 2019

سالگرہ نمبر

حمد — سباس گل — 9

نعت — نزہت وسیم — 9


## انٹرویو


یادوں کے دیپ — ادارہ — 10

انجم توقیر سے ملاقات — شاہین رشید — 14

میری بھی سنیے — رمشا خان — 18

مقابل ہے آئینہ — شازیہ اسلم — 28

ہمیں کچھ کہنا ہے — شاہین رشید — 22


## ناول


ہوائیں رخ بدل گئیں — نگہت عبداللہ — 30

شب غم کی سحر — فرح چوہدری — 223


## مکمل ناول


سالگرہ کے لیے — ام طیفور — 78

یار بے وفا — میمونہ صدف — 139


## ناولٹ


شام رنگ سیاہ — ایمل رضا — 172

اب مہرباں — فرح بخاری — 110

روبرو رخ یار — مصباح علی — 46

انمول گھڑی — نادیہ احمد — 204


## افسانے


دل ہے بچپن کا — نفیسہ سعید — 70

میلی میاوں — ثمینہ یاسمین — 135

میری لالہ — ام اقی — 201



[illegible]

کرن

37 - اردو بازار، کراچی



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے

subscriptions@khawateendigest.com



[illegible]





## کرن کتاب


بیوٹی بکس — ادارہ — 3

اس ماہ کا پھل — ادارہ — 5

معاشرتی اور نفسیاتی مسائل — ادارہ — 7

صحت — ادارہ — 9

باغبانی — ادارہ — 10

کچن اور آپ — اقصیٰ ماہ نور — 12

کرن کا دسترخوان — خالدہ جیلانی — 13

مجھے یہ شعر پسند ہے — شگفتہ سلطان — 16

مسکراتی کرنیں — روبینہ شریف — 17

کچھ موتی چنے ہیں — ادارہ — 18



مارچ 2019

جلد 41 شمارہ 12

قیمت 70 روپے


## مستقل سلسلے


کرن کرن خوشبو — شعاع عمیر — 235

یادوں کے دریچے سے — بشریٰ محمود — 238

نامے میرے نام — مدیرہ کرن — 239



[illegible]

[illegible]

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ کرن

# اداریہ

کرن کا سالگرہ نمبر پیشِ خدمت ہے۔

42 واں سالگرہ نمبر۔

اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ کرن نے وقت کی یہ طویل مسافت کامیابی سے طے کی۔ لاکھوں قارئین کے دلوں میں گھر بنایا اور بے شمار مصنفین کی صلاحیتیں کرن کے ذریعے سامنے آئیں۔

کرن کا ذکر ہو اور محمود ریاض کے بغیر ادھورا رہے گا۔ کرن کی کامیابی میں ان کی محنت اور کوشش بھی شامل ہے۔ انہوں نے کرن کا معیار مقرر کر کے اسے برقرار رکھا۔ صاف ستھرا اور اچھا ادب قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی جس سے ان کی ذہنی تربیت ہو سکے۔ وہ آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی باعث کی کرن اسی طرح جگمگا رہی ہیں۔

کرن کی کامیابی میں ہماری مصنفین کی کاوشوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ہماری مصنفین نے کرن کے لیے لکھا۔ اپنی بہترین تحریریں کرن کی نذر کیں۔ بہت سی مصنفین آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ہماری اور قارئین کی دعاؤں میں شامل ہیں۔

ہم اپنی قارئین کے بھی شکر گزار ہیں جن کے خلوص و محبت نے ہمیں حوصلہ بخشا۔ کرن کی کامیابی دراصل ہماری قارئین کی کامیابی ہے۔ ان کی آراء کی روشنی میں کرن کو ہم خوب سے خوب تر بنا سکے۔

ہماری دعا ہے کہ کامیابیوں کا یہ سفر ہمیشہ جاری رہے۔ آمین۔

## اس شمارے میں،

- کرن مل کی سالگرہ کے موقع پر قارئین سے خصوصی سروے "پھر یادوں کے دیپ جلے"،
- "ہمیں کچھ کہنا ہے" خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے شاہین رشید کا سروے،
- اداکارہ "انعم عزیز" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "ردا خان" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ مشاہدہ ہاشم" کے مقابل ہے آئینہ"،
- "ہوا میں رنج مل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول،
- فرح بخاری کا سلسلے وار ناول "شب غم کی سحر"،
- "حاصل کیا رہے" ام طیفور کا مکمل ناول،
- میمونہ صدف کا مکمل ناول "پارسائے وفا"،
- "شام رنگ سیاہ" ایمل رضا کا ناولٹ،
- مصباح علی سید کا ناولٹ "زود برد زرخ یار"،
- "ابر مہرباں" مریم بخاری کا ناولٹ،
- نادیہ احمد کا ناولٹ "انمول گھڑی"،
- نفیسہ سعید، آمنہ ثانی اور نفیسہ یاسمین کے افسانے اور مستقل سلسلے،

کرن کتاب،

معلوماتی، دلچسپ مضامین اور مزے دار ریسپیز کے ساتھ۔

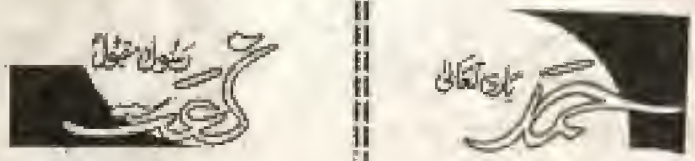



# حمد

تابش الکمالی

رنگ، خوشبو، صبا اور ہوا روشنی
میرے اللہ کی ہے عطا روشنی

میری مٹی کو، وہ جس نے کندن کیا
وہ مرا مہرباں وہ سدا روشنی

میری مشکل کو آسان جس نے کیا
درد تھا یا علم کا یا روشنی

شکر کرنے کی توفیق ہو جائے گر
مجھ کو شب میں بھی مالک دکھا روشنی

یہ کرم ہے ترا کہ ہوئی نامور
اپنی رحمت سے گل کی بڑھا روشنی

شبانہ گل

# نعت

رسول مقبول

اک اشک میسر ہو، رات کا حاصل ہو
اُس ذات اکمل کے عرفان سے جو نکلے

اک فہم میسر ہو، میری عقل کا رہبر ہو
مالک و ہادی کے قرآن سے جو نکلے

اک عشق میسر ہو، میری ذات کا حاصل ہو
یٰسین و طٰہٰ کے وجدان سے جو نکلے

اک وصل میسر ہو، میری آہ کا حاصل ہو
محشر کا دن ہو جب ایمان سے جو نکلے

اک نعت میسر ہو، میری سوچ کا حاصل ہو
در شہ کوثر پر نزہت الفاظ سے جو نکلے

نزہت وسیم

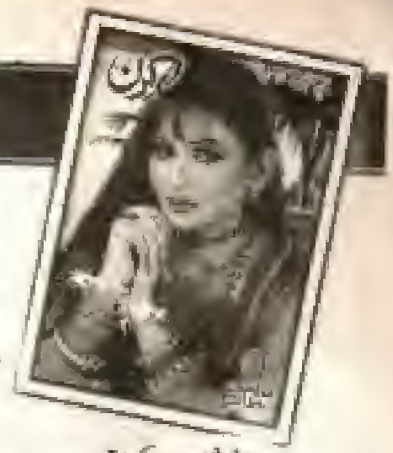

سالگرہ نمبر



# پھر یادوں کے دیپ جلے

ادارہ

یوں برستی ہیں تصور میں پرانی یادیں
جیسے برسات کی رم جھم میں سماں ہوتا ہے

ہر انسان کے ذہن میں تلخ و شیریں یادوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ لیکن کچھ یادیں ایسی پر اثر ہوتی ہیں جو ہمارے ذہن و دل پر نقش ہو جاتی ہیں اور ہماری زندگی سے متعلق ہوتی ہیں لیکن یہ تحریریں بھی ہمارے اوپر اثر چھوڑ جاتی ہیں۔

کرن کی سالگرہ نمبر میں ہماری خواہش ہوتی ہے کہ مصنفین کے ساتھ ساتھ قارئین کی بھی پرچے میں بھرپور شرکت ہو۔ اس لیے حسب روایت ہم نے "کرن" کی سالگرہ کے موقع پر قارئین سے کچھ سوالات کیے اور ان کے جوابات حاضر خدمت ہیں۔

☆ آپ اپنی سالگرہ کا دن کیسے گزارنا پسند کرتی ہیں؟
☆ سالگرہ پر کوئی خواہش جو اچانک پوری ہو گئی ہو؟

آئی رہیں گی یاد بیتے یہ محبتیں
ڈھونڈا کریں گے ہم تجھے فصل بہار میں

☆ کوئی ایسی عزیز ہستی، جس کی سالگرہ والے دن بہت یاد آتی ہو؟
☆ 2018ء میں کرن میں شائع ہونے والی کہانیوں کا کوئی مثبت یا منفی کردار جو آپ کو پسند آیا ہو؟
☆ کرن کے سلسلوں یا کرن کتاب میں کوئی ایسا موضوع جو آپ پڑھنا چاہتی ہوں؟

ثنا شہزاد ۔۔۔ کراچی

1- سالگرہ کی تاریخ آنے سے پہلے ہی میں گھر میں شور ڈال دیتی ہوں اور جو چیزیں مجھے پسند ہوں سب کے ذمے لگی ہوتی ہیں پھر دیکھتی رہتی ہوں کون لے کر آیا کون نہیں اور سالگرہ کا دن پھر وصولی کا دن ہے تو پورے جوش سے مناتی ہوں سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں، خوش رہتی ہوں اور خوب انجوائے کرتی ہوں۔

2- ظاہری بات ہے کوئی بھی خواہش اچانک پوری ہو تو خوشی سنبھالے نہیں سنبھلتی پھر اگر اس دن سالگرہ ہو تو مزے ہی مزے۔ پچھلی سالگرہ پر رات بارہ بجے عظیم بھائی، خرم بھائی، ام ہانی اور شہزاد اور ماموں نے اچانک ہمارے گھر آ کر مجھے سرپرائز دیا۔ کیک لے کر آئے یہ لوگ جب کہ ایک کیک شاہ رخ میرا بھائی بھی لے کر آیا تھا تو اس بار میں نے دو کیک کاٹے اور مجھے ان لوگوں کے آنے کی بہت زیادہ خوشی ہوئی اور تو اور اس دن میری جان سے پیاری بہن صبا بھی آئی اور وہ شیں کی کمی محسوس ہوئی جب اس کے ہوتے تھے تب وہ بھی میری برتھ ڈے والے دن ضرور آتی تھی۔

3- سالگرہ والے دن مجھے ایک ہستی کی بہت یاد آتی ہے اور وہ ہیں میری پیاری خالہ جان جو دنیا کی جواب اس دنیا میں نہیں ہیں مرنے کے بعد بھی وہ ہماری یادوں میں زندہ ہیں۔ کوئی بھی خوشی کا موقع ان کی یاد سے خالی نہیں گزرتا۔ سب انہیں بہت زیادہ مس کرتے ہیں۔ وہ تھیں ہی ایسی اچھی۔ پھر بھی انہیں آج تک نہیں بھولے۔ وہ بھی اسی طرح اچانک میری برتھ ڈے والے دن آ کر سرپرائز دیتی تھیں۔

4- 2018ء میں کئی کہانیاں ایسی تھیں جن سے متاثر ہوئی لیکن خاص الخاص مصباح علی سید کی "مجھ کو تیس" اس کہانی کے سب کرداروں نے بڑی طرح جکڑا۔ سحر ابھی تک باقی ہے۔ سلول کا کردار ایسا منفی تھا جو سزا پا کر بھی نہ جھکا۔ زندگی میں ایسے ڈھیٹ لوگ بھی ہوتے ہیں جو مر جاتے ہیں لیکن اپنی غلطی اور گناہ تسلیم نہیں کرتے۔ مثبت کردار جنید ڈاکٹر کا کمال کردار تھا دل پر پتھر رکھ کر دوستی آخری لائن تک نبھائی۔ شکیل ڈکیت اور روایتی تو ویسے ہی دل میں گھر کر گئے معصوم اور خوب صورت سچے دل کے مالک۔ لیکن دنیا سے دھوکا کھا گئے یہ میرا اب تک کا فیورٹ ناول ہے کاش کتابی شکل میں میرے ہاتھ میں ہو۔

5- کرن کتاب میں ہم لڑکیاں چاہتی ہیں کہ جاب کو اچھے طریقے سے لینا اور گھر میں کاونٹی کی سلائی کٹنگ کے طریقے بھی سکھائے جائیں۔ اچار چٹنیاں بہت سیکھ لیں اس کے علاوہ کرن کتاب بیسٹ ہے۔

ارم شہزاد ۔۔۔ کراچی

1- اپنی سالگرہ کے دن صدقہ، خیرات کر کے شکرانے کے نوافل ادا کرنا اور کیک لازمی کاٹ کر گزارنا پسند ہے۔

2- زندگی میں ایسی سالگرہ نہیں آئی ابھی تک پر ایسا ضرور ہوا تھا کہ اپنی سالگرہ کے دن میں اپنی بہت پیاری دوست سے ملی تھی وہ بھی اچانک ہی اس کے گھر جانے کا پلان بنا تھا۔

3- میں تو کسی کو یاد نہیں کرتی ہاں پر جس جس کو میں یاد ہوتی ہوں وہ مجھے وش کرتا ہے۔

4- 2018ء میں تنزیلہ ریاض کے ناول کے مشرقی، التمش اور سونیا بہت ہی اچھے کردار تھے ۔۔۔ یہ بہت پسند آئے تھے خصوصاً "سونیا" کا پراعتماد ہونا "لڑکیوں کو ایسا ہونا چاہیے ۔۔۔ دوسروں کو زیر کرنے والا۔

5- جی نہیں کوئی ایسا موضوع نہیں۔ کرن مکمل ڈائجسٹ ہے۔ اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ اللہ پاک اسے بہت زیادہ ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)

طلعت نظامی ۔۔۔ سیالکوٹ شریف

1- سالگرہ منانا، سالگرہ کا دن گزارنا وقت اور عمر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے ہمیشہ ہم ایک جیسا وقت نہیں گزار سکتے۔ جو وقت گزر جاتا ہے آتی سالگرہ تک ویسا دن نہیں رہتا۔

اب بھی دیکھیں بچپن میں جب سالگرہ کا دن آتا تھا تو امی نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہناتیں۔ کیک اور باقی چیزیں منگواتیں۔ غبارے پھلائے جاتے اور اپنی ساری دوستوں کے ساتھ خوشی خوشی سارا دن گزار دیتے۔

پھر بڑے ہوئے خود سالگرہ یاد رہتی۔ ایک انتظار ہوتی کہ آج سالگرہ ہے۔ خود کیک بنایا جاتا۔ دوستوں کی وشز کا انتظار رہتا۔ دوستوں کو گھر پر انوائٹ کرتے اور گھر والوں اور دوستوں سے زبردستی گفٹ وصول کرتے۔ کیا دور تھا۔ سارا دن ہنگامے میں گزر جاتا۔

اور اب جب بچے جوان ہیں ان کی سالگرہ تو میں ہمیشہ یاد رکھتی ہوں اور سرپرائز پارٹی بھی کرتی ہوں۔ ہم مشرقی عورتیں جب بچے ہو جائیں تو فرسٹ پرائرٹی بچوں کو دیتی ہیں۔ ان کی خوشی کو دیتی ہیں اور اپنا آپ بھلا کر بچوں کی خوشی میں خوش ہوتی ہیں۔ لیکن آج کل کے بچے بھی نہیں بھولتے وہ میری سالگرہ کو نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ پارٹی دے کر مجھے سرپرائز کر دیتے ہیں۔ میاں صاحب اور بچے گفٹ بھی دیتے ہیں باہر گھومنے بھی جاتے ہیں اور سالگرہ کا دن گزر جاتا ہے۔

2- جی بالکل ایک دن میں بچوں اور میاں صاحب کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی۔ بچوں کو ان پسند شاپنگ کروانے کے بعد مجھے ایک سوٹ بہت پسند آیا لیکن پھر اس کی پرائز دیکھ کے رکھ دیا۔ کچھ دن پہلے بھی وہی سوٹ پرائز دیکھ کے رکھ چکی تھی لیکن پسند بہت آیا تھا۔ اتنے پیسوں میں بچوں کے لیے کوئی چیز لے لوں گی (ایک ماں) اتفاق سے اسی دن

میری سالگرہ تھی اور میاں صاحب اور بیٹی نے مجھ سے چوری چھپے وہ سوٹ خرید لیا اور جب کیک کاٹتے ہوئے مجھے سوٹ گفٹ کیا تو میں حیران ہو گئی یہ آپ لوگوں نے کب خریدا بہرحال اب اسے پہن کر بہت خوشی محسوس کرتی ہوں۔

3- آہ..... کیا یاد دلا دیا آپ نے۔ سالگرہ والے دن مجھے جس عزیز ترین اور عظیم ترین ہستی کی یاد آتی ہے وہ ہیں میری پیاری امی جان۔ بھلا سالگرہ والے دن ہم اس ہستی کو کیسے بھول سکتے ہیں جو ہمیں اس دنیا میں لائیں لیکن یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اب اس عزیز ہستی کو دیکھ نہیں سکتی۔ صرف یاد کر سکتی ہوں کیونکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین) یادیں تو ابو کی بھی بہت آتے ہیں لیکن جب ابو کا بچپن میں انتقال ہو گیا تو امی نے ہمیں ماں باپ دونوں کی طرح پالا۔ اور کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ سال پہلے امی کی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی۔ ایک ماں کی ممتا کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ صرف سالگرہ والے دن نہیں ہر وقت ہر دن امی کی یاد میرے ساتھ ہے والدین کے بغیر زندگی نامکمل ہے اللہ تعالیٰ سب کے والدین کو سلامت رکھے (آمین)

ویران ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

4- 2018ء میں کوئی منفی یا مثبت کردار تو نہیں البتہ اپریل 2018ء کے کرن میں شائع ہونے والی نیئر فاطمہ کی کہانی "بہت دیر کر دی" پسند آئی تھی اس کہانی میں انہوں نے بہت اچھا پیغام دیا تھا کہ جب رشتے موجود ہوتے ہیں تو ہم ان کی قدر نہیں کرتے اور جب وہ ہمیشہ کے لیے چلے جاتے ہیں تو پھر افسوس کرنے کا کیا فائدہ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنی لمبی ناراضگیوں کا کیا فائدہ؟ جبکہ اسلام میں بھی تین دن سے زیادہ ناراض رہنے کی مذمت ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہانی پسند آئی۔ خدارا اپنے قیمتی رشتوں کی قدر کریں اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔

5- جی ہاں شکر ہے آپ نے ہم سے پوچھا میں کرن کے سلسلوں میں سے ایک سلسلہ ہے "مقابل ہے آئینہ" اس میں اپنا نام پچھلے دو سالوں سے دیکھنا چاہتی ہوں لیکن سب کے نام آئے لیکن میرا نام نہ آیا پلیز میرا نام آنے سے پہلے اس سلسلے کو بند مت کر دیجئے گا۔ شکریہ

کرن کی پوری ٹیم کو کرن کا ایک اور سال کامیابی سے طے کرنے پر بہت بہت مبارکباد۔ اللہ تعالیٰ کرن کو اسی طرح کامیابی سے نوازے اور اس کی ٹیم کو ہمیشہ خوش رکھے جو ہمارے جیسے گھر بیٹھے فارغ لوگوں کے لیے تفریح کا سامان پیدا کر رہے ہیں اور یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو گھر بیٹھے ہمیں سارے ملک کی قارئین بہنوں سے متعارف کروانے کا سبب ہے۔

### تبسم بشیر حسین..... ونگ

سب سے پہلے تو کرن کو سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد! میری دل سے دعا ہے کہ یہ ایسے ہی ترقی کرتا رہے اور اسے میرے جیسے بہت قاری ملتے رہیں (آہم) آمین! میں نے پچھلے سال بھی شرکت کی کوشش کی تھی مگر شامل نہیں کیا گیا۔ امید ہے کہ اس دفعہ ایسا نہ ہوگا! چلیں جی چلتے ہیں سروے کے سوالات کی جانب۔

1- پہلے بہت خوشی ہوتی تھی سالگرہ کی اور انتظار بھی۔ مگر اب پہلے والا چارم نہیں محسوس ہوتا۔ بس صبح گھر والے وش کرتے ہیں اور شام میں بھائی کے آنے پر کیک کاٹتی ہوں گفٹ وغیرہ لیتی ہوں اسی طرح گزرتا ہے میری (بورنگ) سالگرہ کا دن۔ ہاں اس دفعہ بہت سی دوستوں (ڈائجسٹ کی) نے سالگرہ سے پہلے وش کر دیا تو بہت خوشی ہوئی تھینک یو فرینڈز!

2- ایسی کوئی خواہش تو یاد کرنے سے بھی یاد نہیں آ رہی ہے جو اچانک پوری ہوئی ہو ویسے۔ الحمدللہ! میری آج تک ہر خواہش پوری ہوئی ہے۔

3- ایک ہی ہستی آتی ہیں اور وہ ہیں میرے "ابا" جن کی وفات میری کم عمری میں ہی ہو گئی تھی سالگرہ تو کیا ہر موقع پر، ہر دن پر جب بھی کسی کے ابا کو دیکھتی ہوں مجھے میری کمی کا احساس ہوتا ہے..... خیر ایک کرن بھی ہے جب تک یہ میرے ہاتھوں میں نہیں آتا میں کیک نہیں کاٹتی۔ کیونکہ ہم دونوں کی سالگرہ مارچ میں ہے یہ کرن مجھے 15 یا 13 کو ملتا ہے تو کیک 10 مارچ کے بجائے 15 یا 13 کو کٹتا ہے! (love you kiran) سالگرہ مبارک تبسم۔ ادارہ

4- 2018ء کیا مجھے تو ہر سال کرن کی کہانیاں پسند آتی ہیں اس سال مجھے شیزل کا ناول "جنگ" سے آتی بابا کا کردار



بے حد پسند آیا اور حتی میں نے محبت عبداللہ کی اسٹوری "ہوائیں رخ بدل گئیں" کی دریا احسان نمبر 1 پر رہی میرے نزدیک۔

5- کرن بیسٹ ہے ہر لحاظ سے اچھے تو کوئی کمی نظر نہیں آتی ہے اس میں ہاں بس ایک سلسلہ ہے جو مجھے لازمی پڑھنا ہے اور وہ ہے رائٹرز کا انٹرویو پلیز پلیز کرن میں یہ سلسلہ ضرور شروع کریں۔ باقی سب پرفیکٹ ہے۔ ایک بار پھر کرن کو سالگرہ مبارک۔ فی امان اللہ!

### فائزہ بھٹی..... پتوکی

1- سالگرہ کا دن کیسے گزارنا پسند کرتی ہوں۔ تو جناب چلیں کر دل کرتا ہے۔ ہر کوئی مجھے وش کرے..... پھول دے ہماری خوشی میں خوش ہو۔ ہماری اہمیت کو مانے..... اللہ کا شکر ہے۔ میری ہر سالگرہ پر جو میں چاہتی ہوں وہی ہوتا ہے۔ امی، ابو، بھائی، سارے پیار کرتے ہیں۔ بہنیں جو گھر پر ہوں وہ باقاعدہ پھول دے کر وش کرتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی تحفہ بھی دیتی ہیں۔ دور والی۔ فون کر کے وش کرتی ہیں۔ کزنیں جو دور ہیں وہ فون یا SMS کے ذریعے وش کرتی ہیں۔ جو قریب ہیں وہ سارا دن آتی رہتی ہیں اور وش کرتی جاتی ہیں۔

میں بھی کیک منگوا لیتی ہوں۔ ساتھ نمکو، بسکٹ، چنے چاٹ یا پیزا وغیرہ لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ اور ہر ایک کو پیش کرتی ہوں۔ اب تو ڈائجسٹ فرینڈز بھی وش کرتی رہتی ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ بھائی گھر پر نہیں ہوتے، وہ فون کر کے کسی نہ کسی کزن کو کہتے ہیں کہ آپا کو کیک لے جاؤ۔ اگر تو کزن صاحبان کو یاد رہ گیا تو ٹھیک اگر نہیں تو پھر وہ چار دن بعد آ کر سوری بول دیتے ہیں سوری بھئی بھول گیا۔ بھائی نے تو کہا تھا۔ پھر بھائی گھر آ کر پوچھیں کہ کیک آیا تھا تو سر ہلا دیتی ہوں ہاں جی۔

2- سالگرہ پر جو خواہش ہوتی ہیں ایسی لگتی ہیں۔ جن کی کبھی بڑی خواہش ہوا کرتی تھی..... وہ مجھے مل بھی گئی تو بہت اچھا لگا..... سالگرہ کے علاوہ بھی بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ میری دیرینہ خواہش پوری ہو گئی۔ جن میں سمیرا حمید کی "ادراک" [illegible] "رخصت ہو رات" [illegible] شہاب [illegible] یہ سب ناول میں بھی اور بھی بہت سی ہیں۔ اللہ سب والوں کو سلامت رکھے۔ خوش رہیں۔

3- میں کیسی ہوں کیا شعر لکھ دیا ہے..... دل کر رہا ہے کہ جواب بھی شعر میں دوں..... بعض اوقات ہوتا ہے کہ ہم چاہے لاکھ انکار کریں..... تردید کریں..... سر ہلا دیں مگر کوئی چپکے سے کان میں کہہ جاتا ہے۔

کیسے کہتے ہو کوئی یاد نہیں خاور
شام ہوتے ہی کبھی دیکھو ذرا صورت اپنی

4- میرے پاس پورے سال کے کرن نہیں ہیں۔ کرن میری کزن منگواتی ہے۔ تو اسی لیے کوئی خاص یاد نہیں ہاں جنوری 2018ء میں سحر ساجد کا ناول آیا تھا۔

"سیم زدہ" اس میں خدا بخش اور زہرا کا کردار بہت پسند آیا تھا۔ دونوں مثبت کردار تھے دونوں ہی اچھے ہیں۔ اب مومن کا کردار ہے جو اچھا لگ رہا ہے۔

5- سب کچھ اچھا چل رہا ہے..... کوئی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

### نوشین سلیم..... کراچی

1- میں اپنی سالگرہ کا دن اپنی فیملی اور فرینڈز کے ساتھ گزارنا پسند کرتی ہوں۔

2- جی میرا موبائل خراب ہو گیا تھا اور میں نے خواہش کی کہ میرے بھائی مجھے موبائل گفٹ کریں اور انہوں نے میری یہ خواہش پوری کر دی۔

3- وہ ایسی عزیز ہستیاں ہیں جن کی مجھے صرف سالگرہ والے دن نہیں بلکہ ہر دن ہر پل ہر لمحے یاد آتی ہے اور وہ دو ہستیاں میرے امی اور ابو ہیں جنہیں میں اور میرے بہن بھائی بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

4- مجھے 2018ء کی ہر کہانی ہی پسند آئی۔ میری بہن ثمرین کو "محور تشنگی" پسند آئی اس کہانی کا ہر کردار وہ آج تک نہیں بھولی بلکہ وہ تو مصباح علی کی دیوانی ہو گئی ہے یہ اسٹوری پڑھ کر اور مجھے بھی بہت زیادہ پسند آئی تھی جس کا کریکٹر میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ ہیں ڈاکٹر دانش حسن علی۔

5- کرن ہر لحاظ سے بالکل پرفیکٹ ہے اس میں صرف محبت پر کہانی نہیں لکھی جاتی بلکہ ہر موضوع پر کہانی لکھی جاتی ہے کرن میں ہر تفریح موجود ہے میری تو تنہائی کا ساتھی ہے یہ اور میں ہمیشہ اس کے ساتھ جڑی رہتی ہوں۔

☆☆☆

# انعم تنویر سے ملاقات

شاہین رشید

آج کل نئے چہروں جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی شامل ہیں دھوم مچائی ہوئی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ سب ہی نوجوان بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ چینلز بہت ہیں تو کام بھی بہت ہیں۔ اور مقابلے کے اس دور میں اپنی جگہ بنانا اور اپنا نام بنانا بہت مشکل ہے۔ مگر کامیاب وہی ہوتے ہیں جو اپنے منفرد انداز سے ناظرین کو متاثر کرتے ہیں اور ایسے ہی منفرد انداز میں کام کرنے والی فنکارہ انعم تنویر ہیں جو متعدد ڈراموں میں کام کر چکی ہیں۔ مگر ان کا ڈرامہ سیریل ''نور زندگی'' نے ان کے لیے مزید راستے ہموار کر دیے ہیں۔

O ''کیا حال ہیں انعم؟''

☆ ''اللہ کا شکر ہے۔''

O ''کیا ہو رہا ہے آج کل؟''

☆ ''بس کام کام اور کام۔''

O ''گڈ...... ماشاء اللہ بہت اچھی پرفارمر ہو...... تو آمد کیسے ہوئی اس فیلڈ میں؟''

☆ ''میں اس فیلڈ میں حادثاتی طور پر آئی ہوں۔ میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کام کرتی تھی ایجنسی کا نام JWT تھا اور انٹرن شپ کر رہی تھی۔ کام کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کرنے سے بہتر ہے کہ میں کیمرے کے سامنے کام کروں، تاکہ مجھے اندازہ ہو کہ میں کتنی باصلاحیت ہوں اور مجھے اپنا کام دیکھنے کا بھی موقع ملے اور سچی بات ہے کہ نہ میں ایک جگہ ٹک کر کام کر سکتی ہوں اور نہ ہی مجھے آفس میں بیٹھ کر کام کرنا پسند تھا۔ میں ذرا جدت پسند ہوں اس لیے کیمرے کے سامنے آنے کا فیصلہ کیا۔''

O ''تو کیا یہ ایک سا کام نہیں ہے؟''

☆ ''نہیں بالکل نہیں ہے۔ یہ تو بہت ورائٹی والا کام ہے۔ روز نیا کردار کرنا۔ یہ ورائٹی کیا کم ہے۔''

O ''گھر والوں نے کہا کہ کیمرے کے آگے کام نہیں کرو؟''

☆ ''نہیں جی...... گھر والوں نے کوئی اعتراض





نہیں کیا۔ بلکہ اگر میں گھر میں زیادہ نظر آؤں تو کہتے ہیں کہ کام کیوں نہیں کر رہیں...... بتاؤ زیادہ پروجیکٹ کرو کیونکہ تمہارے خرچے بہت ہیں۔''

O ''پہلا ڈرامہ کون سا تھا اور کون سا ڈرامہ ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا؟''

☆ ''میرا پہلا ڈرامہ ''میرے درد کو جو زباں ملے'' تھا اور ''نور زندگی'' کو ٹرننگ پوائنٹ تو نہیں کہوں گی کیونکہ اس سے پہلے میں کافی ڈرامے کر چکی تھی۔ البتہ اس سیریل نے مجھے زیادہ شہرت دی۔''

O ''دیگر ڈراموں کے بارے میں بھی بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ گھر میں کوئی آپ کے نقش قدم پر چلا؟''

☆ ''میرے دیگر ڈراموں میں ''دل برباد''، ''کبھی ان کہی''، ''میرے ہرجائی''، ''جورو کا غلام'' اور ''نور زندگی'' ہے۔ کچھ ڈرامے انڈر پروڈکشن ہیں اور جہاں تک یہ کہ گھر میں کوئی میرے نقش قدم پر چلا تو ہم تین بہنیں ہیں اور میں گھر میں بڑی ہوں۔ دو جو چھوٹی ہیں ان کی شادی ہو چکی ہے جبکہ میرا ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے ابھی مجھے اس فیلڈ میں بہت کام کرنا ہے۔''

O ''اوہ...... اچھا...... سنا ہے کہ آپ آرٹیکلز بھی لکھا کرتی تھیں کیا...... ایسا ہے؟''

☆ ''جی بالکل ایسا ہے۔ دوران تعلیم میں نے ایک انگریزی اخبار میں ایڈیٹر کے نام ایک مراسلہ لکھا تھا۔ وہ چھپا اور ایڈیٹر کو پسند آیا تو انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا کہ آپ ہمارے لیے کچھ لکھیں۔ مجھے لکھنے کا شوق تو تھا ہی۔ اس سے اچھی آفر اور کیا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا۔ اور مجھے لکھنے کا معاوضہ بھی ملنے لگا۔ پھر کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں جاب مل گئی تو لکھنے کا عمل رک گیا۔ ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کچھ عرصہ کام کیا اور کچھ اختلافات کی بنیاد پر میں نے جاب چھوڑ دی اور ویسے بھی میں نے آپ کو بتایا کہ



میں ایک جگہ بیٹھ کر کام نہیں کر سکتی اور یہی سوچا کہ کیمرے کے سامنے کام کروں اور بس پھر آپ کے سامنے ہوں۔''

O ''لکھنے کا فن بھی ورثے میں ملتا ہے۔ تو گھر میں کوئی تھا کہ جس کی وجہ سے آپ میں بھی لکھنے کا شوق ہوا؟''

☆ ''جی...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ لکھنے کا فن بھی ورثے میں ملتا ہے۔ تو میرا تعلق ایک ادبی گھرانے سے ہے۔ میرے دادا بہترین مصور تھے اور میرے پردادا معروف شاعر تھے۔ دادا کی خوبصورت پینٹنگز ہمارے گھر کی سجاوٹ میں اضافہ کرتی ہیں۔ میرے والد آرکیٹیکچر ہیں اور ساتھ ہی ہمارا پکوان کا بزنس بھی ہے۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔''

O ''جیسا کہ آپ نے بتایا کہ آپ گھر میں بڑی ہیں۔ یعنی پہلی اولاد تو بہت لاڈ پیار ملا ہوگا۔ پیار نے بگاڑا یا سنوارا؟''

☆ ''بقول امی کے کہ لاڈ پیار نے بگاڑا ہے کیونکہ میرے والد مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مگر میری تربیت کے معاملے میں وہ کافی سخت رہے۔ یہ

والدین کی تربیت ہی تو ہے کہ آج میں اس فیلڈ میں بھی ایک کامیاب فنکارہ کے طور پر کام کر رہی ہوں۔ تعلیمی میدان میں بھی میں نے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور وہ بھی زیبسٹ یونیورسٹی سے۔ میرے والدین کو مجھ پر فخر ہے۔"

○ "بچپن میں کیسی تھیں۔ شرارتی یا پڑھاکو؟"

☆ "شرارتی بھی تھی اور پڑھاکو تو نہیں، مگر ایک اچھی طالبہ ضرور تھی اور میری تعلیم 2013 میں مکمل ہوئی اور بچپن میں اپنی شرارتوں سے کسی کو تکلیف نہیں دیتی تھی۔ البتہ میں ضدی ضرور تھی۔ بچپن میں اگر کوئی میرا بسکٹ کھا لیتا تو جب تک پورا پیکٹ وصول نہیں کر لیتی تھی، روتی رہتی تھی۔ تو بس ایسے ہی بچپن گزر گیا۔"

○ "اچھا یہ بتائیں کہ کیمرے کے سامنے آنا آسان لگا یا بہت مشکل؟"

☆ "شروع میں تو بہت مشکل لگا گھبراہٹ بھی ہوئی مگر پھر سوچا کہ ایسے کیسے کام چلے گا۔ چنانچہ ہمت کی اور اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اور اب تو کیمرا اچھا دوست بن گیا۔"

○ "اب جبکہ کیمرے سے دوستی ہو گئی تو یہ فیلڈ کیسی لگتی ہے۔"

☆ "بہت اچھی فیلڈ ہے اور یہ ایک ایسی چمکتی دمکتی دنیا ہے کہ یہاں آپ کو ہر طرح کے لوگ ملیں گے۔ بس اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنے آپ کو اس فیلڈ میں شوبز کی دنیا میں کس طرح ایڈجسٹ کرتے ہیں۔"

○ "اچھا آپ نے بتایا کہ آپ انگریزی اخبار میں لکھتی تھیں تو پیسے بھی ملتے تھے۔ کچھ یاد ہے کہ ایک مضمون کے کیا ملتے تھے؟"

☆ "جی بالکل یاد ہے — مجھے پہلا مضمون لکھنے کے 3000 ملے تھے اور یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات تھی کہ میں بھی کمائی کے قابل ہو گئی ہوں۔"

○ "کہاں خرچ کیے تھے؟"

☆ "اتنی بڑی رقم تو تھی نہیں کہ کسی کو حصے دار بناتی لہٰذا اپنے لیے ہی کچھ خرید لیا۔"

○ "آپ تو ماشاءاللہ خوب کما رہی ہیں تو کیا خواہش ہے کہ کوٹھی بنانا ہے یا پراپرٹی؟"

☆ "میری خواہش بلکہ حسرت ہے کہ میرا اپنا ذاتی گھر ہو۔ جہاں ایک بڑا باغ ہو اور ایک پیٹ ہاؤس ہو جہاں میں اپنے کتے اور بلیاں پال سکوں۔ پالے ہوئے تو میں نے ابھی بھی ہیں۔ مگر پھر بھی زیادہ اچھے طریقے سے پال سکوں گی۔"

○ "جو کردار آپ کرتی ہیں۔ وہ آپ کی شخصیت کے کتنے قریب ہوتے ہیں؟"

☆ "میرے حصے میں زیادہ تر نیگیٹو رول آتے ہیں تو ظاہر ہے کہ میری شخصیت ایسی نہیں ہے۔ میں اس کے بالکل برعکس ہوں۔ اور یقیناً آپ کے دل میں یہ خیال آ رہا ہوگا کہ میں نیگیٹو رول کیوں کرتی ہوں۔ تو اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس میں اداکاری کا مارجن زیادہ ہوتا ہے اور اس قسم کے رول بہت دیر تک یاد بھی رہتے ہیں۔"

○ "ویسے کیا دل چاہتا ہے کہ کس قسم کے رول ملیں آپ کو؟"

☆ "اداکاری میری محبت میرا جنون ہے اس لیے مجھے کسی بھی قسم کے رول ملیں گے تو میں ضرور کروں گی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کسی بھی قسم کے رول کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ ویسے، پاگل، دوغلی یا خوانف کا رول ملے تو ضرور کروں گی۔"

○ "فلم کی آفر آئے تو؟"

☆ "تو اس سے زیادہ خوشی کی بات ہی نہیں ہے۔ ضرور کروں گی خواہ اپنی پاکستان کی فلم ہو یا دیار غیر کی فلم میں کام کرنا میرا ارمان ہے اور میں ضرور کروں گی اور میری خواہش کہ مجھے لیڈنگ رول ملیں۔"

○ "کچھ ادھر ادھر کی بھی باتیں ہو جائیں — کیا چہرے بولتے ہیں؟"

☆ "کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "ایج از جسٹ آ نمبر" واقعی چہرے بولتے ہیں۔ میں اگر اندر سے خوش ہوتی ہوں تو



میرے چہرے سے سب کچھ عیاں ہو رہا ہوتا ہے اور جب پریشان ہوتی ہوں تب بھی چہرہ بولتا ہے۔ خوشی میں سکون میں چہرے کی رونق آپ کو کم عمر ظاہر کرتی ہے جبکہ ٹینشن اور پریشانی میں آپ اپنی عمر سے بھی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے سب کو کہوں گی کہ خوش رہا کریں اور پریشانیوں کو اپنے سر پر اتنا نہ سوار کریں کہ چہرہ بولنے لگے۔"

○ "پریشان حال لوگ تو محفل میں بھی تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ آپ نے بھی کسی محفل میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا؟"

☆ "اللہ کا شکر ہے کہ کبھی کسی محفل میں تنہائی محسوس نہیں ہوئی البتہ جب میں ٹریول کر رہی ہوتی ہوں تو تنہائی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ میں اکثر ہی اکیلی ٹریول کر رہی ہوتی ہوں۔ اور جب میں کسی محفل میں ہوتی ہوں تو انجوائے تو کرتی ہوں۔ مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سب لوگ مجھے ہی دیکھ رہے ہیں۔"

○ "آپ کے فینز بھی تو دیکھ رہے ہوتے ہوں گے۔ پھر کیا کیفیت ہوتی ہے؟"

☆ "اچھا تو بہت لگتا ہے فینز جب تعریف کرتے ہیں۔ مگر تصویر بنوانا میرے لیے ذرا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے تصاویر بنوانا پسند نہیں۔ مگر لوگوں کی محبت میں تصاویر اور سیلفیز بنوانا پڑتی ہیں۔"

○ "مصروفیت کی بنا پر گھر والوں اور گھر کے کاموں کو کتنا وقت دیتی ہیں؟"

☆ "میری پہلی ترجیح میرا گھر، میرے والدین اور گھر کے کام ہیں اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جو لڑکیاں شوبز میں ہوتی ہیں اور سیلیبریٹی بن جاتی ہیں انہیں نہ گھر کے کاموں سے دلچسپی ہوتی ہے اور نہ ہی کھانے پکانے سے۔ جبکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ مجھے بہت اچھے کھانے پکانے آتے ہیں۔ مثلاً بریانی، کڑاہی، اسٹیک، پائیز اور چائنیز تو بہت اچھے بنا لیتی ہوں۔"

○ "آپ نے کہا کہ تصاویر بنوانے کا شوق نہیں تو آپ نے ماڈلنگ بھی تو کی ہے؟"

☆ "جی — بالکل کی ہے اور اس میں جو تصاویر کھنچی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کام کے حوالے سے ہی ہوتی ہیں۔ لیکن جو بلاوجہ کی تصاویر ہوتی ہیں وہ بنوانا پسند نہیں۔"

○ "ملک سے باہر جانے کا اتفاق ہوا تو کیا لگا؟"

☆ "مجھے امریکا جانا بہت اچھا لگتا ہے۔ وہاں کے قوانین بہت اعلا ہیں۔ بلکہ پوری دنیا کے ہی بہت اچھے ہیں۔ امریکا کے لوگ بہت اچھے ہیں اور وہ دل کے بہت صاف ہوتے ہیں۔"

○ "اچھا..... اگر وہاں مستقل رہنا پڑے تو؟"

☆ "کوئی بات نہیں رہ جاؤں گی اور کون ایسا ہوگا جو وہاں کی شہریت نہ لینا چاہے گا۔ اور مجھے ہی کیا کسی کو بھی وہاں مستقل رہنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

○ "فارغ اوقات کے کیا مشاغل ہیں؟"

☆ "میں زیادہ تر شعر و شاعری کی کتابیں پڑھتی ہوں۔ بانو قدسیہ، اشفاق احمد، غالب، فیض احمد فیض میرے پسندیدہ ادیب و شاعر ہیں اور مجھے ان کو پڑھنا اچھا لگتا ہے۔"

میری بھی سنیئے

# رمشا خان

شاہین رشید

1۔ "پورا نام؟"

☆ "رمشا خان"

2۔ "دوست احباب گھر والے کس نام سے پکارتے ہیں؟"

☆ "میری دوستیں مجھے "رامو" کہتی ہیں اور میری امی مجھے "امیا" کہتی ہیں۔ بچپن میں بہت زیادہ کہتی تھیں اب کم کم کہتی ہیں اور نام سے ہی پکارتی ہیں۔"

3۔ "دنیا میں آمد؟"

☆ "23 جون 1994ء کراچی۔"

4۔ "بہن بھائی؟"

☆ "بس ہم دو ہی بہنیں ہیں۔ ایک مجھ سے چھوٹی ہے۔"

5۔ "کس درجے پر تعلیم مکمل ہوئی۔"

☆ "گریجویشن رکھ میں ایم بی اے کرنا چاہتی ہوں اور ان شاء اللہ کروں گی۔"

6۔ "شادی؟"

☆ "ابھی سوچا نہیں۔ ابھی بہت کام کرنے ہیں۔"

7۔ "ستاروں پر یقین؟"

☆ "میرا ستارہ جیمینائی + کینسر ہے اور اتنا یقین ہے کہ دونوں کے اثرات میری شخصیت پر ہیں۔"

8۔ "میری کمائی کا بڑا مقصد؟"

☆ "میں اپنا ذاتی گھر بنانا چاہتی ہوں۔"

9۔ "شوبز اچھائی اور برائی؟"

☆ "ابھی تک تو سب کچھ سیٹ لگ رہا ہے اور برائی میں سے بھی انسان کو اچھائی ڈھونڈ لینی چاہیے۔"

10۔ "پہچان کس ڈرامے نے دی؟"

☆ "وہ ایک پلی" پہلا ڈرامہ اور پہلی پہچان ہی بڑا۔ بہت خوش تھی میں۔"

11۔ "کس کو دیکھ کر کام کرنے کو دل چاہا؟"

☆ "شوبز میں تو بہت بعد میں آئی۔ البتہ جب میں امی کو کام کرتے دیکھتی تھی تو میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں بھی کام کروں۔ بس کام کے لیے گھر سے نکلی اور اللہ نے کامیابی دی۔"

12۔ "میری زندگی کا مشن؟"

☆ "اپنی امی کو ہمیشہ خوش دیکھوں۔ ان کی خدمت کروں اور ان کی ہر خواہش پوری کروں۔"

13۔ "کاش" کب کہتی ہیں؟"

☆ "میری زندگی میں ایسا کوئی "کاش" نہیں ہے۔ البتہ جب مجھے لگتا ہے کہ میں تھوڑی موٹی ہو گئی ہوں تو ضرور کہتی ہوں کہ "کاش" میں تھوڑی دبلی ہو جاؤں۔"

14۔ "میں شکر گزار ہوں؟"

☆ "اپنے رب کی کہ اس نے میری ہر خواہش پوری کی اور اپنے والدین کی کہ جنہوں نے میری بہت اچھی تربیت کی۔ اور مجھے بہت اچھا بنایا۔"

15۔ "زندگی میں مخلص کس کو پایا؟"

☆ "پرائے لوگوں کو..... اپنے تو ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔"

16۔ "وہ جملے جو سوڈا اچھا کر دیتے ہیں؟"

☆ "جب میں پریشان ہوتی ہوں اور کوئی مجھے کہے کہ پریشان نہیں ہو۔ اللہ سب بہتر کر دے گا۔ تو وقتی طور پر تسلی آ جاتی ہے۔"

17۔ "کھانے کے لیے کہاں جانے سے انکار نہیں کرتی؟"

☆ "دودریا" میری پسندیدہ جگہ ہے۔"

18۔ "مرد حضرات کی ایک عادت جو بری لگتی ہے؟"

☆ "جھوٹ بہت بولتے ہیں۔"

19۔ "آج کل میرے آن ایئر ڈرامے؟"

"خود پرست" اور "کیسا ہے نصیباں" دونوں ٹاپ ہیٹ میں ہیں۔ بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔"

20۔ "ایک کردار جو کرنا چاہتی ہوں؟"

☆ "میری خواہش ہے کہ مجھے ایک نفسیاتی لڑکی کا کردار ملے۔ وہ کردار بہت محنت والا اور چیلنجنگ ہوگا۔"

21۔ "راہ چلتے بدمعاشوں سے میرا رویہ؟"

☆ "میں تو اکثر اگنور کرتی ہوں۔ مگر میری امی سے برداشت نہیں ہوتا اور وہ چپل اتار کر مارنے کے لیے دوڑتی ہیں۔ وہ کسی کو نہیں بخشتیں۔"

22۔ "کسی ملک میں مستقل رہنا پڑے تو؟"

☆ "میرا انتخاب پاکستان ہی ہوگا اور میں کشمیر میں رہنا پسند کروں گی کہ ہمارا آزاد کشمیر بہت خوب صورت ہے۔"

23۔ "بیگ میں لازمی رکھتی ہوں؟"

☆ "Mint تاکہ منہ فریش رہے۔ میک اپ باکس، چارجر اور کچھ پیسے ضرورت کے۔"

24۔ "میں اکثر پچھتاتی ہوں؟"

☆ "جب کسی کام میں لیٹ ہو جاتی ہو۔ شو کوئی بھی کام۔ میں ہمیشہ لیٹ ہو جاتی ہوں اور ہر بار اپنے آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اب دیر نہیں کروں گی۔ مگر "بے سود"۔"

25۔ "کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں؟"

☆ "جب غصے میں ہوتی ہوں۔ اور غصے کا اظہار کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ کھانا چھوڑ دیں۔ گھر والے سب نرم ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر ماں۔"

26۔ "گھر میں کھانے کی بہترین جگہ؟"

☆ "میرا بیڈ، کیونکہ جتنی بے تکلفی کے ساتھ ہم

اپنے بیڈ پر بیٹھ کر کھا سکتے ہیں، لیکن نہیں کھا سکتے۔"

27۔ "کس کھانے سے انکار نہیں کر سکتی؟"

☆ "بریانی ہے ..... بہت پسند ہے۔"

28۔ "میری اچھی عادت؟"

☆ "بدلہ نہیں لیتی، معاف کر دیتی ہوں۔"

29۔ "تنقید کب بری لگتی ہے؟"

☆ "بلاوجہ کوئی تنقید کرے اور اس انداز میں کرے کہ جیسے وہ مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا ہو تب پھر مجھ سے تنقید برداشت نہیں ہوتی۔"

30۔ "چھٹی کے دن کیا کرتی ہوں؟"

☆ "جب چھٹی ہوتی ہے تو کرنا کیا ہے۔ بے انتہا خوشی ہوتی ہے کہ آج جی بھر کے سوؤں گی۔"

31۔ "کس ایجاد کے بغیر زندگی ادھوری ہوتی؟"

☆ "ہر ایجاد کے بغیر..... سب زندگی کی اہم ضرورت بن جاتی ہیں۔ جیسے موبائل اور کمپیوٹر، پتا نہیں اس کے بغیر کس طرح جیتے تھے۔"

32۔ "امی نے جس بات پر بہت ڈانٹا؟"

☆ "گھر کے کام نہ کرنے پر..... اور ابھی بھی پڑتی ہے کیونکہ گھر کے کام کرنا مجھے بچپن سے ہی پسند نہیں ہے۔"

33۔ "صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں؟"

☆ "نہیں..... الارم پر آنکھ کھل جاتی ہے تو پھر پندرہ منٹ کے لیے سو جاتی ہوں۔ مگر کب تک آخر اٹھ ہی جاتی ہوں۔"

34۔ "صبح اٹھ کر پہلا کام؟"

☆ "میں منہ دھوتی ہوں کیونکہ جب میں سو کر اٹھتی ہوں تو میری آنکھیں سوجی ہوئی ہوتی ہیں کہ جو ٹھنڈا پانی ڈالنے سے ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"

35۔ "صبح اٹھ کر کس چیز کی طلب ہوتی؟"

☆ "چائے کی اور وہ بھی بیڈ پر لیٹی بیٹھی۔"

36۔ "بھوک میں کیفیت؟"

☆ "میں ماشاء اللہ کافی خوش خوراک ہوں، اگر بھوک میں کھانا نہ ملے تو پھر میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔"

37۔ "خود کو کیسا دیکھتی ہوں؟"

☆ "برائٹ۔ میری خواہش ہے کہ میں دنیا کی بہترین پرفارمر بن جاؤں اور میری اداکاری کو سب سراہیں۔ مجھے انتظار ہے اس دن کا۔"

38۔ "رات دیر تک جاگنے کی عادت ہے؟"

☆ "نہیں جی..... میرا تو دل چاہتا ہے کہ گیارہ بارہ بجے سو جاؤں..... مگر جب شوٹ سے دیر سے آؤں تو پھر سوتے سوتے ٹائم لگ جاتا ہے۔"

39۔ "کن کیڑے مکوڑوں کو دیکھ کر چیخیں نکل جاتی ہیں؟"

☆ "چھپکلی اور کالے رنگ کے چوہے سے جان جاتی ہے میری ان کو دیکھ کر۔"

40۔ "بارش برسات پسند ہے؟"

☆ "بہت پسند ہے مگر بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک اور ایک دم سے بادلوں کی وجہ سے جو اندھیرا چھا جاتا ہے اس سے مجھے بہت خوف آتا ہے۔"

41۔ "اپنے لیے ایک چیز جو خریدی؟"

☆ "اپنی کمائی سے ایک قیمتی موبائل خریدا تھا۔"

42۔ "دھوکا کون دیتا ہے؟"

☆ "کوئی بھی دے سکتا ہے۔ کسی کے چہرے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کتنا شریف ہے یا کتنا دھوکے باز۔"

43۔ "اس فیلڈ میں کس کی فین ہوں۔"

☆ "بہت لمبی فہرست ہے۔ صائمہ نور، صبا قمر، شاہ رخ خان، نعمان اعجاز، آصف رضا میر، آمنہ شیخ، نحل علی، ثمینہ پیرزادہ اور بہت سے دیگر۔"

44۔ "اپنا اکاؤنٹ ہے یا جوائنٹ؟"

☆ "نہ اپنا نہ جوائنٹ..... اپنی ساری کمائی امی کو دے دیتی ہوں۔ وہ سیاہ کریں یا سفید ان کے اختیار میں ہے۔"

45۔ "فضول خرچ ہوں؟"

☆ "جی بالکل..... فضول خرچ ہوں۔ ہاتھ میں پیسہ ہو تو بہت فراخ دلی سے خرچ کرتی ہوں۔"

46۔ "پیسہ قسمت سے ملتا ہے یا محنت سے؟"

☆ "محنت سے۔ پیسہ کمانا آسان نہیں ہے۔ قسمت بھی اچھی ہونی چاہیے۔"

47۔ "بچپن کی بری عادت؟"

☆ "بہت ضدی ہوں۔ کسی کام کو کرنے یا کسی چیز کو حاصل کرنے کا ٹھان لوں تو پھر حاصل کر کے رہتی ہوں۔"

48۔ "ذائقہ کس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ گھر کی خواتین یا ماہر شیف میں؟"

☆ "ذائقہ کسی کی میراث نہیں۔ کسی کے بھی ہاتھ میں ہو سکتا ہے۔ گھریلو خواتین ہوں یا پروفیشنل خواتین، مرد ہوں گھر کے یا شیف، جو دل سے پکائے گا ذائقہ آئے گا۔"

49۔ "کیا بھول جانے پر واپس گھر آتی ہوں؟"



☆ "موبائل فون..... اب کہاں گزارا ہے اس کے بغیر۔"

50۔ "کسی بھی کام کے لیے مشورہ کس سے لیتی ہیں۔"

☆ "اپنے دل سے، دماغ سے اور اپنی ماں سے اور سب سے اچھا مشورہ ماں کے بعد میرا دل دیتا ہے۔"

**سرورق کی شخصیت**

ماڈل ---- صنا اثرہ

میک اپ ---- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافر ---- موسیٰ رضا

سالگرہ نمبر



# ہمیں کچھ کہنا ہے

شاہین رشید

اقبال بانو: ناول نگار..... ڈرامہ نگار

1۔ میں سمجھتی ہوں کہ عورت کا صرف ایک ہی دن نہیں ہونا بلکہ سال کے 365 دن عورت کے ہوتے ہیں۔ یا ہونے چاہئیں۔ میں مرد حضرات سے یہ کہنا چاہوں گی کہ آپ عورت کو بے شک کچھ نہ دیں، مگر اسے عزت ضرور دیں۔ اگر آپ عورت کو بہت دولت دیتے ہیں۔ محبت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ اسے محل میں رکھتے ہیں۔ سونے کا نوالہ کھلاتے ہیں۔ مگر عزت نہیں دیتے تو پھر ان آسائشوں کا کیا فائدہ۔ عورت ہر بات سہہ جاتی ہے مگر بے عزتی نہیں سہہ پاتی۔ اگر یہ سب وہ برداشت کرتی ہے تو یہ اس کی بہت بڑی مجبوری ہوگی۔ سمجھنا ہوگا۔ اپنے پر جبر اور صبر ہے اور جس طرح آپ اپنی ماں بہن کی عزت کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنی بیوی کی بھی عزت کریں اور اس معاشرے کی ہر عورت کو عزت دیں۔ کیونکہ اس معاشرے کی ہر عورت قابل احترام اور عزت کے قابل ہے۔

## ہمیں کچھ کہنا ہے

کہتے ہیں کہ دن منانے سے کیا ہوتا ہے۔ جذبات کا اظہار کرنا ہے تو روزانہ کریں۔ بھلا ایسا کیسے ممکن ہے۔ اس لیے ہمیں دن منانے چاہئیں۔ خواہ وہ ماں کا ہو، باپ کا ہو یا خواتین کا عالمی دن ہو۔ اپنے احساسات اپنے محسوسات کا اظہار کریں۔ بتائیں کہ ہم ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ بتایئے کہ ان کی ہماری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ شکوے ہیں تب بھی اظہار کریں۔ محبت ہے تب بھی اظہار کریں..... 8 مارچ خواتین کا عالمی دن ہے اور اس دن کی مناسبت سے ہم نے بھی خواتین سے دو سوال کیے۔

1۔ خواتین کے عالمی دن پر آپ مرد حضرات سے کچھ کہنا چاہیں گی؟

2۔ کیا خواتین کو کمانا چاہیے؟ ہاں تو کیوں اور نہیں تو کیوں؟



2۔ اگر ضرورت ہو تو عورت کو ضروری جاب کرنی چاہیے۔ اس طرح وہ نہ صرف ایکٹو رہتی ہے بلکہ اس کی آمدنی سے گھریلو حالات بھی بہتر رہتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اگر گھر میں خوش حالی ہو تو لڑائی جھگڑے بھی نہیں ہوتے۔ مہینے کے آخر میں چخ چخ جھک جھک نہیں ہوتی۔ سارے جھگڑے تو پیسے کے ہیں۔ اس لیے عورت کو ضرور کمانا چاہیے۔ شوقیہ نہیں ضرورت کے تحت۔ جو شوقیہ کماتی ہیں وہ اپنی ساری کمائی لپ اسٹک، میک اپ میں لگا دیتی ہیں جو کہ غلط ہے عورت اپنی کمائی سے گھریلو ضرورت کو بھی پورا کرے۔

شمیلا سکندر..... فری لانس صحافی.....
ڈائریکٹر آپ کمیونیکیشن

1۔ خواتین کے عالمی دن کے موقع پر میں مردوں سے یہی کہوں گی کہ عورت کا آپ سے جو بھی رشتہ ہو وہ عزت کا متقاضی ہوتا ہے۔ آپ خواہ کتنے ہی جتنی بھی محبت کرلیں لیکن اگر عزت و احترام نہیں دے سکتے۔ تو وہ محبت گلے کا طوق بن جائے گی۔ جس سے جان چھڑانے کی کوشش ہوتی رہے گی۔ خواتین کو سب سے زیادہ اپنی عزت نفس عزیز ہوتی ہے۔ اس لیے ہر عورت کی عزت نفس کا احترام کریں۔

2۔ کمانا یا نہ کمانا عورت کی اپنی چوائس ہوتی ہے۔ یا ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہ کرے۔ آج کل معاشی حالات جس قسم کے ہیں اس میں میاں بیوی دونوں کو ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ جس کے بعد گھر کی گاڑی ٹھیک طرح سے چلتی ہے۔ لیکن ایسی فیملی جہاں معاشی پریشر نہ ہوں۔ اگر وہاں کوئی خاتون کام کرنا چاہے تو اسے روکنا نہیں چاہیے..... ہاں ایک بات ہے کہ فیملی لائف سے آگے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ فیملی ہر عورت کی پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں۔

تبسم تالی..... رائٹر، ڈرامہ نگار..... ہاؤس وائف

1۔ مرد کو مرد بننا چاہیے۔ عورت کے پلو سے لپٹ کر اپنا ہر درد اس کے حوالے نہ کرے۔ بلکہ اس کا دکھ بانٹے عورت کو صنف نازک ہی رہنے دے اس پر بوجھ نہ ڈالے۔

2۔ جی..... عورت کو ایک دائرہ حد میں رہ کر ضرور کمانا چاہیے۔ اللہ نے جو صلاحیتیں اسے دی ہیں ان کا استعمال کرتے ہوئے، اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی کو اچھا بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کام کرے۔

ڈاکٹر ناہید لطیف..... ماہر نفسیات

1۔ میں اس دن کی مناسبت سے یہ کہوں گی کہ ہم عورتیں مردوں کے آس پاس ہونے کی وجہ سے ہی سیکیورٹی فیل کرتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی ہماری فیملی مکمل ہوتی ہے۔ اور یہ تحفظ کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ

ہمارے احساسات و جذبات کو سمجھتے ہیں اور اس طرح زندگی اور بھی خوب صورت لگتی ہے۔ اور اس سے ایک صحت مند معاشرہ بنتا ہے۔ لیکن میں یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ مرد کو اپنے سامنے اونچا بولنے والی عورت اچھی نہیں لگتی۔ تو کیا عورت کو اپنے سامنے اونچا بولنے والا مرد اچھا لگتا ہے۔ نہیں۔۔۔ عورت کو بھی وہ مرد برا لگتا ہے جو اس کے آگے پیچھے چلائے اور اس پر ہاتھ اٹھائے دوسروں کے سامنے اس کی بے عزتی کرے۔ تو میں یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ اگر مرد حضرات چاہتے ہیں کہ ان کو عزت ملے تو آپ دوسرے انسان کو اور خاص طور پر خواتین کو بھی عزت دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو زیادہ عزت دیں گی۔ مرد کے مشکل وقت میں عورت ہمیشہ اس کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے۔ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ تو ایک مرد مشکل وقت میں اس کے ساتھ کیوں نہیں کھڑا ہوتا۔ شطرنج کے کھیل کی طرح بادشاہ کی مدد کرنے ملکہ آتی ہے جو ملکہ کی حفاظت کے لیے بادشاہ کیوں نہیں آتا۔ نپولین نے کہا تھا کہ اگر مجھے ایک تعلیم یافتہ ماں دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ایک تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ معاشرہ بنا سکتا ہوں۔ تو مرد حضرات اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی تعلیم میں رکاوٹ نہ بنیں بلکہ ان کے لیے آسانی پیدا کریں۔

2۔ عورتوں کی مرضی ہونی چاہیے کام کرنے کے معاملے میں اگر وہ کام کرنا چاہتی ہیں تو ضرور کریں۔ مگر اس سلسلے میں ان پر کوئی دباؤ نہیں ہونا چاہیے۔

**سائرہ قریشی۔۔۔ (آرٹسٹ)**

1۔ میں مرد حضرات کو یہ کہنا چاہوں گی کہ عورت کو کچھ نہیں چاہیے ہوتا، اس کو عزت چاہیے ہوتی ہے۔

عورت کو عزت دینا سیکھیں۔ عام ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ آپ اس کا کچرا کر دیں۔ عزت دینا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ جس رشتے میں خواہ وہ ماں کا ہو، بہن کا ہو، بیٹی کا ہو یا بیوی کا اگر عزت نہیں ہے تو وہ رشتہ بے کار ہے اور وہ کبھی اسٹینڈ بھی نہیں کرے گا بلکہ ختم ہو جائے گا اور ایسے رشتے کو ختم بھی ہو جانا چاہیے۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان اکیلا زندگی گزار لے۔

2۔ خواتین کو کام ضرور کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے مرد



حضرات کی مینٹیلٹی ایسی ہے کہ جب عورت گھر میں رہتی ہے اور ہر طرح سے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ بچے سنبھالتی ہے کچن سنبھالتی ہے۔ ہر کام وہ آخری حد تک جا کر کرتی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی ویلیو ختم ہو جاتی ہے۔ وہ عورت جو کما رہی ہے خواہ وہ تھوڑا لا رہی ہے یا زیادہ لا رہی ہے اس کی ویلیو بھی ہوتی ہے اور عزت بھی ہوتی ہے۔ اور یہ ایک بڑا فرق دیکھا ہے میں نے۔ اور یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اور جو خواتین کام کر رہی ہیں وہ اس لیے بھی کر رہی ہیں کہ گھر میں رہنے والی عورت کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ وہ چاہتی ہیں کہ وہ کمائیں تا کہ مرد کے دل میں ان کی عزت ہو اور وہ عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور وہ آمدنی کمانے والی



خواتین کی بہت عزت ہوتی ہے۔ کہ ہاں بھئی یہ دو پیسے کما کر لا رہی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے گھر گھر کی۔

**مصباح نوشین۔۔۔ ناول نگار۔۔۔ ڈرامہ رائٹر**

1۔ اگرچہ مجھے مردوں سے کچھ نہیں کہنا کیونکہ عورت اپنا آپ منوا چکی ہے مگر پھر بھی آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گی اور مردوں سے یہ ضرور کہوں گی کہ اپنے گھر کی عورت کو عزت دیں پیار اور اعتماد دیں۔ یقین مانیے وہ کبھی بھی آپ کا سر جھکنے نہیں دے گی۔ عورت کو جب مرد کی طرف سے اعتماد ملتا ہے تو وہ بھاری ذمہ داری سمجھتے ہوئے اپنی ناموس پر قربان ہونے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

2۔ مجھے تو لگتا ہے بہت سی عورتوں سے وہ مجبوری کا رونا روتی ہیں جبکہ وہ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔۔۔ ایک عورت چاہے وہ کسی بھی بندھن میں بندھی ہو۔ کم سے کم اپنا بوجھ تو خود اٹھائے۔ اور مرد کا بھی بوجھ بانٹے۔ کام کرنے سے عورت کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے کہ وہ بوجھ نہیں ہے۔



**شائستہ اقبال۔۔۔ نیوز اینکر آج ٹی وی**

1۔ مردوں سے زیادہ کچھ نہیں، مختصراً کہنا چاہوں گی کہ خواتین کی عزت کریں ان کے رتبے کو سمجھیں اور عورت کا جو مقام ہے جو رتبہ ہے وہ انہیں دیں۔ کیونکہ جب تک مرد خواتین کی عزت نہیں کریں گے۔ انہیں وہ مقام نہیں مل سکے گا جس کی وہ مستحق ہیں۔ اور مردوں سے یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ صرف "ماں" "بہن کی نہیں" "بیوی" کی بھی عزت کریں بیٹیوں کی بھی عزت کریں اور ان سے یکساں سلوک کریں اور یہ نہ کریں کہ مرد عورت پر حاکم ہے۔ عورت کے مقام کو سمجھیں۔

2۔ ہاں میں سمجھتی ہوں کہ خواتین کو جاب کرنی چاہیے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ مرد عورت کی جاب کو اپنی ضرورت بنا لے۔ اگر ایک پڑھی لکھی لڑکی جس کا معاشرے میں ایک مقام ہے اور جو اچھی پوسٹ پر ہے تو اس کی قدر کریں اور اس لڑکی کو بھی چاہیے کہ اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھا کر اپنی فیملی کو سپورٹ کرے۔ اگر عورت سیلف میڈ ہوگی تو اس کا وقار بلند ہوگا۔ اور عورت جب تک خود اپنی اہمیت کو نہیں سمجھے گی لوگ ہماری عزت نہیں کریں گے۔ جاب کا مطلب یہ نہیں کہ پیسے لا لا کر دیں۔ جاب کا مقصد یہ ہو کہ آپ اپنے آپ کو منوائیں اور ثابت کریں کہ آپ اس معاشرے کا ایک کارآمد پرزہ ہیں اور لوگ آپ کے کام سے آپ سے پیار کرتے ہیں نہ کہ آپ کے پیسے سے۔

**شازیہ انور۔۔۔ جوائنٹ ایڈیٹر اور سینئر منیجر "ہم نیٹ ورک"**

1۔ خواتین کے عالمی دن کے موقع پر میں اپنے تمام پڑھنے والے بھائیوں سے کہوں گی کہ خدارا عورتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس سوچ کو ختم کریں کہ اگر کوئی عورت آپ کی ماں، بہن اور بیٹی ہے تو صرف وہی آپ کی عزت کی مستحق ہے یہاں تک کہ بے شمار لوگ تو بیویوں کو بھی پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو

**کرن اور آپ**

اس ماہ اقصیٰ ماہ نور کو "کرن اور آپ" میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ادارے کی جانب سے اقرا کو تین ماہ کے لیے ماہنامہ "کرن" مفت دیا جا رہا ہے۔

بے شمار پڑھے لکھے مردوں کے منہ سے یہ سنا ہے کہ اللہ نے عورتوں کو مردوں سے کم تر بنایا ہے۔ اس لیے انہیں ان کی اوقات میں رکھنا ضروری ہے۔ یقیناً کم تر عورتوں سے ان کی مراد بیویوں کی ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ دوسری طرف وہ ماؤں کو جنت میں جانے کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے نہ صرف خود بلکہ بیوی کو بھی اس کی جائز نا جائز باتیں ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس مردانہ رویے نے معاشرے میں اخلاقی اقدار کا انحطاط برپا کر رکھا ہے۔ معاشرے کی جس برائی کو پکڑیں اس کے "ڈانڈے" اس سوچ سے جا ملتے ہیں۔ لہٰذا مردوں کو بلاتفریق خواتین کی عزت و تکریم کرنی چاہیے۔

2۔ جہاں تک بات خواتین کے کمانے یا ملازمت کرنے کی ہے تو اس کے اجتماعی حق میں ہوں۔ تاہم ملازمت کرنے کی نیت گھر کی ذمہ داریوں سے فرار، بے جا آزادی کے حصول اور گھر میں برابری کی سطح پر بحث و تکرار نہیں ہونی چاہیے۔ فی زمانہ مہنگائی کی وجہ سے فرد واحد کی کمائی سے ایک متوازن زندگی بسر کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی عورت معاشی مسائل کے حل کے لیے کچھ کر سکتی ہے تو اسے ضرور کرنا چاہیے میں اس لیے بھی خواتین کے معاشی استحکام کے حق میں ہوں کہ ایسی خواتین اپنے اور اپنے بچوں کے حق میں بہتر فیصلے کرنے کی پوزیشن میں ہوتی ہیں۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں عورتوں کی شرح مردوں سے زیادہ ہے۔

ایسے میں اگر آدھی آبادی بیٹھ کر کھائے گی تو مسائل بڑھنے کے اندیشے ہیں۔ ہماری خواتین کو چاہیے کہ اپنے آپ کو مصروف رکھیں۔ گھر سے باہر نکل کر کام کر سکتی ہیں تو اچھا ہے لیکن اگر مسائل ہیں تو گھر میں بیٹھ کر بھی بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو زنگ نہ لگائیں کچھ نہ کچھ تعمیری کام ضرور کریں۔

سمیرا ایپلیک Applique

1۔ جی..... مرد بہت خوب صورت ذات ہے۔ اللہ کا شکر میری لائف میں آنے والے مرد نے مجھے سنوارا۔ مردوں کو اسپیس دینا چاہیے۔ خاتون کو عزت دیں۔ پھر وہ آپ کو آپ سے زیادہ عزت دے گی۔ آپ مرد اپنی بیوی کو اور اپنی فیملی کی خواتین کو بہت زیادہ عزت دیں۔

2۔ آج کل کی مہنگائی میں گھر بیٹھ کر بھی عورت کما سکتی ہے خواتین کو ضرور کمانا چاہیے اور اپنے گھر کو سپورٹ کرے۔

کنزہ ہاشمی..... آرٹسٹ

1۔ نہیں جی۔ مجھے مردوں کے لیے کچھ نہیں کہنا۔ اور نہ ہی مجھے ان سے کوئی گلہ شکوہ ہے۔

2۔ خواتین کو ضرور کمانا چاہیے۔ آج کل جتنی مہنگائی ہوگئی ہے مجھے نہیں لگتا کہ صرف ایک مرد پورا گھر چلا سکتا ہے۔ اس لیے اگر میاں بیوی ہیں تو دونوں کو کمانا چاہیے اور اگر بیٹی ہے تو گھر میں اپنے والدین کا ہاتھ بٹائے، ان کا سہارا بنے۔

نزہت سمن..... شاعرہ..... ڈرامہ نگار

1۔ اس خاص دن پر میں مرد حضرات سے صرف یہ درخواست کروں گی کہ وہ عورتوں کا احترام کریں۔ اور ان کی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کریں..... آج کی عورت معاشی دوڑ میں مرد کے شانہ بشانہ چل رہی ہے۔ گھر کی ذمہ داریوں میں شوہر، باپ اور بھائی کا پورا ساتھ دیتی ہے۔ اور پورا دن باہر کام کرکے گھر آکر بھی اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کرتی ہے۔ گھر کے مردوں کی خدمت، بچوں کی پرورش اور تربیت بھی کرتی ہے اور وہ زندگی کے ہر محاذ پر لڑنے کے لیے ہر دم تیار رہتی ہے۔ آپ کے نفرت بھرے بول عورت کو اندر سے توڑ دیتے ہیں اور وہ پھر بھی اپنے زخمی وجود کو لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے آپ کے دکھ درد کو بانٹنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ تو کیا آپ اپنے دکھ درد کی ساتھی کو پیار کے دو بول بھی نہیں دے سکتے؟

2۔ آج کے دور میں زندگی کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ بہت سی تعیشات ضروریات بن گئی ہیں۔ بچوں کو اچھی زندگی اور اچھی تعلیم دینا ہر والدین کا ارمان ہوتا ہے۔ ایسے میں ایک بندے کی کمائی سے پورے خاندان کو پالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے عورت اگر مرد کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے کے لیے ملازمت کرے تو کوئی حرج نہیں اور پھر جب آج کی عورت اعلا تعلیم یافتہ ہو تو اسے اس تعلیم کو عملی زندگی میں ضرور استعمال کرنا چاہیے۔

صائمہ اکرم چوہدری..... افسانہ و ناول نگار

ڈرامہ نگار

1۔ خواتین کے عالمی دن کے موقع پر صرف ریلیوں، دعووں اور سیمیناروں سے کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اس موقع پر مردوں سے مجھے یہی کہنا ہے کہ معاشرے میں خواتین کے مقام کی اہمیت کو کھلے دل سے اور کھلے ذہن سے تسلیم کریں۔ ان ہاتھوں کو روکیں جو خواتین پر ذہنی اور جسمانی تشدد کرتے ہیں۔ ان جاہلانہ رسم و رواج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں جس سے نہ صرف ہمارا ملک بلکہ اسلام بھی بدنام ہو رہا ہے..... آج کے جدید دور میں کاروکاری، وٹہ سٹہ، ونی اور ستی جیسے جاہلانہ رواج عروج پر ہیں۔ جہاں عورت کو حقیر اور کم تر سمجھا جاتا ہے۔ راہ چلتی خواتین پر آوازیں کسنا، مذاق اڑانا، سوشل میڈیا پر ان کی تصاویر جاری کرنا۔ انہیں بلیک میل کرنا اور غیر اخلاقی الفاظ کا استعمال کرنا روز کا معمول بن گیا ہے۔ آپ کبھی غور کریں تو ہمارے معاشرے میں غلیظ ترین گالیوں میں بھی صرف عورت کے نام اور رشتوں کا استعمال کیا جاتا ہے کہیں تیزاب پھینک کر عورتوں کی شکلیں بگاڑ کر انہیں عمر بھر کے لیے بے سہارا چھوڑ دیا جاتا ہے اس دور میں بھی دور جہالت کے پیروکار موجود ہیں کسی کی بہن کی اگر آبرو ریزی ہو جائے تو بھائی اسے غیرت کے نام پر قتل کر دیتا ہے بجائے یہ کہ اپنی بہن کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر مجرم کو قانون کے دائرے میں لائے وہ اپنی بہن کو ہی قتل کر دیتا ہے۔ اس حوالے سے رویوں میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے اور گورنمنٹ کو اس حوالے سے موثر قانون سازی کرنی چاہیے۔

2۔ آج کل معاشیات کا دور ہے اور کوئی بھی اس معاشی ترقی میں پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ ہر فرد جلد از جلد ترقی کے آسمان کو چھونا چاہتا ہے۔ اب وہ دن گئے جب لوگ روزانہ دو وقت کی روٹی کما کر حقہ پی کر سکون سے ٹانگیں پسار لیتے تھے کہ آج کے راشن پانی کا بندوبست ہوگیا، کل کی کل دیکھیں گے۔ اب تو ایک گھر میں دس بھی کمانے والے ہوں تب بھی اخراجات پورے نہیں ہوتے ایسے میں اگر خاندان کی معاشی گاڑی کو محض ایک پہیہ سے کھینچنے کی کوشش کی جائے تو اعتدال و توازن نہیں ہو سکتا وہ جو دو پہیوں یا چار پہیوں سے ممکن ہے۔

☆☆

## سالگرہ نمبر

مقابل ہے آئینہ

# شازیہ ہاشم

ادارہ

س: "اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟"
ج: "اصلی نام شازیہ ہاشم ہے گھر والے شازی کہتے ہیں۔"
س: "آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟"
ج: "ماشاء اللہ۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔"
س: "حسین صورتوں کو دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟"
ج: "علامہ اقبال کا شعر لبوں پر آتا ہے:"

تجھ سے غرض نہ تیری صورت سے غرض
ہم تو مصور کا قلم دیکھتے ہیں

س: "اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟"
ج: "پرس میں چابیاں، مطالعہ کی کوئی نہ کوئی کتاب یا پھر رسالہ اور ڈائری۔"
س: "بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟"
ج: "پہلے ڈرتی تھی۔ اب نہیں کیونکہ رب تعالیٰ کے علاوہ میں کسی اور کا خوف رکھنا شرک سمجھتی ہوں۔"
س: "مہمان کیسے لگتے ہیں؟"
ج: "مہمان ہر حال میں اچھے لگتے ہیں جب مرضی آئیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتے ہیں۔"

س: "کھانے میں کیا پسند ہے؟"
ج: "افغانی گوشت، بریانی اور میٹھے میں صرف کھیر وہ بھی ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی۔"
س: "اگر آپ کو حکومت مل جائے تو؟"
ج: "حکومت عورت کے لیے ہے ہی نہیں کیونکہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق جس قوم کی حکمران عورت ہو وہ ذلیل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا آئی ڈونٹ لائک۔"
س: "پسندیدہ شاعر؟"
ج: "حسان بن ثابتؓ، علامہ اقبالؒ، سید نفیس الحسینیؒ۔"
س: "مزاجاً لڑاکا ہیں؟"
ج: "نہیں، صلح جو طبیعت کی مالک ہوں لڑائی جھگڑے کی قائل نہیں۔"
س: "گھر سے باہر جاتے ہوئے کیا چیزیں ساتھ رکھتی ہیں؟"
ج: "صرف پرس جس میں میری اہم چیزیں ہوتی ہیں۔"
س: "کس قسم کے لوگ پسند ہیں؟"
ج: "سادہ، سچے اور کھرے اور ہر قسم کی منافقت سے پاک۔"
س: "اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟"
ج: "تو راوی راوی چین ہی چین کا منظر ہوتا۔"



س: "اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟"
ج: "ہر وقت، خاص طور پر تہجد کا وقت۔"
س: "کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟"
ج: "ہوں گے لیکن میرے اوپر نہیں کیونکہ آئی ایم موسٹ رولیجس گرل (میں بہت زیادہ مذہبی ہوں)۔"
س: "وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟"
ج: "دنیا کا کیا ہے اپنی چال کو سیدھا رکھو اور دنیا کا خیال چھوڑ دو۔"
س: "اگر آپ سنسان جگہ سے گزر رہی ہوں اور پیچھے کتا لگ جائے؟"
ج: "ظاہر ہے اگر پیچھے لگے تو بھاگنا پڑے گا لیکن میں دعا پڑھتی ہوں الحمدللہ پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔"
س: "آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟"
ج: "محبت کے بغیر زندگی بے کار ہے۔"
س: "کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟"
ج: "اپنے والدین اور اساتذہ کرام خاص طور پر مولانا طارق جمیل اور مولانا اورنگزیب فاروقی کی جن کے بیانات میری ایمانی روح کو زندہ رکھتے ہیں۔"
س: "اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟"
ج: "نہیں۔۔۔ پسند نہیں اور ویسے بھی گناہ ہے۔"
س: "اگر کوئی ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟"
ج: "مناتی ہوں جذبہ خلوص کے ساتھ۔"
س: "حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟"
ج: "دوسروں کی خوشی میں شامل ہو کر اور اپنی طرف سے کوئی خوشی دے کر حقیقی خوشی حاصل کرتی ہوں۔"
س: "زندگی سے کیا سبق سیکھا؟"
ج: "وقت ایک انمول دولت ہے ایک دفعہ چلا جائے تو کبھی دوبارہ واپس نہیں آتا ہے۔"
س: "ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟"
ج: "نہیں ستاروں پر بالکل یقین نہیں۔"
س: "کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟"
ج: "ہاں! اللہ کا خوف اور قبر کی وحشت اور موت۔"
س: "کوئی آخری بات؟"
ج: "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کو منشور حیات سمجھ کر زندگی گزارو۔"


خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
دستِ کوزہ گر
فوزیہ یاسمین



قیمت: 750/ روپے
منگوانے کا پتہ:
32735021

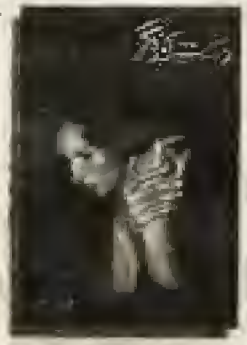

نگہت عبداللہ

# ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز طرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سعیدہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بیٹے حمزہ اور بلال تھے۔

سعیدہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

سونیا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خزینہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے لیکن وہ خزینہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سائرہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزینہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منا لے گا۔ خزینہ تیمور کی محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حمیدہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خزینہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

## سترھویں قسط

حمزہ کو حسان صاحب سے کوئی پرخاش نہیں تھی لیکن ان کے ساتھ جو عورت بیٹھی تھی ثمرہ، اس نے پہلے بھی اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھا تھا اور ابھی بھی جیسے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے دھکے دے کر نکال دیتی۔ انتہائی چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ حمزہ محسوس کر رہا تھا۔

"جاب کیسی جا رہی ہے تمہاری؟" حسان صاحب نے بات کرنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کے ہاں تھا ویسے ہی۔" حمزہ نے لاپروائی سے کندھے اچکاتے تھے۔ وہ ثمرہ پر جتانا چاہتا تھا کہ اسے اس کی پروا نہیں ہے۔

"ہوں، تم محنتی لڑکے ہو۔ رمیز صاحب تمہاری تعریف کر رہے تھے۔" حسان صاحب نے کہا تب ہی ملازمہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی آ گئی جو دیگر لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ حسان صاحب پھر کوئی پروفیشنل بات کرتے وہ ملازمہ کے جاتے ہی کہنے لگا۔

"آپ جانتے ہوں گے میں ریکا کی خواہش پر یہاں آیا ہوں۔"

"ہاں...... " ثمرہ فوراً بول پڑیں۔ "بتایا تھا ریکا نے بلکہ سب بتایا ہے۔ کہ تم ریکا سے شادی کے سلسلے میں آئے ہو اور یہ کہ تمہارے گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔ ایسا ہی ہے ناں......؟"

"جی...... ایسا ہی ہے اور میں آپ کو مزید بتا دوں کہ میں آپ کی بیٹی کو ایسی آسائشات نہیں دے سکتا جن کی وہ عادی ہے۔ وہ میرے ساتھ میرے گھر میں رہے گی جہاں میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کروں گا۔" وہ پورے اعتماد سے بول رہا تھا۔ ثمرہ نے احتجاج کرنا چاہا لیکن حسان صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں کچھ بھی کہنے سے روک دیا تو وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر حسان صاحب ٹرالی میں کپ سیدھے کر کے پوچھنے لگے۔

"چینی کتنی لو گے؟"

"پلیز! آپ رہنے دیں۔ میں چلتا ہوں۔" اسے عجیب سا لگا۔ اٹھنے لگا۔

"نہیں بیٹھو اور پلیز ان باتوں کو مائنڈ مت کرو۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں تمہاری غلطی نہیں ہے۔" حسان صاحب کپ میں چائے ڈالتے ہوئے بول رہے تھے۔ "اور جب ریکا تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہنے کو تیار ہے تو پھر میں سمجھتا ہوں ہم میں سے کسی کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہاں سے کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہیے...... بے فکر رہو تم۔ ایسا ہی ہوگا۔"

"شکریہ۔" اس نے ان کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے جانے ان کی بات پر یا چائے کے لیے شکریہ کہا تھا۔

"کچھ اور لو ناں۔"

"نو تھینکس......"

"ہاں تو پھر تمہارا کیا پروگرام ہے......؟" حسان صاحب نے چائے کا سپ لے کر پوچھا۔

"پروگرام تو سب ریکا بناتی ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیجیے گا۔ جیسا وہ کہیں۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جتا دیا۔

حسان صاحب خاموش ہو گئے۔ تو وہ بھی چائے کے بڑے بڑے گھونٹ لے کر اٹھ جانا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی ریکا آ گئی۔ کیونکہ اس کی آمد سے آگاہ تھی پھر بھی نہ صرف انجان بنی بلکہ حیرت کا اظہار بھی کیا۔

"ارے حمزہ! تم کب آئے؟"

"کافی دیر ہوئی اور اب چلتا ہوں۔" وہ چائے کا کپ ٹرالی میں رکھنے کے بہانے اٹھ گیا۔



"اجازت حسان صاحب۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔" حسان صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے صرف ریکا کی وجہ سے کہ وہ اس کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے انہیں شرمندہ ہونا پڑے۔

حمزہ ان سے مصافحہ کر کے باہر نکلا تو ریکا بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ حمزہ نے نوٹس تک لیا نہ ہی اس کی طرف دیکھا آرام سے بائیک پر بیٹھ کر جیسے ہی اسٹارٹ کی تو ریکا اچک کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اسے ٹوکنا پڑا۔

"پریکٹس حمزہ...... سمجھا کرو۔ آخر مجھے اس پر بیٹھنا ہے۔ چلو۔" وہ بڑے موڈ میں بولی تھی۔

"سوچ لو۔ میں بہت رف چلاتا ہوں۔" اس نے ڈرایا۔

"کوئی بات نہیں...... مریں گے تو ساتھ مریں گے۔" وہ بھلا کہاں ڈرنے والی تھی۔ حمزہ نے چڑ کر جھٹکے سے بائیک آگے بڑھائی پھر اسپیڈ سے بھگا دی۔ رہائشی علاقے سے نکلتے ہی ریکا کھلکھلانے لگی تھی۔

"واؤ کتنا مزا آ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے ہم ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔ ہے ناں حمزہ!"

"یہ بتاؤ کہاں جانا ہے......؟" وہ آگے دانت پیس رہا تھا۔

"جہاں تم لے جاؤ۔ آج میں اپنی شادی طے کر کے آ رہی ہوں۔ اس خوشی میں تم مجھے ڈنر کرواؤ گے۔ اس کے بعد ہم کلب چلیں گے۔ جہاں میں تمہیں اپنے تمام دوستوں سے ملواؤں گی۔" اس نے کہا تو حمزہ کا دل چاہا بائیک بیچ میں کسی ٹرک میں دے مارے۔ لیکن جو وہ سوچ کر اس پر مائل ہو گیا تھا اس کے مطابق ابھی اسے خود پر بہت جبر کرنا تھا۔ جب ہی اس کی مان کر ڈنر کے لیے جگہ سوچنے لگا تھا۔

☆☆☆

تقدیر ایسے بھیانک موڑ پر لے آئے گی۔ فاخرہ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ سیدھی سادی خاتون تھیں۔ سمجھتی تھیں برے دن کٹ گئے اب آگے ان کے لیے آرام ہی ہوگا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ جس بیٹے پر مان کر کے وہ آرام کا سوچتی تھیں وہی ان کا سکھ چین چھین لے گا۔

جب سے انہوں نے حمزہ کو تیار ہو کر جاتے دیکھا تھا تب سے پراگندہ سوچوں میں گھری تھیں۔ کیسا نڈر ہو گیا تھا جاتے ہوئے بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کہاں جا رہا ہے؟ کب آئے گا؟ ایسے تو کبھی نہیں کیا تھا اس نے۔ سوچتے ہوئے بار بار ان کی آنکھیں بھر آ رہی تھیں۔ لیکن بیلا کے سامنے وہ رونا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ جب ہی کچھ اٹھانے کے بہانے منہ پھیر کر آنکھیں پونچھ لیتیں۔

"اماں......!" بیلا نے اچانک انہیں مخاطب کیا تھا۔

"ہاں......" وہ بیڈ کی چادر پر یوں ہاتھ مارنے لگیں جیسے کوئی چیز گری ہو۔

"بھائی بتا کر کیوں نہیں گئے۔ یا آپ کو بتایا تھا کہاں جا رہے ہیں۔" بیلا غالباً اس وقت سے یہی سوچ رہی تھی۔

"ہاں کچھ کہہ تو رہا تھا۔ پتا نہیں میں نے ٹھیک سے سنا نہیں تھا۔" مبالغہ آرائی ان پر جچتی نہیں تھی اور بیلا کیوں کہ اپنی سوچوں کے جھنے بانے بن رہی تھی جب ہی دھیان نہیں دیا۔

"مجھے پتا ہے بھائی اتنے تیار ہو کر کہاں گئے ہیں۔" بیلا نے کہا تو فاخرہ ایک دم اسے دیکھنے لگیں۔ بولیں کچھ نہیں۔

"ہاں اماں اب میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں۔" بیلا اپنی جگہ سے اٹھ کر فاخرہ کے پاس آ بیٹھی اور راز دارانہ انداز میں کہنے لگی۔

"بھائی ریکا آپی کے ہاں گئے ہوں گے۔ آپ کو نہیں پتا ان کا بہت دنوں سے ان کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔"

"ہیں۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ شرم کرو۔" فاخرہ اچھل پڑیں۔

"کیا شرم کروں اماں؟ ساری لڑکیاں ایسی باتیں کرتی ہیں۔ اس کا فلاں کے ساتھ چکر ہے۔ اس کا فلاں کے ساتھ چکر ہے۔ اور میں تو آپ کو سچ بتا رہی ہوں۔ بھائی پتا نہیں کب سے......"

"تمہیں کیسے پتا......؟" فاخرہ نے تیکھے لہجے میں ٹوکا۔

"اب پتا چلا ہے۔ سوچ رہی ہوں تو ساری بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ آپ بھائی سے نہیں کہیے گا۔ میں آپ کو بتاؤں۔ ایک دن ریکا آپی مجھے کالج سے لینے آئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں انہیں بھائی نے بھیجا ہے۔ وہ مجھے ان کے گھر سے لے لیں گے۔" نیلا سادگی میں بولے جا رہی تھی۔

فاخرہ سراسیمہ بیٹھی تھیں۔

"سچ اماں میں کیا بتاؤں۔ ریکا آپی کا گھر بالکل محل جیسا تھا۔ اتنا بڑا اتنا شاندار اور اتنا سجا ہوا کہ میں تو دنگ رہ گئی۔ لیکن اماں ان میں بالکل غرور نہیں ہے اتنے پیار سے مجھ سے باتیں کیں۔ کھانا کھلایا اس کے بعد پتا نہیں کیا کچھ منگواتی رہیں۔ پھر کتنی دیر بعد بھائی مجھے لینے آئے تھے۔"

"یہ یہ کب کی بات ہے......؟" فاخرہ نے حیرت میں ڈوبے ہوئے ہی پوچھا تھا۔

"وہ اس دن جب بھائی نے مجھے سوٹ بھی دلائے تھے۔" نیلا نے یاد کرتے ہوئے بتایا تو فاخرہ چیخ سی گئیں۔

"تو تم نے مجھے اسی دن کیوں نہیں بتایا؟"

"بھائی نے منع کیا تھا۔" نیلا خائف ہوئی۔

"شاباش بھائی نے منع کیا اور تم چھپا گئیں۔ اب دیکھو نتیجہ۔"

"مجھے کیا پتا تھا اماں؟ پھر اگر میں آپ کو بتا دیتی تو آپ کیا کر لیتیں۔ بھائی تو پتا نہیں کب سے اور ہاں ریکا آپی دو تین بار ہمارے گھر بھی تو آئی ہیں تب آپ کو کیوں نہیں شک ہوا۔"

"کیسے شک کرتی۔ وہ تو ہر دم شہرینہ شہرینہ کرتا رہا ہے اور مجھے بھی یقین تھا بچپن کے رشتے کی لاج رکھے گا۔ بتا اب میں کیا منہ دکھاؤں گی حشر میں تمہارے باپ کو۔" فاخرہ کی آواز بھرا گئی۔

"اف اماں حشر تو چھوڑیں ابھی یہاں کا تو سوچیں۔ تائی جان کو پتا چلے گا تو۔"

"گئی تھی میں ان کے پاس۔ بتا آئی ہوں انہیں حمزہ کے سارے کرتوت۔" فاخرہ نے اس کی بات اچک کر بتایا تو وہ اچھل پڑی۔

"ہیں...... آپ کب گئی تھیں......؟"

"بس گئی تھی۔" فاخرہ نے جھڑک دیا۔

"اچھا تو کیا کہا تائی جان نے......؟" نیلا تھوڑا پیچھے ضرور ہٹ گئی لیکن پوچھنے سے باز نہیں آئی۔

"کیا کہتیں۔ دکھ تو انہیں بھی ہوا۔ پھر مجھے تسلی دیتی رہیں۔ ظاہر ہے جب حمزہ نے میری نہیں سنی تو کسی اور کی کیا مانے گا۔ اور اب تو میں یہی کہوں گی۔ اللہ کو یہی منظور ہوگا۔" فاخرہ نے کہہ کر دامن پھیلا لیا۔

"اے اللہ مجھے اپنی رضا میں راضی کر لے۔ میرے مالک۔"

☆☆☆

خزینہ نے راستے میں ہی تیمور غزنی سے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلے کچھ دن اپنی امی کے گھر رہے گی۔ اس پر تیمور غزنی نے کوئی اعتراض یا احتجاج نہیں کیا تھا۔ غالباً وہ بھی اپنی بیٹی کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ یوں خزینہ کو حمیدہ بیگم



کے پاس چھوڑ کر وہ جب چلا گیا تب خزینہ سارے میں نظریں دوڑاتے ہوئے بولی تھی۔

"یہ گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے امی۔ کیسی اداسی چھائی ہوئی ہے۔ آپ اور شہرینہ بھی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔"

"تم اصل میں باہر کی چمکتی دمکتی دنیا سے آ رہی ہو نا اس لیے تمہیں یہاں سب بجھا بجھا سا لگ رہا ہے۔" شہرینہ کی پھیکی مسکراہٹ خزینہ کے دل میں ترازو ہو گئی تو اسے فوراً حمزہ سے متعلق بات کرنا ٹھیک نہیں لگا۔ دھیان بٹانے کی خاطر کہنے لگی۔

"ہاں شاید ایسا ہی ہے۔ اچھا دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔ وہ براؤن بیگ اٹھا لاؤ۔ اس میں تمہاری اور امی کی چیزیں ہیں۔"

"اچھا بعد میں دیکھیں گے۔ ابھی تم بتاؤ گھومنا پھرنا کیسا رہا۔" شہرینہ نے اشتیاق ظاہر کیا تو وہ ذرا سا مسکرائی۔

"اچھا رہا...... سفر بھی اچھا رہا اور وہاں قیام بھی اچھا رہا۔ لیکن پتا نہیں لوگ ساری زندگی کے لیے اپنے وطن سے دور کیسے رہ لیتے ہیں۔ وہاں بے شک ہر سہولت تھی پھر بھی مجھے اپنا وطن اپنا گھر یاد آتا رہا۔ بس گھومنے پھرنے کی حد تک ٹھیک ہے۔ دس پندرہ دن اس سے زیادہ نہیں۔"

"پھر تو تمہاری سوچ ہے خزی ورنہ لوگ مرتے ہیں باہر کی دنیا پر۔ بس نہیں چلتا اپنے ملک کو ٹھوکر مار کر نکل جائیں اور کبھی واپس نہ آئیں۔ جو لڑکیاں ایسی باتیں کرتی ہیں سچ میرا دل چاہتا ہے ان کا گلا دبا دوں۔" شہرینہ نے آخر میں دانت پیسے تھے۔

"خیر دفع کرو۔ یہ بتاؤ کھانے میں کیا ہے۔ پلین میں تو مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔ اب بھوک لگ رہی ہے۔" خزینہ بیگ سیدھا کر کے نیم دراز ہو گئی۔

"ہاں دیکھو جلدی سے روٹی ڈال دو۔ اور تھوڑے سے چاول بھی بوائل کر لینا۔" حمیدہ بیگم نے کہا تو شہرینہ فوراً اٹھ گئی تھی۔

"بس ابھی آ جائے گا کھانا۔ سونا نہیں۔" حمیدہ بیگم نے خزینہ کو جمائی لیتے دیکھ کر ٹوکا تو وہ مزید انگڑائی لے کر بولی۔

"تھک گئی امی بیٹھے بیٹھے۔"

"ہاں بس کھانا کھا کر سونا۔"

"اچھا آپ مجھے حمزہ کا تو بتائیں۔ کیا معاملہ ہے؟" خزینہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں کس نے شہرینہ نے بتایا ہے؟" حمیدہ بیگم چونکی تھیں۔

"جی...... اب آپ اصل بات بتائیں۔"

"اصل بات وہی ہے۔ کسی امیر لڑکی کے چکر میں آ گیا ہے۔ اور اسی سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ فاخرہ نے تو یہی بتایا ہے۔ اب پتا نہیں سچ ہے یا جھوٹ۔" حمیدہ بیگم یکایک مشکوک ہو گئی تھیں۔

"چچی جان جھوٹ کیوں بولیں گی۔ خیر آپ نے حمزہ سے بات کی کہ نہیں۔"

"میں کیوں بات کروں گی اس سے۔ بیٹی کی ماں ہوں۔ مجھ پر بیٹی بھاری نہیں ہے اور نہ میری بیٹی کے لیے کوئی کمی ہے۔" حمیدہ بیگم کا تفاخر عود آیا تھا۔

"افوہ امی آپ جذباتی نہ ہوں۔ گھر کا معاملہ ہے۔ بات کی جا سکتی ہے آپ نہ کریں لیکن میں حمزہ سے ضرور پوچھوں گی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔"

"نہیں بیٹا۔ ہم کوئی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں۔"

"بس امی! آپ مجھے مت روکیے گا۔" خزینہ ٹھان چکی تھی۔ حمیدہ بیگم شہرینہ کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئیں اور اسے بھی خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ کھانے کے دوران تو وہ یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی لیکن اس کے بعد جب سونے کا کہہ کر شہرینہ کے کمرے میں آئی تب اس سے مزید صبر نہیں ہوا شہرینہ کا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگی۔

"کیوں کر رہا ہے حمزہ ایسا......؟"

"مجھے کیا پتا؟ اسی سے پوچھو۔" شہرینہ بہت دل برداشتہ تھی۔ حمزہ کے نام پر ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ہاں، میں پوچھوں گی اس سے۔ کل ہی جاؤں گی۔ دماغ خراب ہو گیا ہے کیا اس کا۔ کہاں تو تمہارے بغیر رہتا نہیں تھا پھر یا اچانک۔"

"اچانک نہیں خزی۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "یہ سب اچانک نہیں ہوا۔ وہ تو پتا نہیں کب سے ربیکا کے ساتھ۔"

"ربیکا......؟"

"اس لڑکی کا نام ربیکا ہے۔ میں نے خود اسے ہی وی پر اس کے ساتھ دیکھا تھا۔" شہرینہ رو رو کر پچھلی ساری بات دہرانے لگی۔

"اچھا خدا کے لیے تم رو رو کر خود کو ہلکان مت کرو۔" خزینہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔

"کیا کروں خزی۔ مجھے اس کی ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ اور یہ سوچ کر تو اور رونا آتا ہے کہ وہ مجھے فریب دے رہا تھا۔" شہرینہ بچوں کی طرح ہچکیاں لے رہی تھی۔

"یہ فریب اسے بہت مہنگا پڑے گا شہری۔ دیکھنا ٹھوکر کھا کر تمہارے ہی پاس آئے گا۔" خزینہ نے اسے پچکارتے ہوئے کہا تو وہ بھڑک گئی۔

"نہیں، مجھے ٹھوکر کھایا ٹوٹا پھوٹا حمزہ نہیں چاہیے۔ مجھے میرا حمزہ ——۔"

"یا اللہ۔ رونا تو بند کرو۔ اس کی آواز چلی گئی تو وہ اور پریشان ہوں گی۔ چلو اٹھو۔ منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ نہیں تو میں بھی رونا شروع کر دوں گی۔" خزینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔ اور جب وہ واش روم میں بند ہو گئی تب حمزہ کو سوچتے ہوئے وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ جیسے وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

"ضرور وہ شہری کو تنگ کر رہا ہے۔" وہ بڑبڑائی پھر گہری سانس کھینچی تھی۔ "اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

☆☆☆

سارہ کی ناراضی بجا تھی جب ہی تیمور خوفی اسے منانے کے جتن کر رہا تھا۔ وہ بھی کیا کرتا خزینہ کی موجودگی میں بچے کی شاپنگ تو نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی اس نے خود کو پابند کر رکھا تھا۔ وہ خزینہ کا مجرم تھا۔ اس کی گود خالی کرنے کا مجرم جب ہی وہ بچے کی طرف سے قصداً نظریں چراتا تھا۔ وہ اس کا اپنا بچہ تھا لیکن وہ اسے سینے میں بھینچ کر پیار نہیں کرتا تھا۔ گویا احساس جرم نے اس کے ہر جذبے پر بند باندھ دیا تھا۔ اور اس نے خود سے عہد کر لیا تھا کہ جب خزینہ کی مامتا کو قرار ملے گا تب وہ بھی اپنی حسرتیں پوری کرے گا۔ لیکن سارہ سے تو وہ یہ سب نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے اس کے سامنے بہانے تراش رہا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں سارہ۔ وہاں مجھے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملی۔ میں شاپنگ مال جانے کا بس سوچتا ہی رہ گیا تھا۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے۔ تمہیں بچے سے پیار ہی نہیں ہے۔" سارہ نے ناراضی سے جتایا تھا۔



"ہیں! تم بچے کی بات کرتی ہو مجھے تو اب اس کی ماں سے بھی پیار ہونے لگا ہے۔" وہ اپنی بے ساختگی میں پھنس گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ بچے کی ماں سے......" سارہ ٹھٹک کر پوچھ رہی تھی۔ وہ بوکھلا گیا۔

"ہاں ہاں، بچے کی ماں۔ میرا مطلب ہے تم۔"

"میں...... اور تمہیں مجھ سے اب پیار ہونے لگا ہے۔ پہلے کیا تھا؟" سارہ کے تیور خطرناک تھے۔

"پہلے...... ہاں پہلے میں تم سے عشق کرتا تھا۔ اب پیار بھی ہونے لگا ہے۔" وہ بات سنبھالنے میں بھی تھپلا کر گیا۔

"اف تیمی۔ تمہارا دماغ الٹا چلنے لگا ہے کیا؟ پہلے عشق پھر پیار۔"

"میری جان تمہاری ناراضی سے میرا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اول فول بکنے لگتا ہوں۔ لہذا تم ہی چپ ہو جاؤ۔" وہ اب ذہن کو حاضر رکھ کر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"میں کب تم سے بات کر رہی ہوں۔" سارہ نے منہ موڑ لیا۔

"مائی گاڈ۔ یار میں تمہاری محبت میں کام ختم ہوتے ہی بھاگا چلا آیا کہ چلو شاپنگ تو یہاں سے بھی ہو جائے گی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ تمہیں مجھ سے زیادہ شاپنگ کا انتظار ہے۔" وہ اب سارہ کو ایموشنل بلیک میل کرنے پر آ گیا۔

"اپنے لیے نہیں، اپنے بچے کے لیے۔" سارہ جز بز تو ہوئی پھر بھی تڑخ کر بولی تھی۔

"بچے کے لیے تو مجھے ویسے بھی کچھ نہیں لینا تھا کیونکہ مجھے اس کا سائز پتا نہیں ہے۔" اس نے کہا تو سارہ کو پھر موقع مل گیا۔

"اٹھاؤ گے تو پتا چلے گا۔ تم نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"ہاں نہیں لگاتا۔ کیونکہ جب سے یہ آیا ہے تم مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہو۔ اگر ایسے ہی تم دور ہوتی جاؤ گی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" وہ اپنے تئیں سارہ پر رعب جما کر فوراً کمرے سے نکل آیا اور اطمینان سے ماما، بابا کے پاس بیٹھ گیا۔

"جارج سو رہا ہے کیا؟" ماما کا دھیان بھی ہر وقت بچے کی طرف ہی رہتا تھا۔

"جی۔"

"جبھی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ورنہ تو ماشاء اللہ بہت شور کرتا ہے۔"

"اس سے زیادہ تو اب سارہ شور کرنے لگی ہے۔" اس نے کہا تو بابا ایک دم متوجہ ہو کر پوچھنے لگے۔

"سارہ، کیا کہتی ہے؟"

"کچ۔" وہ بوکھلا گیا۔ یعنی اس نے تو یونہی بات کی تھی اور بابا سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"کیا مزید بچے کی فرمائش کر رہی ہے؟" بابا نے خود ہی قیاس کر لیا۔

"نہیں بابا۔ اس بچے کے لیے اتنی فرمائشیں ہوتی ہیں۔ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔" اس نے کہا تو اب کی ماما بگڑ گئیں۔

"کیوں، وقت کیوں نہیں ہوتا۔ بچوں کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ ان کی تعلیم۔ تربیت صرف ماں کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ باپ کا بڑھاپا زیادہ ویل ادرتا ہے۔"

"جی ماما، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں سارہ کیا کر رہی ہے۔" اس نے بابا کے چہرے پر ناگواری کا تاثر دیکھ کر فوراً وہاں سے اٹھنے کی کی تھی۔ عجیب صورت حال کا سامنا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کسے خوش

کرے۔ کسے ناراض رہنے دے۔ اندر ہی اندر جھنجلاتے ہوئے واپس اپنے کمرے میں آیا تو یہاں سارہ موجود نہیں تھی۔ چند لمحوں کے لیے اس نے سکون کا سانس لیا لیکن پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کہیں سے بچے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔

"سارہ.....!" اس نے پکارا۔ جواب نہیں آیا۔ تو اس نے پچھلی کھڑکی سے لان میں جھانکا پھر اسے پکارتے ہوئے کوریڈور سے نکلتے ہی اس نے دیکھا سارہ کی گاڑی موجود نہیں تھی۔

"کہاں چلی گئی؟" وہ حیران ہوا اور واپس کمرے میں آکر اسے کال ملاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

سارہ نے کال ریسیو کر لی لیکن بولی کچھ نہیں۔

"سارہ کہاں ہو یار؟" اس نے پوچھا تو جواباً وہ تڑخ کر بولی۔

"تمہیں کیا؟ کہیں بھی ہوں۔"

"کیا مطلب.....؟"

"تم گھر چھوڑنے کی بات کر رہے تھے ناں تو میں چھوڑ آئی ہوں۔" سارہ نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

"او مائی گاڈ۔" اس کا دماغ گھوم گیا۔ دوبارہ کال ملائی۔ سہ بارہ، بیل جاتی رہی لیکن سارہ نے کال نہیں لی۔ تب اس نے محض اپنے اطمینان کے لیے خالہ یعنی سارہ کی مما کو فون کر کے اس کے بارے میں پوچھا اور اس کی وہاں موجودگی کا سن کر فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

خزینہ ہمیشہ کی طرح فاخرہ کے پاس آئی تھی۔ شوق اور محبت سے گلے مل کر حال احوال پوچھنے لگی۔ لیکن فاخرہ کے اندر کیونکہ حمزہ کی وجہ سے شرمندگی تھی اس لیے وہ ہمیشہ کی طرح اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے پا رہی تھیں۔ خوش تو تھیں لیکن اظہار میں پھیکا پن تھا۔ اندر سے خائف بھی تھیں۔ خزینہ محسوس کر رہی تھی۔

"کب آئیں بیٹا باہر سے؟" فاخرہ نے اسے آرام سے بیٹھنے کا کہہ کر پوچھا تھا۔

"کل ہی آئی ہوں چچی جان! گو کہ زیادہ دن تو نہیں رہی پھر بھی آپ سب بہت یاد آرہے تھے۔ جب ہی دیکھیں آج میں آپ کے پاس آگئی۔"

"اچھا کیا بیٹا خوش رہو۔ تمہارا میاں ٹھیک ہے؟"

"جی۔ اور یہ ہلا کہاں ہے۔ کالج سے تو آگئی ہوگی۔"

"ہاں ہاں۔ ہلا ادھر آؤ دیکھو کون آئی ہے۔" فاخرہ نے وہیں سے ہلا کو پکار کر کہا تو وہ بھاگی آئی۔

"کون سی بہن۔" خزینہ پر نظر پڑی تو اس سے لپٹ گئی۔ "ہائے سچ خزینہ آپی میں آپ کو اتنا یاد کر رہی تھی۔"

"جب ہی تو میں بھاگی چلی آئی۔" خزینہ نے اس کے گال پر پیار کیا پھر شاپر اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے بولی۔ "یہ تمہارے اور چچی جان کے لیے۔"

"ارے بیٹا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ تم آگئی ہو اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہوگی۔" فاخرہ نے کہتے ہوئے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ "ماشاءاللہ، اللہ نظر بد سے بچائے۔"

"چچی جان اب کوئی ایسی حور پری بھی نہیں ہوں میں جو نظر لگ جانے کا اندیشہ ہو۔" خزینہ نے بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں..... حور سے کم نہیں ہو تم۔" فاخرہ نے اس کی بلائیں لیں پھر ہلا سے بولیں۔ "ہلا بہن کے لیے کچھ لے کر آؤ۔"



"زیادہ تکلف نہیں کرنا ہلا!" اس نے کہا۔ ہلا ان سنی کر کے چلی گئی۔

"اور سنائیں چچی جان۔ ہلا کی شادی کب کر رہی ہیں.....؟" اس نے پوچھا تو فاخرہ دکھ سے بولیں۔

"ہلا کی شادی ہو تب۔"

"کیوں کیا ہوا؟ کیا لڑکے والوں نے کوئی ڈیمانڈ کر دی ہے.....؟" اسے فوری یہی خیال آیا تھا۔

"نہیں بیٹا۔ وہ تو بہت اچھے لوگ ہیں۔ خرابی تو ہمارے اندر ہے۔ تمہیں بھابھی جان نے بتایا تو ہوگا حمزہ....." فاخرہ حمزہ سے آگے بول ہی نہیں سکیں تو اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"جی چچی جان۔ واقعی بڑی عجیب سی بات ہے۔ کیا ہو گیا ہے حمزہ کو۔ میں بلکہ کوئی بھی ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔"

"میں کیا کروں۔ کچھ کہتی ہوں تو مر جانے کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ نہ میری عمر کا خیال ہے نہ صحت کا۔"

فاخرہ کا گلا رندھ گیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ چچی جان۔ میں بات کروں گی اس سے۔" اس نے فاخرہ کے ہاتھ تھپک کر کہا تو وہ اسے دیکھنے لگیں۔

"کوئی زبردستی نہیں ہے چچی جان۔ وہ اگر نہیں مانے گا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ بس آپ زیادہ دل کو نہ لگائیں۔"

"بیٹا میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"بالکل نہیں چچی جان! آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ کبھی یہ خیال کیجیے گا کہ حمزہ کے اس اقدام سے ہمارے آپ کے درمیان رنجش پیدا ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہم ایک خاندان ہیں چچی جان۔ ہمارے دکھ سکھ سانجھے ہیں۔" وہ بہت سمجھداری اور محبت سے فاخرہ کو وسوسوں سے نکال رہی تھی۔

پھر اسے حمزہ کا انتظار تھا اور وہ اپنے وقت پر ہی آفس سے آیا اور اب تو وہ کھڑے کھڑے فاخرہ کو سلام کر کے اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ ابھی بھی دروازے تک آکر سلام کیا لیکن خزینہ پر نظر پڑی تو رکنا پڑا۔

"کیسی ہو کب آئیں؟"

"ٹھیک ہوں اور دوپہر سے آئی ہوئی ہوں۔ تم آج جلدی آگئے یا یہی ٹائم ہے؟" خزینہ نے بات کرنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

"میرا کوئی ٹائم نہیں ہے۔ کبھی جلدی کبھی بہت دیر بھی ہو جاتی ہے۔ تم بتاؤ کھانا وانا کھایا یا نہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے چچی جان نے مجھے ایسا ہی بھوکا پیاسا بٹھا رکھا ہوگا۔" خزینہ نے ہنس کر کہا تو اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ پھر ہلا سے چائے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تو فاخرہ کہنے لگیں۔

"دیکھا تم نے اب ایسے ہی اجنبیوں کی طرح بات کرتا ہے۔ کر تو رہا ہے من مانی پھر کیوں اکھڑا اکھڑا ہے۔"

"حوصلہ رکھیں چچی جان! ٹھیک ہو جائے گا۔" خزینہ نے ان کا ہاتھ تھپکا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں آتی ہوں۔"

"بیٹا!" فاخرہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کہیں وہ بدتمیزی نہ کرے۔"

"ارے نہیں چچی جان! اتنا بد لحاظ نہیں ہے۔ پھر مجھے بھی زیادہ بات نہیں کرنی۔" وہ کہہ کر کمرے سے نکلی تو آگے ہلا چائے لا رہی تھی۔

"لاؤ یہ مجھے دے دو۔" وہ ٹرے میں سے دو مگ لے کر حمزہ کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کیوں لے آئیں؟"

"کیونکہ میں تمہارے ساتھ چائے پینا چاہتی ہوں۔" وہ ایک مگ اسے تھما کر آرام سے بیٹھ گئی اور حمزہ اس کی آمد کا مقصد سمجھ گیا تھا جب ہی اس کے بیٹھنے سے جز بز ہو کر رہ گیا۔

"بیلا! چائے اچھی بنائی ہے۔" وہ چائے کا سپ لے کر بولی۔

"ہوں..... تم اپنی سناؤ، ملائیشیا کا سفر کیسا رہا.....؟"

"اچھا رہا۔ انجوائے کیا لیکن یہاں آ کر عجیب بات سننے کو ملی۔ کیا واقعی تم؟" خزینہ غیر یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ تو وہ جیسے تنگ آ کر بولا تھا۔

"سوری خزینہ، میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"بات تو تمہیں کرنی پڑے گی حمزہ! کیونکہ یہ صرف تمہارا معاملہ نہیں ہے۔" خزینہ ایک دم بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ "بیس برس شہرینہ کو اپنا پابند رکھ کر اب یوں اچانک کیسے چھوڑ سکتے ہو تم اسے اور چاچی ہو تم سے کوئی پوچھے بھی نا۔ جواب دو، اب کیا عیب نظر آنے لگے ہیں تمہیں شہرینہ میں.....؟"

"عیب اس میں نہیں مجھ میں ہیں۔ بس یوں سمجھو میں اس کے قابل نہیں ہوں۔" وہ عاجزی سے بولا تھا۔

"کس لحاظ سے کہہ رہے ہو کہ تم اس کے قابل نہیں ہو.....؟"

"ہر لحاظ سے۔" وہ کہتے ہوئے ایک دم اٹھا اور کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی نکل گیا تھا۔

خزینہ حیران بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

خزینہ نے اٹھتے ہی ٹائم دیکھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ اسے حیرت ہوئی۔ یعنی کسی نے اسے اٹھایا ہی نہیں تھا۔ وہ بال سمیٹتے ہوئے بیڈ سے اترنے لگی کہ نظر شہرینہ پر پڑی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ خزینہ کے ہاتھ بالوں ہی میں رک گئے اور وہ شہرینہ کو دیکھنے لگی۔ جس کی سانسوں کی آمد و رفت میں درد بھری آہ تھی۔ جسے محسوس کرتے ہوئے خزینہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ پتا نہیں تقدیر نے اس کے ساتھ یہ مذاق کیوں کیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی۔ لیکن اسے حمزہ پر غصہ آنے لگا تھا۔ کیسا کٹھور بن گیا تھا۔ دل ہی دل میں اسے سخت سست کہتے ہوئے اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا پھر کمرے سے نکل آئی۔

حمیدہ بیگم لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ سلام کر کے پوچھنے لگی۔ "آپ نے ناشتا کیا امی.....؟"

"ہاں بیٹا میں تو سویرے ہی کر لیتی ہوں۔ تم دونوں کو میں نے اس لیے نہیں اٹھایا کہ رات پتا نہیں کب سوئی ہو گی۔"

"جی بس، باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ شہرینہ تو ابھی بھی بے خبر سو رہی ہے۔" وہ بتا کر کچن کی طرف بڑھنے لگی کہ حمیدہ بیگم نے روک دیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو۔ شہرینہ کو اٹھاؤ اور وہ ناشتا بنا دے گی۔"

"میں بنا لوں گی امی۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" وہ جلدی سے کچن میں آ گئی۔ حمیدہ بیگم وہیں سے شہرینہ کو پکارنے لگی تھیں۔

پھر جب اس نے ناشتا لا کر ٹیبل پر رکھا۔ شہرینہ بھی منہ ہاتھ دھو کر آ گئی۔ حمیدہ بیگم اسے ٹوکنا چاہتی تھیں لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں کی سرخی محض رتجگے کے باعث نہیں تھی یقیناً وہ روتی رہی تھی۔ حمیدہ بیگم نے اس سے نظریں کیا چرائیں کہ گیا وقت سامنے آ گیا۔ جب انہیں حمزہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور فاخرہ سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ ہمیشہ اپنے شوہر سے کہتی تھیں کہ میں ہرگز اپنی بیٹی اس گھر میں نہیں



بیاہوں گی اور اپنے ہی کھا بھرا کر وہ حمزہ پر بھی جتاتی تھیں اور اب وہی انہیں دعا دے گیا تھا۔ انہیں لگا جیسے وہ اسی انکار میں تھا کہ وقت آنے پر بدلہ لے لے۔

"کم ظرف۔" انہوں نے دانت پیسے تھے۔

"امی آپ چائے لیں گی۔" خزینہ نے اپنے لیے دوسرا کپ بناتے ہوئے ان سے پوچھا تو وہ چونک کر بولیں۔

"نہیں..... پھر وہاں سے اٹھنے لگی تھیں کہ ڈور بیل بج اٹھی۔ شہرینہ نے اٹھنا چاہا لیکن وہ ہاتھ سے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود ہی چلی گئیں۔

"اس وقت کون آ سکتا ہے۔" خزینہ نے خود سے کہا تھا کہ شہرینہ آواز سن کر بولی۔

"سعیدہ آپا ہیں۔"

"باپ رے۔ جلدی برتن اٹھاؤ ورنہ لمبا لیکچر سننے کو ملے گا۔" خزینہ جلدی میں جو برتن ہاتھ لگا اٹھا کر بھاگی پیچھے شہرینہ اٹھا کر لے گئی۔ دونوں اچھی طرح ہاتھ منہ صاف کر کے کچن سے نکلی تھیں۔

"السلام علیکم آپا کیسی ہیں؟" خزینہ پہلے ان کے گلے لگ گئی۔

"بس منہ دیکھے کی محبت مت جتایا کرو۔ میں ہی ہوں جو محبت میں چلی آتی ہوں۔ تمہیں تو توفیق نہیں ہوتی۔" سعیدہ حسب عادت بولے چلی گئیں۔ "اور میں تو کل ہی آ رہی تھی۔ فون کیا تو پتا چلا چچی جان کے ہاں گئی ہوئی ہو۔"

"جی اور آج میرا آپ کے ہاں آنے کا پروگرام تھا۔ پوچھ لیں امی سے....." خزینہ نے کہتے ہوئے آنکھ سے حمیدہ بیگم کو اشارہ کیا تو انہوں نے تاکید کر دی۔

"ہاں ابھی تمہارے ہی ہاں جانے کی بات کر رہی تھی۔"

"چلیں اب تو آپ آ گئی ہیں۔ بھتیجیں ناں اور بچوں کو کیوں نہیں لائیں.....؟"

"بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ تم کالج نہیں گئیں؟" سعیدہ نے بتاتے ہوئے شہرینہ سے پوچھ ڈالا۔

"میری وجہ سے نہیں گئی۔" خزینہ بول پڑی۔

"اچھا خیر، تم سناؤ، باہر کی آب و ہوا لگتا ہے راس نہیں آئی تمہیں کمزور ہو گئی ہو۔" سعیدہ نے سرتا پا اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تو وہ اپنے گال چھو کر کہنے لگی۔

"پتا نہیں آپا، آپ کو کہاں سے کمزور لگ رہی ہوں۔ ورنہ کل چچی جان تو مستقل میری بلائیں لیتی رہیں تھیں کہ ماشاء اللہ بہت پیاری ہو گئی ہو۔"

"ان کی تو عادت ہے۔ ویسے تم کس خوشی میں آتے ہی وہاں حاضری دینے پہنچ گئیں۔ کہیں شہرینہ کی شادی کی تو بات نہیں ہو رہی ہیں امی.....؟" سعیدہ بات خزینہ سے کر رہی تھی لیکن تصدیق کے لیے حمیدہ بیگم کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"ارے کیسی شادی؟" حمیدہ بیگم کو جیسے اچانک موقع مل گیا تھا۔ جلے انداز میں کہنے لگیں۔ "مجھے نہیں کرنی شہرینہ کی وہاں شادی۔ میرا تو شروع ہی سے ارادہ نہیں تھا۔ اب کل میں نے خزینہ کے ذریعے صاف منع کروا بھیجا ہے۔ خواہ مخواہ دونوں آپس میں بیٹھے رہیں۔"

"بیٹا آپ نے بہت اچھا کیا۔" سعیدہ فوراً بولی تھی۔ جبکہ شہرینہ وہاں سے ہٹ گئی۔ اور خزینہ حیرت سے ماں کو دیکھنے لگی۔

"اور نہیں تو کیا۔ بھلا بچپن میں کہیں رشتے طے ہوتے ہیں۔ پھر تم اور خزینہ دونوں ماشاء اللہ خوش حال گھروں میں بیاہی گئی ہو تو میری شہرینہ کا کیا قصور ہے جو میں اسے ایسے گھر میں بیاہ دوں جس کی سالوں سے

حالت نہیں بدلی۔" حمیدہ بیگم کا ڈپریشن ظاہر ہو رہا تھا۔ خزینہ پریشان ہو گئی کہ کہیں وہ فاخرہ اور حمزہ کو برا بھلا نہ کہنا شروع کر دیں۔ ان کی بات کاٹتے ہوئے بول پڑی۔

"امی آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے آپ نے بی پی کی ٹیبلٹ بھی نہیں لی۔"

"ہاں وہ تو میں بھول ہی گئی۔"

"جب ہی آپ کا بی پی ہائی ہو رہا ہے۔ چلیں کچھ دیر آرام کریں۔" اس نے حمیدہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔ پھر پہلے انہیں دوا دی۔ اس کے بعد سینہ کو اپنی شاپنگ دکھانے بیٹھ گئی تاکہ اس کا دھیان بٹ جائے۔

☆☆☆

اسے سارہ پر غصہ تھا جب ہی اس نے دوبارہ اسے فون نہیں کیا تھا۔ اور جب وہ رات میں بھی نہیں آئی تو اسے بھی ضد ہو گئی کہ وہ اسے لینے نہیں جائے گا۔ صبح وہ معمول کے مطابق اٹھ تو گیا تھا لیکن آفس جانے کو دل ہی نہیں چاہا۔ خالی کمرے کو دیکھتے ہوئے دوبارہ منہ لپیٹ کر سو گیا تھا۔

گیارہ بجے ماما نے آکر اسے اٹھایا۔

"کیا بات ہے ابھی تک پڑے سو رہے ہو اور یہ سارہ کہاں ہے۔۔۔؟" ماما نے پوچھا تو وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"آپ کے پاس بھی اس کا فون نہیں آیا۔۔۔؟"

"کیا مطلب، کہاں ہے وہ۔۔۔؟" ماما بھی چونکیں۔

"وہ کل جب میں آپ کے پاس بیٹھا تھا تو اپنی امی کے ہاں چلی گئی۔ مجھے آپ کو یعنی کسی کو بھی بتائے بغیر اور جب میں نے فون کیا تو کہنے لگی میں گھر چھوڑ آئی ہوں۔ اب آپ اس سے پوچھیں کہ وہ گھر چھوڑ کر کیوں گئی ہے۔ مجھے نہیں پتا۔" وہ کہہ کر دوبارہ لیٹ گیا تو ماما بگڑ گئیں۔

"تیمی۔۔۔ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سارہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ ایسے کیسے چلی گئی۔ تم نے کچھ کہا ہوگا اسے۔۔۔ بتاؤ کیا کہا تم نے۔۔۔؟"

"او ہو ماما۔۔۔ آپ ناراض کیوں ہو رہی ہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اگر تم بچے کی وجہ سے مجھے مستقل اگنور کرو گی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ یہ کہہ کر میں آپ کے پاس آ گیا تھا۔ اور وہ اس بات کو لے کر چلی گئی۔ اب بتائیں اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔" آخر میں وہ بہت معصوم بن کر ماما کو دیکھنے لگا تھا۔ ماما کچھ دیر جانچتی نظروں سے اسے دیکھتی رہیں پھر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"فون کرو اسے۔"

"سوری ماما کل میں نے بہت فون کیے اس نے ایک کال ریسیو نہیں کی۔ اب میں نہیں کروں گا۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

"میں بات کروں گی۔"

"ضرور کریں لیکن اپنے نمبر سے۔ اور کوئی ضرورت نہیں اس کی خوشامد کرنے کی۔ بلکہ آپ کو اس سے پوچھنا چاہیے کہ وہ بغیر بتائے کیسے گئی۔" وہ سنجیدگی سے بولا اور ماما کو سوچتے چھوڑ کر واش روم میں بند ہو گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ شاور لے کر نکلا تو ماما کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ اس نے آرام سے بالوں میں برش کیا، جوتے موزے پہنے پھر کمرے سے نکل کر آیا تو بابا فون پر یقیناً سارہ سے بات کر رہے تھے۔ وہ قصداً انجان بن کر ماما کو ناشتے کا اشارہ کرنے لگا جواباً انہوں نے کچن کی طرف اشارہ کر دیا کہ بٹلر سے کہے تو وہ ناگواری ظاہر کرتے ہوئے کچن میں آ گیا۔

"ناشتا لگا دیا ہے صاب۔۔۔ ٹیبل پر رکھا ہے۔" بٹلر نے اسے دیکھتے ہی کہا تو وہ پلٹ کر ڈائننگ روم میں آ گیا۔



پھر ناشتا کرتے ہوئے وہ یہی سوچتا رہا کہ پتا نہیں سارہ نے اپنے ماں باپ کو کیا داستان سنائی ہوگی اور بابا سے کیا بات ہوئی۔ ماما، بابا تو ویسے ہی زیادہ اس کی فیور کرتے تھے اور اب تک تو وہ بھی اس کے سامنے بے بس ہوتا آیا تھا۔ لیکن آج پہلی بار اسے نہ صرف سارہ پر غصہ آ رہا تھا بلکہ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی ناجائز بات پر اب جھکے گا، نہ آئندہ بھی۔۔۔ بہر حال ناشتے سے فارغ ہو کر وہ واپس لاؤنج میں آیا تو بابا کو اخبار میں مصروف دیکھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا کہ بابا نے پکار لیا۔

"تیمور۔۔۔!"

"جی۔۔۔" وہ بے اختیار پلٹا۔

"آج آفس نہیں گئے؟"

"بس بابا آنکھ نہیں کھلی۔۔۔ ابھی جاؤں گا۔"

"ہوں، بیٹھو۔۔۔" بابا اسے بیٹھنے کا کہہ کر اخبار لپیٹنے لگے۔ اس نے بیٹھتے ہوئے ماما کو دیکھا وہ قدرے خائف نظر آ رہی تھیں۔

"ہاں۔۔۔" بابا نے ہنکارا بھرا تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم جانتے ہو سارہ ہمیں بہت عزیز ہے اور تمہاری ماں کو بھی۔" بابا نے ابھی بات شروع کی تھی کہ وہ بول پڑا۔

"لیکن بابا۔۔۔"

"ایک منٹ۔ پہلے ہماری پوری بات سنو۔" بابا ٹوک کر کہنے لگے۔

"بے شک وہ ہمیں عزیز ہے لیکن اس نے جو حرکت کی ہے تمہاری جگہ اگر میں ہوتا تو میں بھی برداشت نہ کرتا۔ ہم اس کی محبت میں اس کی جائز یا ناجائز مان لیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حد سے گزر جائے۔ اسے اگر تمہاری کوئی بات بری لگی تھی تو مجھ سے یا تمہاری ماں سے کہتی۔ ہم ابھی زندہ ہیں۔" بابا کے سخت لہجے پر وہ بھی نہ صرف خائف ہوا بلکہ اس کا دل سارہ کے لیے کڑھنے لگا تھا۔

"بہر حال۔۔۔" بابا مزید گویا ہوئے۔ "یہ اس کی پہلی غلطی ہے اس لیے ہم معاف کر رہے ہیں آئندہ ایسی حرکت برداشت نہیں کریں گے۔ یہ بات ہم نے اس کے باپ کو بھی سمجھا دی ہے۔ اور ہاں اگر تم سمجھتے ہو کہ بچہ تمہارے لیے پرابلم ہے یا اس سے تمہاری پرسنل لائف ڈسٹرب ہو رہی ہے تو واپس کر دو انہیں جن کا ہے۔"

"یا اللہ۔۔۔" وہ چکرا گیا جبکہ ماما نے بے چین ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"نہیں بابا! میرا مطلب ہے بچہ پرابلم نہیں ہے۔" وہ تھوک نگل کر بولا تھا۔ بابا خاموش ہو گئے تو قدرے رک کر ماما ان سے پوچھنے لگیں۔

"تو یہ سارہ کو لے آئے۔۔۔؟"

"نہیں، اس کا باپ چھوڑ جائے گا۔ تم آفس جاؤ۔" بابا نے ماما کو جواب دے کر اس سے کہا تو اس نے اٹھنے میں دیر نہیں کی تھی۔

باہر آتے ہی اس نے گہری سانس کھینچ کر خود کو کسی نامعلوم شکنجے سے آزاد کیا تھا اور گو کہ بابا نے اس وقت صحیح فیصلہ کیا تھا پھر بھی اس کا دل سارہ کی طرف کھنچنے لگا کیونکہ وہ اس کی اولین محبت تھی دل چاہا ابھی اس کے پاس پہنچ جائے لیکن بابا کا غصہ اور ناراضی سوچ کر اس کی ہمت نہیں ہوئی تو خود پہ جبر کر کے اس نے گاڑی آفس کے راستے پر ڈال دی۔

☆☆☆

حمزہ گو کہ بے بس ہو چکا تھا۔ لیکن یاس نے ریکا اور اس کے گھر والوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ ابھی بھی وہ

پورے اعتماد سے ریکا کے سامنے بیٹھا تھا۔ انداز میں قدرے لاپروائی بھی تھی۔ جسے فی الحال نظرانداز کرنے پر ریکا مجبور تھی۔ ابھی بھی اس کے لاپرواہ لہجے کو دیکھ کر بادل ناخواستہ سہی لیکن ہنس کر بولی تھی۔

"اچھے لگ رہے ہو۔"

"میں کب اچھا نہیں لگتا؟" حمزہ نے شگفتہ انداز میں جتایا تو اس نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا پھر کہنے لگی۔

"اچھا ویسے۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے تا کہ تمہیں سارا پروگرام بتادوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا تو وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

"کیا معلوم ہے؟"

"یہی کہ حسان صاحب نے ہماری شادی طے کر دی ہے۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد یعنی آج ہی کے دن۔۔۔ یہی ناں۔" آخر میں اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ زچ انداز میں بولی تھی۔

"ہاں لیکن کیسے ہوگی کہاں ہوگی۔"

"یہ تم بتادو۔۔۔" اس نے یوں دونوں بازو سینے پر لپیٹ لیے جیسے ہمہ تن گوش ہو۔

"وہی بتا رہی ہوں۔ کیونکہ شادی میں تمہاری طرف سے کوئی شریک نہیں ہوگا اس لیے پی سی میں تمہارے نام سے کمرہ بک کروادیا ہے۔ تم چاہو ابھی وہاں شفٹ ہو جاؤ یا شادی سے دو دن پہلے۔ وہیں ہماری شادی ہوگی اور ولیمہ بھی اس کے بعد۔"

"پھر تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔" وہ بے اختیار بولا تھا۔ ریکا نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور قدرے رک کر کہنے لگی۔

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ جب تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ گے تو وہاں مجھے کیسے لوگوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آئی مین جب شادی میں کوئی شریک نہیں ہوا تو مجھے ایکسیپٹ کیسے کریں گے۔"

"تم پر منحصر ہے کہ تم اپنے آپ کو کیسے منواتی ہو۔" وہ بڑے آرام سے خود بری الذمہ ہو گیا۔ ریکا اندر سے کھول کر رہ گئی لیکن ابھی وہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھی اس لیے فوراً بات بدل گئی۔

"اچھا چلو اب کچھ شاپنگ کر لیں۔ میرا خیال ہے ویڈنگ ڈریس تمہاری پسند کا ہونا چاہیے۔"

"سوری یار میری پسند پر بھروسا مت کرو۔ مجھے لیڈیز شاپنگ کا بالکل تجربہ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو تم مذاق بن جاؤ۔ اپنی کزن یا سسٹر کے ساتھ چلی جانا۔" آخر میں مشورہ بھی دے ڈالا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر چلیں گے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آج ہی کے دن۔" اس نے کہا تو وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلی گئی۔

"ہونہہ؟" عجیب یاسیت تھی۔ وہ اس کی گاڑی جانے تک وہیں بیٹھا رہا پھر گھر جانے کے لیے اٹھا۔ لیکن راستے میں جانے کیا خیال آیا کہ پارکنگ کا رخ موڑ دیا اور چند منٹ میں پی سی ہوٹل پہنچ گیا۔ ریسیپشن پر اپنا آئی ڈی کارڈ دکھا کر کمرے کی چابی حاصل کی۔ اسپیشل روم تھا۔ دلہا دلہن کے لیے۔ اگر دلہن اس کی من پسند ہوتی تو یقیناً وہ خوش ہوتا لیکن اب ہر چیز سے اسے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ خواب ناک ماحول خوف ناک لگ رہا تھا۔ وہ جو کمرے میں داخل ہو کر رکا تھا تو بس وہیں ٹھہر گیا۔ کتنی دیر تک سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ شاید اپنا مقتل دیکھنے۔ دل مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ اسے لگا جیسے سانسیں بھی رکنے لگی ہوں۔ تب گھبرا کر الٹے پیروں پیچھے ہٹتے ہوئے وہ زہر خند لہجے میں بڑبڑانے لگا۔

"اب تک تم نے جو چاہا ریکا حسان۔ لیکن اب بس تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ اور اب جو حمزہ احمد علی چاہے گا۔ وہی ہوگا۔"

(باقی ان شاءاللہ آئندہ ماہ)

مصباح علی سید

# رُوبرُو رخِ یار

موسم آتی بہار کا تھا، سردیوں کی مار کھائے منڈ منڈ درختوں پر چھوٹی کونپلیں، اور کھیتوں میں چہار سو پھیلی سرسوں کی باس، خاموش فضا کو اپنا حسن پہنا چکی تھی، یہ موسم اسے شروع سے بہت پسند رہا تھا، بلاوجہ چلنے کو جی چاہتا، کوئی ساتھ ہو تو پیدل چلے آسمان کنارے تک، بس یہ خواہش ہی رہی تھی آج تک کوئی اس کے ساتھ دو قدم ملا کر ساتھ نہ چل پایا، حالانکہ وہ دوسرے کو خوش رکھنے کے لیے دل کی آواز دبا دیتی تھی، بس مقابل خوش رہے۔ مقابل اسے ایسے ایسے ملے تھے کئی بار خود سے سوال کرتی۔

''کیا میری شکل یا خصوصیت ریسلرز سے ملتی ہے، جو زندگی ہر بار اپنا تکا بنا کر سید حاضر پر اٹیک کرتی ہے۔''

پھر خود ہی مسکرا دیتی۔ ''نہیں یار زندگی ہیجھ اس کے لیے بھول بھلیاں بناتی ہے جو راستہ ڈھونڈنے کا شوقین بھی ہو اور فن کار بھی۔''

ہونہہ۔ زندگی کی بھول بھلیاں۔ سوچتے ہوئے اس کی نگاہ کیلنڈر پر گئی "4 مارچ" اس ہندسے پر نگاہ ٹک سی گئی، آنکھوں میں پانی آ رکا، بھول جانے والی تاریخ تھی تو نہیں لیکن جس سے وابستہ تھی اس نے بھلانے کی جان توڑ کوشش کی تھی، اس تاریخ کو ملا بھی ہو تو نہیں، بچھڑا بھی نہیں بس دل میں کہیں اندر تک کچھ کٹ سا ہو گیا تھا، جو آج پورا سال گزر جانے پر ٹیس کی صورت درد دینے لگا۔ وہ حویلی کے پچھواڑے بنے آم کے باغ میں آ گئی، سبز لمبے پیڑوں کے درمیان بور تو خاصا تھا، اب کہیں چھوٹی چھوٹی سبز امبیاں بھی لمبے ہیروں کی طرح جھولتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ اس پر ڈالے گئے جھولے پر بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے جھولنے لگی۔ نگاہ آسمان پر اڑتے ابابیلوں کے قافلے پر تھی، موسموں کے بدلنے کا ترانہ گاتے مست اڑے جا رہے تھے۔

☆☆☆

دن کی سنہری کرنوں نے پورے شہر میں اتنی روشنی یقیناً نہیں پھیلائی تھی جتنا سارہ، ریاض اور عمیرا رؤف نے کمرے میں طوفان بدتمیزی پھیلا رکھا تھا دونوں کے بیڈ پر سوٹ کیس کھلے رکھے تھے اور سارا سامان ان کے ارد گرد، خالی ڈبوں کا ڈھیر الگ سے ایک جانب منہ چڑا رہا تھا۔ دو سال ریکارڈ تھا ایک دن کے لیے بھی گھر جاتا ہوتا تو چیزوں کے بجھے ادھیڑ کر رکھ دیتیں۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو دیواروں کی وہ اینٹیں جنہیں اپنے کارناموں یا نام نہاد منگیتروں کی یاد میں اکثر و بیشتر ہاتھ کے چھاپے مار مار کر بھرتی پائی جاتیں اور وہ اور ان کی آمد پر کترتیں بھی وان دیواروں کی اینٹیں بھی نکال کر گھر لے جاتیں، اپنے بکس

بھائیوں کو صرف یہ بتانے کے لیے کہ ہوسٹل میں وقت کیسے کاٹے تھیں کتنا اور اس سب ہنگامے سے بے نیاز نیہا خلیل اپنے بیڈ پر خاموش بیٹھی ان دونوں کی اماں کی پیکنگ دیکھ دیکھ کر کڑھ رہی تھی، کپڑوں پر کپڑے بیگ میں ٹھونسنے کے حساب سے بھری ساری کو دیکھ کر اسے ہضم کرنا مشکل ہو گیا۔

"آج قرآنی ڈے ہے یار! سنڈے کو تمہیں رات تک واپس آجانا ہے، پھر ساری الماری لے جانے کی تک ہے۔"

"میلے ہیں دھلوانے کے لیے لے جارہی ہوں، ورنہ شوق نہیں ہے قلی بن کر بیگ گھسیٹنے کا۔"

"یہاں دھوتے تمہارے ہاتھ ٹوٹتے ہیں، میں نہیں دھوتی کیا۔"

"ایک تو تمہیں مظلوم بننے کا بہت شوق ہے، دوسرے ہماری اماں نے ہفتے بھر کی مشین میرے انتظار میں ہی روکی ہوئی ہوتی ہے کہ شہزادی آئے گی میلے کپڑے دھلوا کر لے جائے گی۔"

سارہ نے کہتے کہتے دیوار پر لٹکے اکلوتے ہینگر سے اپنی شرٹ اس بے دردی سے کھینچی کہ ہینگر کا ہک کیل پر اٹکا رہ گیا اور بقیہ حصے کے ساتھ شرٹ اس کے ہاتھ میں۔ یہ منظر دیکھ کر کونے میں بیٹھی گاؤن استری کرتی سمیرا کا منہ ایسے کھلا تھا جیسے ہینگر نہیں غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور وہ اس میں دب کر مرنے کے قریب ہو۔ گاؤن سے استری تک ہٹانا بھول گئی، وہاں سے ہی جلائی تھی۔

"سارہ کی بچی! یہ کیا کیا تم نے، نیہا کا آخری ہینگر بھی توڑ دیا، اب وہ کہاں کپڑے لٹکائے گی۔"

"نیلا، سبز، کالا اور دو سفید، کل ملا کر چھ ہو گئے۔" سارہ کا حساب منکر نکیر جیسا تھا۔ "آتے ہوئے لے آؤں گی، بلکہ تین سو میں بھی، جو میں اگلے چکر تک توڑ دوں گی۔"

"تو دے تو نہیں البتہ لانے یاد رکھنا، پچھلی بار کی طرح نہیں، قرض خواہوں کی لمبی چوڑی لسٹ لے کر گئی تھیں اور بھول آئی تھیں، پھر یہاں یونی کے کینٹین سے دگنی قیمت پر لیا تھا سب۔"

"جی اور وہ دگنی قیمت میرے ابا جی کی کمائی کی تھی، اس لیے جتانے کی ضرورت ـــ"

"ضرورت" تو اس کے پورے جملے منہ میں رہ گیا، آنکھیں پھیل گئیں کیوں کہ اس کی نگاہ استری کے پیچھے سے اٹھتے دھوئیں کی جانب تھی، نیہا نے سارہ کے تعاقب میں دیکھا۔ اس کا گاؤن مرغوب حسیابہ بو اور دھواں پھیلا رہا تھا۔ جی چاہا پاس رکھی کتاب، چمچ پلیٹ، مگ، بلکہ جیم کی بوتل سمیرا کے سر میں دے مارے اسے ہر کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ایسی بیماری تھی کہ کام چور ماسیوں کی طرح اپنا کام چھوڑ کر قصے سنانے کھڑی ہو جاتی۔

☆☆☆

کچھ دن پہلے کا قصہ تھا، ہوسٹل کی بارش، جس میں نہ ماں کی ڈانٹ کا ڈر تھا نہ خواہ مخواہ میں بنی بڑی آپاؤں کا۔ ہوا سے زیادہ لڑکیاں مست بنی چکرا رہی تھیں، کئی اپنے کرتب دکھاتی ہوئی چھت تک چلی گئیں، کئی نے دل میں اچھی ریمپ واک کی خواہش اس بارش میں پوری کرتے سیلفیاں بنائیں اور ریکارڈ توڑ پاؤٹ بنائے، وہ تو ایک الگ قصہ تھا ان کے چہرے کے بنے پاؤٹ وارڈن نے آکر کیسے ـــ توڑ کر سیدھے کیے۔ ویسے وارڈن کو چاٹ چلاتا کیا ان کی نظر تیسری منزل کی منڈیر پر بیٹھی سارہ پر جالی والے معاف کرے منہ اس قدر ٹیڑھا کر کے چپک ہوا رہی تھی وارڈن کی گزرتے گزرتے نگاہ چلی گئی، گلے میں لٹکتا نظر کا چشمہ لگا کر ذرا مزید غور کیا، پہلا خیال یہی آیا تھا لڑکی کا منہ ٹھنڈی بارش سے اکڑ گیا، پھر کچھ سا لگا، کسی جاننے والے کو تازہ، لقوہ ہوا تھا، جوان جہان لڑکی کی یہ حالت دیکھ کر وارڈن کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی، وہ بھاگی دوڑی تیسری منزل تک پہنچیں، جب تک لقوے کے آثار کئی لڑکیوں میں چھوت کی طرح پھیل چکے تھے اور اتنی جاہل اب وارڈن بھی نہیں تھیں، اس چھوت کا مطلب نہ سمجھ پاتیں، جو انہوں نے ان سب کے ساتھ کیا تھا بتانے کے قابل نہیں تھا، بس سب اپنے سروں پر گیلے دوپٹے لپیٹے شرافت سے نیچے آگئی تھیں اور اس بارش کے نتیجے میں باجماعت عزت افزائی کے نتیجے میں سب کو چھینکیں شروع ہو گئیں، آنکھوں کے ساتھ ناک بھی بہی۔

☆☆☆

یونی سے واپسی پر نیہا کینٹین سے انڈے لے آئی کہ ابال کر چائے کے ساتھ کھائیں گے، کچھ افاقہ ہوگا۔ ابھی اس نے لا کر رکھے ہی تھے کہ سامنے روم والی فاطمہ کے بخار کا پتا چلا۔ سمیرا اپنی ہمدردیاں لے کر پہنچی، انڈے ابلنے پین میں رکھے اور خود اس کا سر دبانے بیٹھ گئی۔ روبی (چھپکلی روم والی) کے کمرے میں چھپکلی گھس گئی، دونوں روم میٹس نے چیخوں کا طوفان اٹھا لیا، سمیرا کے ہوتے کوئی مشکل میں ہو، ہو ہی نہیں سکتا۔ جھاڑو نکالی اور چھپکلی کے پیچھے پیچھے۔ کمرے سے تو چھپکلی بہت مہارت سے نکال لائی تھی، لیکن وہ اسے سزا کے طور پر اپنے بلاک سے دیس نکالا دینا چاہتی تھی، ایک جانب سے شارٹ لگائی تھی، خیال تھا ہال کی جانب کرے گی اور پانی ابال کر بیچاری جائے گی لیکن واہ رے ری قسمت، ذرا سا اندازہ غلط ہو گیا، راہداری پر آتی وارڈن کے اوپر چھپکلی نے چھلانگ لگا دی۔ پھر کیا تھا، چھپکلی تو وارڈن کے سینے پر سے سنگ شدہ بالوں میں گم ہو گئی مگر وارڈن کی حواس باختگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ چھپکلی بھی سیر کر کے خود بھی پچھتائی ہوگی، جتنی وارڈن چیختی تھیں۔ چھپکلی وہاں سے چھلانگ لگا کر جانے کہاں غائب ہوئی لیکن جو حالت وارڈن کی ہیجانی کر گئی تھی، انہی کا کام تھا کہ دیر میں وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی اور سمیرا اندر۔ لیکن ہاتھ ہی کی سکائی نے انہیں ہوش دلایا اور اپنی جانی پہچانی آواز میں بولیں۔

"کس بدتمیز کی حرکت تھی۔"

سمیرا "چھپکلی" کہنا چاہ رہی تھی لیکن سب لڑکیاں اپنے اپنے دروازوں میں کھڑی سمیرا بدتمیز کو دیکھ رہی تھیں، جیسے وہ چھپکلی کی ہم شکل ہو یا اسی نے چھلانگ لگائی ہو اور سمیرا معصوم سی شکل بنائے نیہا خلیل کو، نیہا کو اس پر ترس آگیا، وہ آگے بڑھی اور ہمت کر کے کہہ دیا۔

"ایم سوری میم۔ مجھ سے غلطی ہو گئی، دراصل وہ چھپکلی۔"

میم نے اسے سر سے پاؤں تک گھورا، دل تو میم کا چاہا ہوسٹل کی ساری چھپکلیاں پکڑ کر نیہا پر اچھال دیں، جس طرح آج اس نے ان کا تراہ نکال دیا وہ ڈپٹ کر بولیں۔

"ذرا میرے آفس آؤ۔ غلطی وہاں سدھاروں گی۔" نیہا آنے والی شامت کے زیر اثر پیچھے پیچھے چل پڑی، سب باجماعت اسے حوصلہ دینے اور اس کا معافی نامہ لے کر، میم نے سخت نگاہوں سے سب کو گھورا۔ اپنے آفس کی رگڑ رگڑ کر صفائی کروائی تھی اور اس ساری کارروائی کے دوران انڈے ابل کر جلے اور پھر پھٹ بھی گئے۔ جس کا اعلان آنٹی نسیمہ کی پاٹ دار آواز نے کیا تھا۔

"کسی لڑکی کے انڈے جل کر پھٹ گئے۔"

کسی لڑکی میں سمیرا اسی کی آنکھیں چمکیں اور نیہا کا دل کیا ان پھٹے انڈوں کا سرمہ بنا کر سمیرا کی آنکھوں میں لگا دے، جسے ہر وقت ہمدردی کا جنون سوار رہتا ہے اور آج ہینگر کے قصے میں نیہا کے گاؤن کا قصہ پاک ہو گیا۔ خدا گواہ تھا سمیرا اٹھنا خود بھی کہیں کر جانے کے ارادے سے گاؤن استری نہیں کر رہی تھی،

وہ تو کام چور سارہ نے نیہا سے یہ کہہ کر مانگا تھا۔

"یار تم نے تو یقیناً اس بار بھی نہیں جانا ہوگا،

مجھے لے جانے دو ورزن کو ذرا ہائی دکھانا ہے پلیز۔"
سمیرا نے نہ صرف تائید کی بلکہ اتنے فراخ دلی سے کہا جیسے گاؤن نیہا کے بجائے اس کا ہو۔
"ہاں تو لے جاؤ، روم میٹ کی سب چیزیں مشترکہ ہوتی ہیں یار۔" کہتے ساتھ گاؤن اٹھا استری لگا، پھیرنی شروع کر دی۔
"سارہ یار، میں تمہارے لیے گاؤن پریس کرتی ہوں، تم جلدی جلدی کپڑے سمیٹو، ڈرائیور کی تین بار کال آ گئی ہے، گاڑی اسٹارٹ ہو گی، بے چارے کے پٹرول کا خرچا ہو گا۔"
سارہ نے بے مروتی سے کہا۔ "بے چارے کا دکھ تو ایسے ہو رہا ہے جیسے مستقبل میں اسے پارٹنر بنانے کا ارادہ ہو۔"
"او ہو۔" کہہ کر سمیرا نے استری تیز کر لی، اور بس، اس سے تو کہیں بہتر تھا سارہ بنا استری کے ہی شکن والی پہن جاتی، اب یہ بڑے سے سوراخ والا اور وہ بھی اتنے سارے لوگوں کے بیچ، کہیں لوگ فقیرنی سمجھ کر چندہ ہی نہ دے ڈالیں۔
"اُف۔" سارہ نے کچا چباتی نگاہوں سے سمیرا کو گھورا، سمیرا اپنی اس غلطی پر نیہا سے شرمندہ تھی، جبکہ سارہ صرف اس لیے پریشان تھی اس نے اپنا گاؤن ان میلے کپڑوں میں رکھ چھوڑا تھا جن میں آٹھ دس میلی جرابیں تھیں، تو یہ جرابیں بھی سارہ کی، کسی مرتے کو سنگھا دو۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ جائے، ایک تو سارہ کو مکمل بند بوٹ پہننے کی عادت نہیں بیماری تھی اوپر سے پاؤں کا پسینہ، جیسے ہی روم میں داخل ہو کر بوٹ اتارتی، نیہا، سمیرا اپنے سانس روکنے کو ناک پر چٹکی بھرتے اسے دھاڑ کر کہتیں۔
"دفع ہو باہر۔"
"کیا مصیبت ہے یار۔"
سارہ کے جھنجلانے پر نیہا نے ناک چھوڑ کر پاس رکھا اسکیل اس کی کمر پر مارا۔ "مصیبت نہیں تمہاری جرابیں، بدبو سے ہمارا سانس رک رہا ہے، باہر اتار کر آؤ۔"
"میرا کیا قصور ہے اگر ان سے اسمیل آتی ہے۔"
"میری جان۔" سمیرا نے پاس رکھے تکیے سے اس کی کمر بجائی۔ "قصور تمہارا نہیں، تمہارے اماں ابا کا ہے جنہوں نے اتنی سست اولاد پیدا کر کے پڑھنے کے لیے ہوسٹل چھوڑ دی۔ اب خدا کے واسطے اپنے اماں ابا کی غلطی کی سزا ہمیں مت دو۔"
اس طرح کے جملے اس کا دل تو بہت دکھاتے تھے لیکن دکھی دل کا اس نے کبھی علاج نہ کیا، بندہ کبھی پاؤں دھو کر بھی جراب پہن سکتا ہے، لیکن نہیں، اس نے اپنا گاؤن نکالا اور نیہا کا باڈی اسپرے خوب اس پر چھڑکا تھا، کیوں کہ اپنا تو سارا سامان میں پھینک کر بیٹھی تھی دوبارہ سب کھولنے کی ہمت نہیں کی، بدبو اور خوشبو مل کر عجیب تعفن پھیلا رہی تھی، نیہا کو اپنے اسپرے کے بے دریغ استعمال پر غصہ آ رہا تھا ایک دھموکا لگا کر اس سے پوچھا
"اپنا نکال، کنجوس شیطانی۔"
سمیرا کا اس پھیلائی گئی مہک سے دل خراب ہو رہا، جو اسے سارے راستے برداشت کرنی تھی۔

☆☆☆

سارہ، سمیرا اور نیہا کوئی بچپن کی سہیلیاں نہیں تھیں ان کی دوستی کو دو ڈھائی سال گزرے تھے، ہوسٹل کی روم میٹ ہونے پر دوستی ہوئی، اور روم میٹ کی دوستی تو بہنوں سی رازداں ہوتی ہے، خوشی سانجھی، غم سانجھے، فائدہ سانجھا ہو نہ ہو، نقصان البتہ کبھی کبھار سانجھا ہو جاتا ہے۔ ایک کی چیز غلطی سے ٹوٹی تھی دوسری جان بوجھ کر سودا توڑ کر دیتی تھی۔ سارہ اچھی متمول فیملی کی نمائندہ تھی لیکن پیدائشی سست، اماں کو جب اس کی سستی پر غصہ آتا تو کہتیں۔
"اتنی سست پیدا ہوئی تھی، نرس نے طمانچے لگا کر رلایا تھا۔" اس کی سستی کی اہم وجہ یہ بھی تھی، بہنوں میں تیسرے نمبر پر تھی پھر بھائی بھی درمیان میں آ گئے، اس تک کام آتے آتے، اوپر اوپر ہی ہو جاتے، جب بڑی کی شادی ہوئی اور چھوٹی کے رشتے کی تلاش جاری تھی تو سارہ کو اپنی فکر لگ گئی، کیوں کہ بہنوں کے لیے جب بھی کوئی رشتے کے لیے آیا پہلا سوال "اور کیا کرتی ہے آپ کی بیٹی۔"
امی بھی فخریہ بتاتیں بڑی آپی فزکس پڑھ چکی تھی اور چھوٹی ایم بی اے کا اس، پچھلے جاب فیملی سے کوئی اتفاقاً لڑکی ہی کر رہی تھی لیکن سب کے بیچ میں اس کی تعلیم کا ڈنکا ضرور بجتا تھا۔ بھائیوں نے اپنی دلہنوں کے لیے پہلی شرط یہی رکھی۔
"ایسی لڑکی شکل صورت کی جیسی بھی ہو لیکن پلیز تعلیم ضرور دیکھ لیجیے گا۔"
بھائیوں پر تو تکیہ تھا وہ بھی ہوا دینے لگے، مطلب سارہ کی ایف اے کس کھاتے میں نہیں آئے گی، اگر رشتے کا معیار بہترین ڈگری ہے تو یقین یہ تو لگی ہی پڑے گی، چاہے جان جوکھوں میں ڈالے یا تنکے سر میں۔ بھاگ دوڑ کر کے ڈگری ہاتھ آنی چاہیے، ورنہ تو ساری زندگی بھابھیاں، بچے کھلانے میں ہلکان ہو جائے گی۔ لوگ ڈگری کی آس میں یونی آتے ہیں، وہ رشتے کی آس لے کر یونی میں آئی تھی اور جھٹکے سے ہی کسی ایم اے انگلش کے آخری سمسٹر تک پہنچ ہی گئی، رشتے کا امکان بھی کچھ قریب قریب لگتا تھا۔

☆☆☆

سمیرا مڈل کلاس سے تھی اور وہ کلاس جو اپنا اسٹینڈرڈ بڑھانے اور اپر کلاس کے ہم قدم ہونے کے لیے ہمیشہ پنجوں کے بل کھڑے ہو کر جان توڑ محنت کرنے کو عظمت سمجھتی ہے۔ اسے حقیقتاً اچھی ڈگری کی تلاش تھی تاکہ مستقبل میں اس سرمایہ کاری سے گھر کا معیار زندگی پر آسائش کیا جائے۔ ایک بہن تھی، دو بھائی۔ وہ سب میں بڑی اور بہن بھائیوں کے لیے ماں کے طور پر بھی خود کو قابل بنانے میں لگی تھی، کیوں کہ اماں ابا کی ساری امیدیں اسی بڑی اولاد سے لگی ہوتی ہیں۔ وہ ایم اے انگلش کے آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی، اور آج کل اس کے دماغ میں روز کوئی نئی فصل پک رہی ہوتی اور اگر اسائنمنٹ میں کسی کو کوئی بیج یا پودا لے جانا ہوتا تو سمیرا کو فون کرنے کی دیر تھی، یونی کا لان ادھیڑ کر رکھ دیتی۔ پھر پچھلے مالی سے سزا کے طور پر کئی دن پودوں کو پانی لگانے کی ڈیوٹی دینی پڑتی۔

☆☆☆

نیہا بھی سانولی اور قدرے لمبی اور خاصی پرکشش، اسے نہ رشتے کا مسئلہ تھا کیوں کہ خاندان میں ایک لمبی لائن لگی تھی جو اسے بیاہ کر اپنے گھر لے جانے کے ایسے خواہاں تھے، جیسے وہ دنیا کی آخری بچ جانے والی لڑکی ہو، کئی بار تو ایسے لگتا تھا وہ انسان نہیں بلکہ دو گروہوں میں لگی رسی ہے۔ کبھی ایک گروپ اپنی جانب کھینچ کر جیت سے سرشار ہونے کو ہوتا تو کبھی دوسرا اور جاب تو اس کا کبھی خواب نہیں رہا تھا، ابا کی خاندانی زمینوں کے علاوہ بزنس کی شاندار آمدن تھی، اور پھر خاندان میں تعلیم کا کوئی ایسا رواج نہیں تھا کہ ڈگریوں کے نام لڑکوں کے لیے بچا کے جائیں نہ کہ لڑکیاں خوار ہوں، خاندان میں جو تا ہی کرائی پڑھے لکھے تھے، وہ علاقے کے کالج سے بی اے، ایم اے کے فارغ التحصیل تھے اور انہی کا ڈنکا بجتا تھا، نیہا کا یونی میں آنے کا سبب سب سے عجیب تھا، اسے فرار چاہیے تھا، بلکہ یہ کہنا بہت مناسب ہو گا اس کے ابا کو اپنی لاڈلی بیٹی کا فرار چاہیے تھا۔ ہے نا بہت عجیب بات، کون زمیندار باپ ایسا ہو گا جو بیٹی کو تحفظ دینے کے لیے راہ فرار ہاسٹل نکالے۔

☆☆☆

خلیل الرحمان دن رات کی سوچ بچار سے عاجز آ چکے تھے، دماغ سوچ سوچ کر پھٹنے کو ہوتا، دوست احباب سے اتنا پر عمل مشورہ لینا زمیندار کی ناک آڑے آ جاتی ہے۔ مگر زبیر صدیقی، بچپن کا ایک ایسا دوست اور رازداں تھا جسے بتانے بنا دوست کے مسئلے الہام کی صورت پتا چلتے تھے۔ فی الوقت وہ لاہور میں قیام پذیر تھے لیکن کبھی گئے رحیم یار خان

کے اسی گاؤں سے تھے جہاں خلیل الرحمان رہتے تھے۔ اماں ابا گو کہ ان کے بھی پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن ان کا خواب اکلوتے بیٹے کو آفیسر بنانے کا تھا، وطن دوستوں سے ایف اے بہترین نمبروں سے کیا، خلیل الرحمان نے نسل در نسل منتقل ہوتی آئی زمینداری سنبھالی اور ساتھ ہی خاندان میں ان کی شادی بھی کر دی گئی۔

زبیر کے ابا نے انہیں اپنے بھائی کے پاس لاہور بھجوا دیا۔ تعلیمی مدارج کے دوران آنے والی چھٹیوں میں ہی واپسی ہوتی۔ جو گنتی کے دنوں پر مشتمل ہوتی مگر زبیر کا وہ گنتی کا وقت خلیل الرحمان کے باغات میں گزرتا۔ وقت بڑھتا گیا زبیر کو لاہور میں ہی ایک بہترین جاب ملی، پھر لڑکی بھی پسند کر لی مگر دوستی پر ایسی بھی کروٹ جی کہ لاتعلق ہو جاتے۔ زبیر کے اماں، ابا ان کے پاس شفٹ ہو چکے تھے، رحیم یار خان کا گھر بک چکا تھا، لیکن دوستی تھا کوئی مال نہیں جو بک کر ختم ہو جاتی۔ عید، بقرہ عید خوشی غمی دونوں کا آنا جانا لگا رہا۔

☆☆☆

سالانہ چھٹیوں کے دن تھے جب زبیر بطور خاص خلیل کے پاس رہنے آئے ہوئے تھے اور ان کے بتائے بغیر بھی محسوس کر گئے، کچھ ایسا ہے جو خلیل بتانے سے گریزاں ہیں، لیکن وہ دوست کیا جو کرید نہ جانے۔ جب سارا مسئلہ سن لیا تو وہ ٹوک کر کہا تھا۔

"اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے بچی کو پڑھنے کہیں دوسرے شہر بھیج دو۔"

"کیا مطلب ہے دوسرے شہر، یار ہمارے خاندان کی بچیاں گاؤں سے دوسرے کالج پڑھنے نہیں گئیں، تم دوسرے شہر کی بات کر رہے ہو۔ خاندان والے تو بعد میں میرے بیٹے میری جان کھا جائیں گے۔"

خلیل الرحمان کی بے بسی پر وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے جم کر بولے تھے۔

"نیہا کس کی بیٹی ہے تمہاری یا تمہارے بیٹوں کی۔ تم باپ ہو اور شادی کرنے سے پہلے اس کی تعلیم مکمل کرنے کا پورا اختیار رکھتے ہو۔"

زبیر صدیقی کا مشورہ برا نہیں تھا، خلیل الرحمان کی سمجھ میں پوری طرح آ گیا۔

"میں اس کا لاہور میں ایڈمیشن کرواتا ہوں، بس جیسے کلاسز اسٹارٹ ہوں، تم بچی کو ہاسٹل بھجوا دینا۔ بات ختم۔"

زبیر تو اپنے طور پر بات ختم کر کے روانہ ہو چکے تھے لیکن جب خلیل الرحمان کے بیٹوں نے ابا کے منہ سے نیہا کے ہوسٹل رہنے کا سنا تو آنکھوں کی دہکتی چنگاریاں آواز کی صورت منہ سے بھی نکلی تھیں۔

"کیا ہو گیا ابا، سٹھیا تو نہیں گئے، دنیا جوان بچیوں کو شادی کر کے پردیس بھجواتی ہے، آپ پڑھنے کے لیے۔ ہوش کے ناخن لیجیے، کیوں خاندان سے تھو تھو کروانی ہے۔"

بڑے بیٹے کی غیرت مندانہ بات کو خلیل الرحمان نے بہت تحمل سے سنا اور بنا جواب دیے سامنے سے ہٹ گئے، چھوٹا بیٹا بڑے سے بھی زیادہ جذباتی ہو رہا تھا، نیہا کے سامنے ہی غصے سے اکھڑ گیا۔

"کیا، کیا، کیا۔۔۔ ہوسٹل میں رہے گی آپ کی شہزادی، جانتے بھی ہیں کیسی کیسی چھچھوری لڑکیاں رہتی ہیں، چودہ ہے پر اتے کھینچ کر کھا جائیں گی اور اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔" چھوٹے کے الفاظ اس قدر رنج تھے خلیل الرحمان کو چپ بیٹھنا محال ہو گیا، انگشت اٹھا کر چنگھاڑ کر بولے تھے۔

"بس۔ بہت ہو گیا۔ آئندہ میری بیٹی کے لیے پیچھے جیسا لفظ استعمال کیا تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ میں بھیج رہا ہوں اسے، دیکھتا ہوں، مجھے کون روکتا ہے۔"

گھر میں ہوتی تیغ کلامی اور بھائیوں کی تند نگاہوں سے بھی نیہا دیوار کے ساتھ اس قدر چپکی تھی، جیسے دیوار پر چوڑ۔ خلیل نے نیہا کو دیکھ کر لہجہ بدلتے کہا تھا۔ "تم پیکنگ کر لو بیٹا، اگلے ہفتے سے کلاسز اسٹارٹ ہو رہی ہیں، میں نہیں چاہتا تم بھی بہنوں کی



طرح جاہل رہ جاؤ۔"

جیسے دیوار سے یک دم چوڑا جھڑ کر گرتا ہے ایسے چھپکلی ہو، نیہا سر ہاں میں ہلاتی تیزی سے نظروں سے اوجھل ہوئی دوسرے کمرے کی جانب لپکی تھی اور پیچھے سے تیز چھوٹی بھابھی کی نگاہیں اس کی پشت پر کسی خنجر کی طرح گڑ سی ساتھ گئی تھیں۔

☆☆☆

کچھ سامان ابا نے نیہا کو لا دیا تھا اور کچھ گھر سے نیہا نے سمجھ کے مطابق نکال کر پیک کر لیا، اس کے جانے سے پہلے ہی بڑی بھابھی اپنے میکے اچانک سے چلی گئی تھیں ان کی اماں کا بلڈ پریشر بہت شوٹ کر گیا تھا، چھوٹی ویسے ہی سر درد کی مریضہ تھیں، دوا کھا کر سوئیں تو کئی گھنٹے آنکھ نہ کھلتی۔ بھائی دونوں ہی اپنے کاروبار پر، آج ذرا وقت سے پہلے چلے گئے تھے سو کوئی خدا حافظ کہنے گیٹ تک نہیں آیا تھا، ابا نے ڈرائیور سے گاڑی تیار کروائی اور خود لے کر روانہ ہوئے۔

لاہور میں صرف زبیر صدیقی سے ہی ایسی واقفیت تھی کہ ان کے گھر بہت دھڑلے سے آ جا سکتے تھے لیکن بیٹی کو لے کر وہ پہلے بھی کہیں نہیں گئے تھے، سو آج بھی نہ گئے البتہ وہ اور ان کی بیگم فریدہ پہلے سے ہوسٹل پہنچ چکی تھیں۔ بیگم نے اندر جا کر سامان سیٹ کروایا، لڑکیوں سے ملیں، انہیں بھولی سی نیہا بہت اچھی لگی تھی۔ سب لڑکیوں سے مختلف، کم گو، مگر حد پست نہیں۔ پھر اس کے متعلق قصہ میاں سنا چکے تھے تو ہمدردی اور بھی ہو گئی، بہت محبت سے کہا تھا۔

"بیٹا بے فکر ہو کر رہنا، میں اور تمہارے انکل آتے جاتے رہیں گے اور تمہارا بھی جب جی چاہے مجھے کال کرنا، میں خود تمہیں لینے آ جاؤں گی۔"

یہی بات خلیل نے بھی اسے سمجھائی تھی، اپنا گھر بھلے دور تھا لیکن زبیر کا گھر شہر میں ہے، اگر اچانک کوئی مسئلہ ہو جائے تو فوراً انہیں بلا لیا جائے اور ان کے گھر جانے میں بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا، گھر میں ملازموں کے علاوہ دو میاں بیوی ہی تو تھے، بیٹی اسلام آباد میں پڑھ رہی تھی، بیٹا آرمی میں کیپٹن تھا اور آج کل کراچی میں پوسٹڈ تھا سو اس طرف سے خلیل بے فکر ہی رہے۔

☆☆☆

ہوسٹل کی زندگی سب کے لیے ایک جیسی نہیں، کسی کی جیل تو کسی کی رہائی کا سبب ہوتی ہے، نیہا کی روم میٹ سارہ، سیمرا دیکھنے میں ایسی لگی تھیں جیسے سگی بہنیں ہوں۔ نیہا تو ان کی فرینکنس اور جملے بازی سن کر بہت دن تک یہی سمجھتی رہی کہ بہنیں نہ سہی لیکن آپس میں خاص رشتے دار ضرور ہوں گی، ورنہ کون کسی کے ساتھ اس طرح سے فری ہوتا ہے۔ لیکن جلد ہی پتا چل گیا، کہ رشتہ دار تو دور کی بات وہ کوئی پرانی زمانے کی بچھڑی سہیلیاں بھی نہیں ہیں، جو محبت، جو خلوص بھرا ہے وہ اسی ہوسٹل میں دو سالہ قیام کے سبب ہے۔

نیہا کے لیے یہ سب نیا ضرور تھا مگر ان دونوں کے ساتھ بے تکلف ہونے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا تھا، بلکہ برسوں سے دل میں چھپی اک بہن، اک ہم راز کی خواہش اس جوڑی نے ایسے پوری کی کہ اس کی ایک ایک چیز پر، بہنوں سے بھی زیادہ قبضہ کر لیا، لیکن جب بات ویک اینڈ پر گھر جانے کی آتی، تو وہ دونوں ایسے اداس ہوتیں، جیسے اس سے کوئی تعلق نہ ہو بس اپنے گھر والے اور گھر والوں کی صورتیں دیکھے برسوں گزر گئے ہوں۔ نیہا اکثر پوچھ لیتی تھی۔

"یار ایسا بھی وہاں کیا ہے جو تم ہر آٹھ دس دن بعد اٹھ کر چلی جاتی ہو۔"

"میرا بھائی ہے ناں، بڑا ایک نمبر کا چور ہے۔ میری غیر موجودگی میں میری ایک ایک چیز چھانتا ہے، پچھلی بار ہینڈز فری غلطی سے گھر رہ گئے، اپنے خرگوش جیسے کانوں میں اڑس اڑس کر توڑ دیے۔"

سارہ نے فوراً سے پرانی یاد تازہ کی۔ "اور وہ جو تم بتا رہی تھیں، تمہاری ایلم کے ساتھ کیا تھا۔"

"ہاں۔" یکی سے ہاں کسی غم کی غماز تھی۔ "یار

منڈک کی پارٹی کی ساری فائس پر کھینچنے نے میرے منہ پر مونچھیں بنا دیں اور ایک بار گلک میں سے پورے سو روپے غائب تھے اور پتا ہے ان پیسوں کا کیا کیا؟"

سمیرا کے دکھڑے کی لمبی داستان پر ان دونوں کو مجبوراً پوچھنا پڑا۔ "کیا کیا؟"

"باجرہ لا کر کمرے کی کونوں میں چیونٹیوں کو ڈالتا رہا کر آپا کے کمرے کے بے زبان جانور بھوکے بددعائیں دیں اور آپا فیل ہی نہ ہو جائیں۔ یقین مانو جب میں گھر گئی چیونٹیوں کی فوج نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا، اگر امی بروقت کوئی سی پاؤڈر نہ چھڑکتیں، تم ایک عظیم دوست سے ملنے سے رہ جاتے کوچ کر جاتیں۔ بس امی کی خبر گیری کے لیے جانا پڑتا ہے مجھے۔"

اس کی لمبی داستان پر نیہا نے لمبا سا سانس بھرتے الف کہا تھا۔

"اور میں تو صرف اور صرف یہ دیکھنے جاتی ہوں، میری غیر موجودگی میں امی ابو نے رشتے میں کتنی پیش رفت کی۔ یہ نہ ہو کہ ڈگری لے کر گھر پہنچوں اور استقبال کو دلہا پہلے سے بیٹھا ہو، پھر تو وہی قبول کرنا پڑے گا۔ اندھا کانا جیسا بھی ہو۔"

سارہ کی بے چارگی پر دونوں کو ہنسی آئی۔

"تمہیں رشتے کی کتنی فکر ہے۔"

"ابھی یہ بل صراط کو پار کرنے کے لیے یہاں خجل خوار ہو رہی ہوں، ورنہ مجھے کوئی شوق نہیں ہے، گردو جیسی وارڈن دیکھ کر، میس کی سڑی تورئیاں کھانے کا۔"

نیہا بھی جانتی تھی اور وہ دونوں یہ سب خوش ہونے کی فرضی باتیں ہیں ورنہ حقیقتاً ان کے گھر والے بھی ان کی یاد میں اتنے ہی بے چین ہوتے ہیں جتنا کہ وہ خود۔ اگر بھی جانے میں آٹھ دس دن سے زیادہ لگ جائیں تو مائیں خود ملنے آ جاتیں اور دن میں دو دو بار تو لازمی فون کر کے پوچھتی تھیں۔

"کھانا کھا لیا؟ آج میس میں کیا پکا تھا؟"

سمیرا اور سارہ دونوں ناشکری اس قدر تجسس ذرا سے کہہ دیتیں۔

"تی ہرے دھنیے کی بریانی پکا رکھی تھی وہ بھی نمرتریوں کے روسٹ کے ساتھ۔ کل سارے شہر سے گندے انڈے اکٹھے کرتے پھرتے ہیں تا کہ صبح ان کا آملیٹ بنا کر ہمیں پیش کریں۔ فاقوں کے ساتھ زندگی گزر رہی ہے ہماری۔ مر جائیں تاں تو پوسٹ مارٹم ضرور کروانا، پتا چلے معدے میں بھنڈیوں کے ساتھ کتنی سنڈیاں ہمارے پیٹ میں گئیں۔"

ماؤں کا دل کچھ جاتا۔ بہترین کھانا بنا کر کسی آنے جانے کے ہاتھ بیٹیوں کے پاس بھجوائے جاتے، پھر بہن بھائیوں کے لاڈ بھرے قصے صبح شام، نیہا خاموشی سے سنتی آنکھیں دکھتی اور غیر محسوس طریقے سے اپنے دل کو قابو رکھتی تھی، کر بھی کیا سکتی تھی۔ اماں کو فوت ہوئے چار سال سے زیادہ بیت چکے تھے۔ گھر پر بھابھیوں کی راج دہانی تھی۔ بھائی بھابھیوں کے زیر اثر، ابا کے علاوہ بھی کسی نے آ کر دیکھنا تو کیا کال تک نہیں کی۔ دو سال ہونے کو آ گئے تھے، دو چار چھٹیاں آئیں ابا بدمزگی سے بچنے کے لیے خود ہی آنے سے منع کر دیتے۔

"بیٹا یہاں آ کر کیا کرو گی؟ وہاں دل لگا کر پڑھو، میں ملنے آ جاؤں گا یا لمبی چھٹیوں میں آنا۔"

لمبی چھٹیوں میں جاتی تو لمبی ٹینشن لے کر آتی تھی۔ دونوں بھابھیوں کے منہ بنے ہوتے، بھائی لاتعلق۔ نیہا کے دل پر ہاتھ سا پڑتا تھا۔ ایسا بھی کیا جرم تھا اس کا صرف یہ کہ گھر سے باہر پڑھ رہی تھی وہ بھی اپنی خواہش پر نہیں ابا کی مرضی یا حکمت کے لیے۔ ابا بھی کیا کرتے بیٹا جواز مسئلے کو بیٹوں نے گلے کا طوق بنا دیا تھا، ضد کی صرف نیہا کا رشتہ۔

☆☆☆

بڑی بھابھی اور جہاں چچا زاد تھیں اور ان کا کہنا یہ تھا خاندان کا حق پہلا ہوتا ہے اور پھر میرے بھائی



میں ایسا کون سا عیب ہے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے نیہا کا رشتہ مانگا تھا۔ بھائی تو خاصا معقول تھا خلیل الرحمان جتنی پراپرٹی تو نہیں تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ بالکل ہی خالی ہوں۔ زمینداری کے ساتھ آڑھت کا اچھا کاروبار چل رہا تھا لیکن ابا کے کسی اقرار و انکار سے پہلے ہی چھوٹے بھیا کمیل کو نیہا کے لیے اپنا سالا بہترین بر لگا تھا۔ وہ ایک نجی کمپنی میں ملازم تھا، اور تنخواہ بھی اچھی خاصی معقول تھی۔ گو کہ چھوٹی بھابھی خاندان سے نہیں تھیں۔ جب کمیل نے ابا کا رجحان چچا کی طرف دیکھا تو اسی بات کو ایشو بنا لیا۔

"میری بیوی کو آج تک خاندان میں حیثیت نہیں دی اسے اپنا مانا ہی نہیں گیا کبھی آپ ان سے مزید رشتہ داری بڑھانے کا خیال نہیں رکھتے۔"

خلیل الرحمان اچھی خاصی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ دونوں بیٹے مسلسل رشتے پر زور دے رہے تھے، صاف باپ سے کہہ دیے

"ہاں کہہ دوں پھر انہیں۔ کیا خیال ہے، آپ کا؟"

اب وہ اپنا کیا خیال بتاتے۔ ایسی بات نہیں تھی کہ خلیل الرحمان سب بانٹ کر اپنے ہاتھ پاؤں بالکل ہی کٹوا بیٹھے تھے، ساری پراپرٹی ابھی کے نام تھی۔ بس کمیل اب بیٹے دکھڑے تھے لیکن انہی کا چلایا تھا۔ جب بیٹوں کے قد باپ کے سر سے اونچے ہو جائیں اور ان سے بات کرتے کو باپ کو اوپر دیکھنا پڑے تو آواز خود بخود دب جاتی ہے۔ یہی حال ان کا ہوا تھا، بیوی کو فوت ہوئے چار سال بیت گئے تھے جہاں عورت بیوہ ہونے سے اپاہج ہو جاتی ہے اسی طرح بڑھاپے کی زندگی میں قدم رکھتا مرد بھی رنڈوا ہو کر اپاہج اور لاچار ہو جاتا ہے۔ بڑے دونوں راحیل اور کمیل کے بعد بھی تین بچے ہوئے تھے جو سال تک کی عمر کو آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نیہا بھائیوں سے اچھا خاصا عمر کا فرق لے پیدا ہوئی تھی، بڑھاپے کی اولاد تھی، ماں باپ نے بہت ہی ناز و نعم سے پالی۔ اللہ کی دین سے بیچ کھلا تھا، ہر فصل اٹھانے پر خلیل الرحمان بیٹی کے لیے کچھ نہ کچھ سونے کا بنوا دیتے اس کے جوان ہونے تک۔ اتنا زیور بن چکا تھا جتنا زمیندار عموماً شادی کے وقت بھی بیٹی کو نہیں دیتے، پھر خاندان میں جو کچھ ہوتا آیا تھا وہ بھابھیوں سے چھپا نہیں تھا۔

☆☆☆

خلیل الرحمان اور ان کے بھائیوں نے باپ کی وراثت میں بہنوں کا قانون و شرع کے مطابق پورا حق ادا کیا تھا۔ کمیل طلب پر الگ روپیہ پیسہ بہا دیا جاتا۔ ایسے میں نیہا تو اکلوتی تھی، صرف رنگت ہی کچھ سانولی تھی نین نقش بہترین تھے۔ عادات کی شرمیلی، ادب لحاظ والی اور سب سے بڑھ کر دیوانگی، بھابھی کس کو کاٹے۔ رشتہ مانگنے کی اصل وجہ تو یہی خوبیاں تھیں لیکن جب دونوں بھابھیاں مقابل آ گئیں تو بات کو عزت بے عزتی کا مسئلہ بنا لیا۔ خلیل الرحمان کو بیٹوں میں ہونے والی چپقلش سے ڈر لگنے لگا تھا اور عمل میں بھی لگا تھا وہ دونوں کو واضح طور پر انکار کر دیں اور کہیں اور رشتہ تلاش کریں۔

☆☆☆

ونے کے نام پر خوف کا انکار تو دونوں بیٹوں نے چپ کر کے سن لیا تھا لیکن پھر وہ دونوں اپنی اپنی عقل میں اکٹھے ہو گئے، عجب مشکل میں جان پھنس گئی تھی، کوئی رشتے دیکھنے آتا دونوں بیٹوں میں سے کسی کی ناک پر نہ بیٹھتا، کسی کے کاروبار میں نقص، کسی کی شکل و صورت میں، کسی کی عمر بڑی تو کسی کا خاندان اور نہیں تو اخلاق میں ایسی ایسی برائی دکھائی دیتی خلیل الرحمان بیچ ڈر جاتے، مثالیں وہ لاتے کہ روح کانپ جاتی۔ یہ سب تو چلتا رہا اور معاملے اللہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ جہاں اللہ نے جوڑی بنا رکھی ہے انکار کے باوجود نصیب کھینچ کر لے جاتا ہے۔

لیکن ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں بھابھیوں نے نیہا کے ایک ایک کام پر نظر رکھی تھی، کہاں گئی کس سے ملی، کتنی دیر کی، پھر رعب ڈالنے

تھیں اس سے نہیں ملنا، وہاں نہیں آنا، وہ گھر سے آ گئیں۔ گھر بچی کے لیے قید خانہ بن گیا۔ نیہا باپ کے آگے رو دینے والی ہو جاتی۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ نیہا کی کالج فرینڈ کی سالگرہ تھی ابا سے اجازت مانگی انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا، خوب تیار ہوئی اور ابا خود جا کر چھوڑ کر آئے۔ وہ بمشکل چار پانچ گھنٹے وہاں رہی ہوگی، ان چار پانچ گھنٹوں میں بھابھی نور جہاں نے اپنی ساری توانائیاں لگا دی، کوئی ایشو ہاتھ آ جائے۔ جب انسان کسی کام کے لیے ادھار ہو جائے تو سب بن ہی جاتے ہیں، وہ جب گھر پہنچی بڑے بھیا ابا کے کمرے میں بیٹھے تھے زور سے آواز دے کر اسے پکارا۔

"نیہا یہاں آؤ۔" اس قسم کی پیشی بہت کم لگتی تھی لیکن جب بھی لگی اسے پورا یقین ہوتا کہ آج پھر اس کی زندگی کے غلط باب کھول کر رکھے گئے ہیں۔ وہ اپنی صفائی کی دلیلیں سوچتی آہستہ سے ان کی جانب بڑھی۔ ابا خاموش اپنی مسہری پر بیٹھے تھے۔ بھابھی نور جہاں کسی ملکہ کی طرح میاں کے مقابل بیٹھی تھیں۔ چھوٹے بھائی کام کے سلسلے میں گھر نہیں تھے لیکن ان کی کمی پوری کرنے کے لیے چھوٹی بھابھی گلنار ہمہ تن گوش دروازے میں کھڑی رہیں، بڑے بھیا نے اپنے موبائل کی چمکتی اسکرین پر ایک تصویر دکھاتے اس کے سامنے کیا تھا۔

"کس کی ہے یہ؟"

نیہا نے پہلے موبائل کو دیکھا پھر بھائی کے چہرے کو کہ کوئی اجنبی بھی دیکھ کر بتا دے کہ میں کیا ہوں، اس کے دل میں آیا بھی کہ پوچھ لے۔

"بھائی کیا اب اتنی دوری آ گئی کہ آپ مجھے پہچان بھی نہیں پاتے یا موتیا کے سبب بڑھاپے کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔"

لیکن وہ چپ رہی اسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے تصویر دکھانے کا آخر مقصد کیا ہے، وہ مقصد بھابھی نے واضح کر دیا۔

"تم شکیل کا کیک کاٹنے گئی تھیں یا ماڈلنگ کرنے، وہیں موبائلوں سے ہو کر تمہارے یہ ایکشن تمہارے بھائی تک پہنچے ہیں۔"

تصویریں تو حقیقتاً اسی کی تھیں اور اسے بہت اچھی طرح یاد تھیں یہ شکیل کے ساتھ مل کر حرکے مارے پاؤٹ اس نے والی بنائے تھے، لیکن اپنے موبائل میں یا شکیل کنزا کے موبائل میں، اب یہ بھیا تک اتنی جلدی کیسے پہنچی بات تشویش کی تھی۔ اوپر سے بھابھی کا جملہ، ہیں موبائلوں سے ہو کر اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ نفی میں سر کو جنبش دینے کی ناکام کوشش میں لگا ابا پر اٹھائی وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے، ڈرتے ڈرتے اس نے ہونٹ کاٹ لیے، ابا خاموشی سے اٹھے اور باہر نکل گئے، نیہا کا ننھا سا دل مٹھی میں سمٹ گیا، آنکھیں پانی کی جھلملاہٹ سے دھندلا سی گئیں، کانوں میں البتہ بھابھی کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

"جب تک کوئی گل کھلا نہیں دے گی، اس کا رشتہ نہیں ہونے لگا، پھر ابا میاں سر پکڑ کر رو دیں گے اور تم بھائی منہ چھپاتے پھرو گے، ان شاء اللہ۔"

ان شاء اللہ کا لفظ ایسی باتوں کے ساتھ لگا کر وہ ویسے ہی باعث ثواب سمجھتی تھیں۔ نیہا نے فوراً دل میں "اللہ نہ کرے" کہا ابا پر آنچ آنے سے اپنی جان لحہ ضائع کے بجائے دے۔

☆☆☆

وہ رات نیہا پر ہی نہیں خلیل الرحمان پر بھی اتنی ہی بھاری تھی لگتا تھا سینے پر کوئی سل رکھی ہے، جس پر باقاعدہ زور زور سے ہتھوڑے برس رہے ہیں۔ خلیل معمول سے ذرا پہلے ہی سوتے بن گئے، نیہا کی جان پر بن گئی، تصویر بھائی تک کیسے پہنچی اس کا عقدہ بھی دو دن بعد کھل گیا تھا جب نیہا نے اپنی سہیلی سے پوچھا تو وہ عام سے انداز میں بولی۔

"ہاں میں نے بھیجی تھیں، نور جہاں بھابھی نے میری فراک کا ڈیزائن دیکھنا تھا نا، اپنی بہن کے لیے، پھر انہوں نے ساری پکس مانگیں میں نے ساری اسے دے دیں۔"



بات تو اچھائی بھونڈی اور بے ہودہ تھی، جس کو پکڑنا بھی مشکل نہیں تھا لیکن بات پکڑی جانے کا ڈر اسے ہو جتنے چاہو کر شامت آئے گی۔ بھابھی کے زرخیز دماغ میں ہزار تاویلیں اور آ جاتی تھیں، اس لیے نیہا نے تو اس بات پر توجہ ہی نہ دی، فی الوقت اسے دنیا میں اپنی مخلص ترین ہستی کی فکر ستا رہی تھی جو اسے ناراض محسوس ہوئے، یعنی کہ ابا۔

وہ رات کے پچھلے پہر خاموشی سے ان کے کمرے میں داخل ہوئی اور پاؤں پر ہاتھ رکھے کچھ دیر تھی، ابا کرنٹ کھا کر اٹھے، اور اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"نیہا۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو بیٹے؟"

"ابا تصویریں تو واقعی میں نے بنوائی تھیں لیکن اس موبائلوں والی بات مجھے نہیں پتا۔ سوری مجھ سے ناراض تو مت ہوں۔"

خلیل الرحمان اس کا چہرہ دیکھتے رہے اور پھیکے سے لہجے میں بولے۔

"میں زمیندار ہوں بیٹا، جس نے کبھی اپنی فصل کو کیڑا نہیں لگنے دیا وہ بیٹی کو لگنے دے گا۔ بس دکھ تو اس چیز کا ہے میرے بیٹے پتا نہیں کس پر چلے گئے، میں تم سے ناراض نہیں پریشان ہوں۔ اتنی گھٹیا اور چھوٹی حرکت کو ایسے طوفان کی طرح پیش کیا گیا، اگر میری عقل دھوکا دے جائے میرے بیٹے تو تمہیں کاری کر کے مار دیں۔" نیہا تڑپ کر ابا کی باہوں سے لپٹی۔

"ابا ایسے نہیں ہیں میرے بھائی۔" مگر ان کے گھٹنوں پر رکھا آنسو چپکے سے نکل آئے ابا نے اس کے بالوں پر بوسہ لیتے آہستہ سے کہا تھا۔

"ہاں نہیں تو کہیں، کہیں ہو نہ جائیں۔"

☆☆☆

یہی قصہ جب آپی کے گوش گزار ہوا تو انہوں نے نیہا کو کچھ عرصہ کے لیے گھر سے دور رکھنے کا مقصد پایا تھا۔

"ڈھیروں قصہ میں آتی ہوتی ہیں اور کوئی اچھ

نہیں، کچھ عرصہ بچی گھر سے دور رہے گی، دلوں میں محبت ہے یہی احساس خود بخود جگہ بنائے گا۔"

اسی احساس کو جگانے کے لیے اسے دور ہوئے دو سال کا عرصہ بیت گیا، ہر پرانی یاد نئے زخم کی طرح تازہ تھی اور نیہا کو زخم کی ٹیس تب زیادہ محسوس ہوتی جب سب لڑکیاں اپنے بھائی بہنوں کا ذکر کرتیں خوش ہو کر گھروں کو جاتیں۔ بھابھیوں کے قصے سناتیں، اماں ابا کی بے جا لڑائیوں کے مزے اور پھر اداس ہی واپس آتیں۔ اب جب ہڑتالوں کی وجہ سے بائے چانس تین چار چھٹیاں آ رہی تھیں، وہ ویک اینڈ کی ملا کر ہر لڑکی ہفتے بھر کے پروگرام سے گھر جا رہی تھی، ایسے میں نیہا سے ابا نے کہہ دیا۔

"بیٹا تمہیں آنے کی قطعاً ضرورت نہیں، ایک دو دن میں میرا لاہور چکر لگے گا، تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

نیہا کا شدت سے گھر جانے کو دل چاہ رہا تھا، مگر اپنا سا منہ لے کر چپ ہو گئی اور اس کی چیزیں فوراً سمیرا سارہ نے بانٹ لیں۔ گاؤں تو جل چکا تھا، اپنا گاؤں بہت اچھا ہے چھڑنے کے بعد مزید تعفن زدہ ہو گیا سمیرا نے اعلان کیا تھا۔

"اگر بس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تو اسے ڈرائیور کی غفلت سمجھ کر حادثہ سمجھا جائے بلکہ سارہ کی جانب سے ہونے والی دہشت گردی قرار دیا جائے وہ بھی بدلہ والا۔"

سارہ سمیرا ایک دوسرے کو باتیں سناتیں، کھیلیاں مارتیں باہر نکل گئی تھیں، پیچھے نیہا اکیلی اور اداس بیٹھی تھی، جب ہی فریدہ آنٹی کا فون آ گیا، فون وہ اکثر کرتی رہتی تھیں، چکر بھی لگاتیں لیکن آج کل ان کے چکر کچھ زیادہ ہی لگ رہے تھے اور اس دن تو انہوں نے بطور خاص کہا تھا۔

"نیہا بیٹا تیار رہنا، میں اور تمہارے انکل تمہیں لینے آ رہے ہیں، ہمیں شاپنگ پر جانا ہے۔"

نیہا کو یہ کال خاصی عجیب سی لگی تھی، یہاں رہتے ہوئے اسے دو سال ہو گئے تھے، اپنے گھر تو وہ

صرف گرمیوں، سردیوں کی چھٹیوں میں ہی گئی تھی۔ ابا آتے رہتے، وہی باز ار بھی لے جاتے، وہیں کی دو چار چھٹیاں اس نے ہوسٹل میں ہی گزاری تھیں۔ صرف ایک بار وہ بھی ابا تین چار دن کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے تو زبیر انکل فریدہ آنٹی اسے بھی لے گئے، اب یہ شاپنگ۔ اسے اچنبھا ہوا۔

"آنٹی شاپنگ ـــــ مگر کیسی شاپنگ، مجھے تو کچھ نہیں چاہیے۔"

"اچھا...." فریدہ آنٹی ذو معنی سا ہنسیں۔ "چلو تمہیں نہیں چاہیے، لیکن میرا تو دل کر رہا ہے ناں تمہارے لیے کچھ لینے کو۔"

بھلا میرے لیے وہ بھی یوں اچانک اسے کچھ واضح نہیں ہوا آنٹی نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون بند کر دیا۔ نیہا نے مزید الجھنے کے بجائے ابا کو کال ملائی اور فریدہ آنٹی کا ارادہ بتایا، ابا بھی کچھ ویسے ہی تھے اور بعد میں صرف اتنا کہا۔

"کوئی بات نہیں چلی جاؤ، مجھے انہوں نے بتا دیا ہے۔"

☆☆☆

آج تو ابا اسے بہت الا دن لگے، یوں کسی غیر کے ساتھ شاپنگ، ابا کے مزاج پر مزید غور کرنے کے بجائے اس نے اپنے گاؤن پر دھیان دیا جو کیسا اچھا کر چلتی بنی تھی۔ بنا گاؤن کے بھی وہ مارکیٹ گئی تھیں۔ اس نے مزید پریشان ہونے کے بجائے آنٹی کو فون کر دیا، انکار کی واضح وجہ موجود تھی۔ لیکن فون آنٹی کے بجائے ان کے بیٹے ارقم نے پک کیا۔

"السلام علیکم، میں نیہا بات کر رہی ہوں، فریدہ آنٹی سے بات کروا دیں۔"

اس نام کا ذکر غیر تو وہ کئی دنوں سے مسلسل سن رہا تھا تو پہچاننے میں وقت نہیں ہوئی لیکن ماں گھر پر نہیں تھیں۔ مزاج اچھا تھا اسے چاہیے تھا بات سے بات نکالتا مگر روکھے پھیکے انداز میں صاف کہہ دیا۔

"امی اس وقت گھر پر نہیں، کوئی میسج ہے تو دے دیں۔"

"نہایت ہی بدتمیز انسان تھا، حال نہیں پوچھا مت پوچھو، بندہ سلام کا جواب ہی دے دے۔" یہ نیہا نے دل میں سوچا۔ پھر پیغام چھوڑ دیا۔

"وہ آئیں تو بتا دیجیے گا میرا گاؤن جل گیا ہے تو سوری میں اس کے بنا مارکیٹ نہیں جا سکتی۔"

"آپ گاؤن پہنتی ہیں۔" ایسے پوچھا جیسے حیرانی کی انتہا ہو۔

نیہا کے منہ سے یک دم نکل گیا۔ "کیا آپ کو بھی چاہیے۔" بے ساختگی میں کہے لفظ پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور جلدی سے فون بند کر دیا، البتہ ارقم نے ناگواری سے فون کو دیکھا اور پھر کریڈل پر پٹخ دیا۔

☆☆☆

لاہور کا موسم خاصا چبھتا گرم محسوس ہو رہا تھا، گرمی رحیم یار خان میں بھی کم نہیں تھی لیکن فضا لاہور کی جیسی گرد آلود نہ ہونے کے سبب آرام سے باہر نکلا جا سکتا تھا۔

اسے نہ جانے کا بہانہ اچھا ہی لگا۔ مگر فریدہ کو جیسے پیغام ملا زبیر کسی کام کو نکلے ہوئے تھے، انہوں نے ارقم کو ساتھ لیا اور مارکیٹ سے پہلے ایک گاؤن لیا اور پھر ہوسٹل کی جانب روانہ ہو گئیں۔ انکار کے باوجود ان کے آ جانے پر نیہا کچھ چونکی تھی مزید تب چونکی جب انکل زبیر کے بجائے ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوبرو نوجوان بیٹھا تھا ونڈو پر کہنی ٹکائے، نچلا ہونٹ چباتا مسلسل سامنے سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ نیہا اور فریدہ ہوسٹل گیٹ سے نکلیں اس نے ایک ترچھی نگاہ نیہا پر ڈالی۔ پاؤں تک سیاہ گاؤن، حجاب سے چہرہ پوری طرح ڈھکا ہوا، خشک تاثرات پر مزید تیوری چڑھ گئی۔

نیہا بھی اسے دیکھ کر چونکی دل چاہا ابھی کے ابھی ابا کو فون کر کے بتائے، وہ فون نکالنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ابا کا فون آ گیا انہوں نے خود ہی بتا دیا۔

"فریدہ بھابھی کے ساتھ ان کا بیٹا ارقم ہے،



پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، شام میں بات کرتا ہوں۔"

حیرت کی انتہا ہو گئی ابا نے ایسی کون سی تبدیلی کا کہا، ان لیا، آج تک اپنے علاوہ کسی کے ساتھ شاپنگ کرنے نہ دی کہ یک دم دوست کا بیٹا اسنا تو تھا زبیر انکل کا ایک بیٹا بھی ہے جو آرمی آفیسر ہے۔ نہ تو ملنے کا اتفاق ہوا تھا اور نہ ہی کبھی دیکھی بھی اور پھر اتنا خوب صورت، وجیہہ یہ تو مقام حیرت ہی تھا۔

نیہا کے دل میں آیا کہ سارہ کو بتائے کہ ایک خوبرو آرمی آفیسر میرے ڈرائیور کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اسے پورا یقین تھا سارہ فوراً اسے چشم تصور میں دیکھ لیتی۔

"پھر جلدی سے میرا رشتہ ڈال دے۔"

اس خیال سے ہی نیہا کی آنکھیں مسکرا اٹھیں، اور نگاہ وہ نیم رخ کی، وہ مجسم محترم نگاہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انکل کی تیہا سے پہلے اس نے رخ بدل لیا۔ پھر اس نے محسوس کیا تھا وہ شاپنگ کے دوران بھی ماں سے بات بے بات الجھ رہا ہے اور نیہا کو بھجتی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ ایسے ہی بلا وجہ اس کے بھی جیسے دل میں گمان گزرا۔ "کہیں یہ مجھے اسٹیپ کھڑا کر رہا، یا طالبان.... بھی تو رس کا بندہ ہے کیا پتا انٹیلی جنس کا ہو.... اور ان کی معلومات اتنی ہی ناقص ہونے لگی ہیں، وہ ذرا سے شک پر گولی چلا دیتے ہیں۔"

موت کے جان لیوا خیال نے شاپنگ سے دل اچاٹ کر دیا، جو خریدا فریدہ آنٹی نے اپنی مرضی سے ہی خریدا۔ ارقم اپنے ہاتھ باکس میں الٹتا نیہا چونکی ہو جاتی، اگر گن نکالی تو اسے بچنے کے لیے کس کی اوٹ میں ہونا ہے۔ اللہ اللہ کر کے شاپنگ مکمل ہوئی آنٹی کے گھر ان کی بیٹی ہادیہ اسلام آباد سے آ چکی تھی۔ بھائی کی نسبت اچھی خاصی معقول تھی، گفتگو کا انداز بھی اچھا تھا۔ اس سے فری ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا پہلی بار اسے زبیر انکل کے گھر آنا اچھا لگا تھا۔ ہادیہ بے تکلف ہونے کے ساتھ منہ پھٹ بھی تھی نیہا کے منہ پر ہی کہہ دیا۔

"یقین کریں جب امی نے آپ کے بارے میں بتایا تو ایک نہایت ڈری سہمی، کنواری لڑکی کا تاثر قائم ہوا تھا جو انگلش کے عام بول چال کے الفاظ پر ہی کنفیوز ہو جائے۔"

نیہا اسی پر امسکرائی۔ "کیوں بھئی ایسا کیوں لگا تمہیں، جب کہ ہم کبھی ملے بھی نہیں؟"

"آپ کا علاقہ رحیم یار خان، اور پھر اس کا بھی گاؤں، میرے ذہن میں تو ایسی ہی لڑکی بنی تھی۔"

"انسان کی شخصیت کو اس کی رہائش سے جانچنا نہیں چاہیے، کیونکہ بنیاد شخصیت پر اثر رکھتی ہے لیکن ضروری نہیں نمایاں چھاپ بھی رکھتی ہو۔"

عین تب ہی ارقم کسی کام سے تیز قدم اٹھاتا ہادیہ کے روم میں آیا تھا۔ نیہا کی بات سن کر چونکا ضرور، نیہا بھی اس کی یوں اچانک آمد سے بے خبر تھی فوراً سنبھل کر سیدھی ہوئی، دوپٹا درست کیا۔ ارقم بلا وجہ ایک تند نگاہ ڈال کر واپس مڑ گیا تب ہی اس نے ہادیہ سے پوچھا۔

"ایک بات بتاؤ، تمہارے بھائی کی آنکھیں پیدائشی خون خوار ہیں یا آرمی والوں نے یہ حال کر دیا۔"

ہادیہ زور سے ہنسی۔ "میرے بھائی بہت خوش مزاج اور بڑا مائنڈ ڈ ہیں، بس ذرا مرضی کے خلاف بات ہو تو کھا اظہار کر دیتے ہیں۔"

"تو کیا میرا یہاں آنا ان کی مرضی کے خلاف ہے۔"

ہادیہ بھی سمجھی کہ نیہا سب جانتی ہے تو وہ اپنے تئیں شروع ہو گئی۔

"نہیں آپ کا آنا تو ناگوار نہیں لگا، لیکن بھائی کے اپنے کچھ آئیڈیلز ہیں، ان پر اتنی آسانی سے کمپرومائز ذرا مشکل ہے۔"

"مثلاً" نیہا کے پوچھنے پر وہ مزید بولی۔

"ان کی سوچ ہے بندے کو دل، آنکھوں کا صاف ہونا چاہیے، یہ پردہ، گاؤن وغیرہ ذرا پسند

نہیں۔"
"ہونا بھی نہیں چاہیے یار۔" تیما پوری معصومیت سے بولی "ہمارے گاؤں میں اگر کوئی لڑکا شہر سے ہی منہ ڈھانپ کر نکلے تو لوگ ہنسنے لگتے ہیں، اس ڈھاڈو ای گندا کم کیا اے بتا کیں منہ چھپایا اے۔ گاؤں تو حد ہی ہے پھر"(اس نے کوئی زیادہ ہی گندا کام کیا اب ہی منہ چھپا رکھا ہے)
بادیہ کو اس کی زبان بہت سمجھ میں نہیں آئی تھی، سمجھ میں اسے بھی کچھ خاص نہیں آرہا تھا' جب سے آئی تھی، بادیہ یا آنٹی فریدہ چار باتوں میں دو باتیں اپنے بیٹے کی خوبی کی کرتیں وہ بھی ڈھکی چھپی، اگر وہ مزید رکتی تو یقیناً معاملے کی تہ میں جاتی۔ اسے مزید الجھنے سے بچانے کے لیے خلیل شام کو ہی آگئے۔ ان کے چہرے پر زبردستی کی لائی خوشی تھی اور آنکھوں میں اداسی، اگلی صبح ہی وہ اسے لے کر گھر روانہ ہوئے تھے، راستے میں جو انہوں نے انکشاف کیا وہ ان کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔
"یہ کیا کہہ رہے ہیں ابا؟"
"کیوں تمہیں انکار ہے؟"
وہ مسلسل باپ کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی جیسے یقین نہ آرہا ہو۔ ابا نے حد کر دی، اس کی زندگی کے فیصلے جھٹ پٹ کرتے ہی چلے جائیں گے، اور انکار کا تو ایسے حیران ہو کر پوچھ رہے تھے جیسے وہ پہلے بھی اقرار کر چکی ہے۔ وہ ڈرتے ہوئے بولی۔
"لیکن ابا میری پڑھائی۔"
"میری جان پڑھائی تو ایک فرار تھا، لیکن اب اس فرار میں بھی نجات نہیں رہی بیٹا! تمہارا باپ بوڑھا اور کمزور تو پہلے ہی تھا، لیکن اب میری طبیعت بہت خراب ہے میں نہیں چاہتا زندگی زبردستی کھینچتے ہوئے ہار جاؤں اور پھر میری بیٹی، اپنے ہی رشتوں کے آگے ہار جائے۔"
تیما نے بے بسی سے باپ کو دیکھا، آنکھوں میں خوف کا پانی سا جھلملا گیا۔ ہونٹ معمولی سی جنبش میں ہلے۔
"ابا۔۔۔" خلیل الرحمان نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا۔
"ڈاکٹرز نے مجھے جلد از جلد ہارٹ سرجری کا کہا ہے اور میں چاہتا ہوں اس سے پہلے تمہارے فرض سے فارغ ہو جاؤں اور پھر ارقم ماشاء اللہ بہت سمجھ دار، پڑھا لکھا ہے اور رسہ کشی کا معاملہ بھی نہیں۔"
خلیل الرحمان جانے کیا کیا بولتے رہے وہ صرف ان کے ہلتے ہونٹ دیکھے گئی، یہ تو پتا تھا ابا کو بہت عرصے سے دل کا مسئلہ ہے، بی پی اکثر بلندی کو چھو جاتا، ایک دو بار اچانک سانس بند ہونے پر ہاسپٹل بھی ایڈمٹ ہوئے تھے، لیکن دل کے والو اس حد تک بند ہو چکے ہیں کہ کام کرنا چھوڑ دیں گے اتنا اندازہ نہیں تھا۔ اس بھری دنیا میں ایک ابا ہی تو تھے جو خلوص سے نہ صرف محبت کرتے تھے بلکہ اس کا بھلا بھی چاہتے تھے۔ اس نے فرماں بردار بیٹی کی طرح سر جھکا دیا لیکن بادیہ کی باتیں کچھ دل میں چبھ رہی تھیں "اچھے آئیڈیلز، گاؤں، پردہ۔"
اس نے اماں سے بھی سنا تھا "بیوی پر وہی رنگ روپ چڑھتا ہے جو پیا من بھائے۔" اس کا ذہن اس رنگ و روپ کا متلاشی سا ہونے لگا۔
☆☆☆
خلیل الرحمان اس معاملے کو جتنا سیدھا اور آسان سمجھ رہے تھے اتنا تھا نہیں۔ بیٹی کا اکیلے رشتہ کر لیا وہ بھی خاندان برادری سے باہر یہ بات بھائیوں کے حلق سے اترنا آسان نہیں تھی جب کہ انہوں نے تو ہنگامی بنیادوں پر تاریخ بھی طے کر دی تھی، بھابھیوں کے دماغ بھی سوچ سکتے تھے۔
"ابھی دو سال سے گھر سے باہر تھی، ہمیں کیا پتا وہاں کیا ہوا، کون کون سے گل کھلائے جو یوں اچانک بیٹی بیاہنے کی پڑ گئی۔"
"ظاہر ہے، ہوسٹلوں میں تو پھر یہی کچھ ہونا تھا۔ چلو اللہ کرے بدنامی سے پہلے رخصت ہو جائے۔"



بیٹے والوں بھڑک اٹھے، دونوں نے واضح کہہ دیا۔
"جس طرح آپ دونوں نے خاموشی سے فیصلہ کر لیا، بعد میں اس کے نتائج بھی خاموشی سے برداشت کیجیے گا۔"
خلیل زور دے کر بولے۔ "دونوں میں صرف میں نے، میں نے فیصلہ کیا ہے۔"
"چلو آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں۔" راحیل تلملا کر بولے۔ "لیکن کل کو اس فیصلے پر پچھتایے گا نہیں، کہیں روتی دھوتی ہمارے پاس آئے، جب ہم رشتہ کرتے، ہمارے میں نہیں تو بعد کے اچھے برے کے آپ خود ذمہ دار ہیں۔"
"میں نے اللہ کے ذمہ لگایا ہے۔"
خلیل کے لہجے کی مضبوطی پر بھابھی نور جہاں استہزائیہ ہنسیں۔ "اللہ کان میں آکر اچھا برا نہیں بتاتا۔ فیصلوں کے لیے عقل دے رکھی ہے۔ کسی اور کا ہوا آج تک خاندان برادری سے باہر، جو آپ کو بیٹی پر ترس جتانے کی لگ گئی۔"
"میں نے فیصلہ عقل سے ہی کیا ہے، جسے قبول ہے وہ شامل ہو، جسے نہیں وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔"
فیصلہ کن انداز نے بات ہی ختم کر دی۔ وقت اتنا تھا ہی نہیں کہ مزید بحث میں برباد کیا جاتا۔ ایک ہفتہ تھا شادی کی تیاری، مہمانوں کا انتظام، بھلے دنیا دکھاوے کو لیکن بھائی استقبال بارات کے لیے باپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے تھے، نکاح نامے پر بھی گواہ بن گئے۔
☆☆☆
ارقم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا بہت سنجیدہ مزاج بندہ ہے بالکل خاموش بیٹھا رہا، بھابھیوں نے تو بالکل دوست قیاس لگایا تھا۔
"لڑکا راضی تو نہیں لگ رہا۔ اللہ جانے کون سی مجبوری کا پکڑا بڑے میاں نے۔"
بھابھیوں کی اپنی اپنی رائے تھی ارقم نہ جانے کا ہی اتنا
صدمہ تھا انہوں نے کسی بات پر توجہ ہی نہ دی۔ البتہ سمیرا اور سمارہ نے جب اسے دیکھا تو تیما کے کان میں سرگوشیاں کرنے کو بھاگیں۔
"یار۔۔۔ اصلی والا ہیرو ہے، بالکل پکے والا، جس کا مسکرانے سے بھی روزہ ٹوٹ جائے۔"
"اللہ جی۔۔۔ انکل جیسا دیدہ بینا میرے ابا کو بھی عطا فرما۔"
دوسری بات سمارہ نے کی تھی، یہاں تک کہ رخصتی ہوئی، اور تیما پاؤ کراچی شہر میں آ گئی جہاں سے پہلے بھی گئی تھی، اب فرق اتنا تھا وہ ہوسٹل میں نہیں بلکہ اپنے شوہر کے گھر میں تھی، دل تو جانے اس کے نصیب میں کوئی لکھا تھا یا نہیں البتہ قدموں کے نیچے زمین ضرور شوہر کے نام کی آ گئی تھی۔
☆☆☆
وہ دلہن بنی بیڈ پر بیٹھی تھی، نین نقوش تو پہلے ہی نمایاں تھے البتہ عروسی لباس اور میک اپ نے سانولی رنگت میں دلکشی سی پیدا کر دی تھی، سامنے والا متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا تھا لیکن مقابل ارقم کا دل نہیں خند تھی۔ ماں باپ نے اس کی رائے جاننا تو دور کنار، اپنی مرضی کا فیصلہ نہ صرف مسلط کیا تھا بلکہ جذباتی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ جب اسے فون کر کے یہ بتایا گیا۔
"ارقم ہم نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے، خلیل الرحمان کی بیٹی سے، اگلے ہفتے تمہاری شادی ہے۔"
"کیا شادی۔۔۔ اور کون خلیل الرحمان؟" ارقم کو اچنبھا ہوا تھا۔
"کیا مطلب ہے کون۔۔۔ میرا دوست، رحیم یار خان والا، جو ہر سال آموں کی پیٹیاں بھیجتا ہے۔"
"اُف۔۔۔" ارقم نے سر پکڑ لیا، کہاں وہ کہاں گاؤں کی دوشیزہ۔ ارقم نے اگلی بات فون پر پوچھنے کے بجائے گھر آکر ہنگامہ کیا تھا۔ اس کی پوری زندگی کا سامنا کسی ایسی ویسی لڑکی کے ساتھ اٹھا کر سیٹ کر دیا؟ ابھی زور زبردستی ہے۔ جب کہ وہ پہلے بتا چکا

تمہارے لیے لائف پارٹنر اپنی سوسائٹی کی لڑکی چاہیے، سو بلنیڈ کے ساتھ اب اس کا گزارہ مشکل ہے اور یہ تو سوسائٹیز میں بھی لیا کے بوسیدہ دوست کا ان کے رہائشی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

"ہم تمہارے ماں باپ ہیں، زمانے کی اونچ نیچ، اچھائی برائی پر تم سے زیادہ زیرک نگاہ ہے۔"

"بے وقوف تو میں بھی نہیں ہوں۔ میں نے زندگی میں پروفیشن بنا دیکھے، جا جانے نہیں چنا، آپ لائف پارٹنر کی بات کر رہے ہیں، جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں ——— اس کے بارے میں جانتا نہیں، کون ہے کیسی ہے، وہ چند دن میں میری زندگی کی مالک بن جائے گی۔۔ کمال کرتے ہیں آپ۔ مجھے یہ فیصلہ کسی طور قبول نہیں۔"

ارقم کا جی چاہا گھر کی ایک ایک چیز توڑ پھوڑ کر رکھ دے حالانکہ بہت تحمل مزاج کا بندہ تھا۔ کبھی جو باپ سے اونچی آواز میں بات کی ہو، یا ماں سے بلا وجہ فرمائشیں کی ہوں، خوش مزاج، ہاں میں ہاں ملانے والا، زبیر کو بھی اس پر کوئی تو مان تھا ہی جو اتنا بڑا فیصلہ خود سے نہ صرف کر لیا بلکہ پورے دل سے قائم بھی تھے۔ لیکن اب جو وہ اپنا چھپا روپ دکھا رہا تھا، زبیر احمد ان کے ساتھ خاصے پریشان بھی ہو رہے تھے بیمار دوست کو زبان دے چکے تھے، اس کی اخلاقی طور پر ہمت بڑھاتے رہے، چیا ہے کہ غصے سے اکھڑ رہا تھا، وہ اسے دیکھتے ہوئے صوفے سے اٹھے اور مقابل کھڑے ہو گئے۔

"اگر مسئلہ صرف دیکھنے اور جاننے تک کا ہے تو ٹھیک ہے، آج اسے شاپنگ پر لے جانا ہے، اپنی ماں کے ساتھ تم چلے جاؤ، اچھی طرح دیکھ لو، پرکھ لو اور اگر معاملہ کسی اور لڑکی کا ہے تو ابھی کے ابھی بتا دو۔"

ارقم کے دانت غصے میں آپس میں پیوست ہو گئے، سامنے صوفے پر پریشانی میں اپنے ہونٹ چباتی ماں کو التجائیہ دیکھا مگر آواز کہیں حلق میں اٹک گئی تھی۔

"امی۔۔۔!"

"ماں سے کیا کہہ رہے ہو، جو کہنا ہے مجھ سے کہو۔"

"ابو چند گھنٹے کی شاپنگ میں کیا دیکھوں اسے، جبکہ فیصلے کا کوئی آپشن بھی نہ چھوڑا ہو۔"

ارقم کے معصومانہ بلبلانے پر زبیر گھور کر بولے۔ "تو کیا تمہارے سامنے اسے ساری زندگی کے لیے بٹھا دیا جائے، دیکھو، پرکھو، برتو، پھر فیصلہ کرو۔ چاہتے کیا ہو تم آخر؟" ان کے بڑھتے غصے اور لال ہوتے رنگ پر فریدہ اٹھیں اور نرمی سے میاں کو کہا۔

"زبیر آپ غصہ مت کریں میں سمجھا لوں گی اسے۔۔۔"

"کیوں میں نہیں سمجھا سکتا، باپ ہوں اس کا۔ ٹھیک ہے اگر یہ اپنی زندگی کا اتنا ہی خود مختار ہے تو، کرے خود اپنے فیصلے۔" انہوں نے انگشت اٹھا کر ارقم کو وارننگ دی۔ "لیکن پھر یاد رکھنا اس فیصلے میں تمہارے باپ کی خوشی بھی شامل نہیں ہو گی۔"

زبیر کہہ کر چلے گئے ارقم کا زور صرف چیز ون پر اختیار ہا تھا اٹھا کر ہر چیز زمین پر پٹخ گئی۔ سونے پر سہاگا جب ماں کے ساتھ شاپنگ پر جاتے سب سے پہلے اس کے لیے گاؤن خریدا تو ماں کو دیکھ کر کچکچایا۔

"یہ غلاف بھی پہنتی ہے وہ؟"

"فیشن ہے آج کل اور اچھا نہیں ہے کہ تمہیں ایک شریف لڑکی مل رہی ہے۔"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں ان ہی شرافتوں کو۔"

وہ اندر تک کڑوا ہو گیا تھا پھر اس کا شاپنگ کے دوران فریدہ کے ساتھ چپکے رہنا، اب ارقم کو کون بتاتا وہ اس کی مشکوک نگاہوں سے کہی اور گئی ہے۔

☆☆☆

نیہا باقاعدہ طور پر اس کی بیوی کا حق لے کر اس کے بیڈ پر براجمان تھی، اس کا شدت سے جی چاہا اسے بیڈ سمیت اٹھا کر ابو کی کھڑکی کے سامنے پٹخ دے۔ لیکن وہ لہجے کو قابو کر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔



"یہ شادی صرف میرے ماں باپ کی خواہش پر ہوئی ہے، اس میں میری خوشی تو کیا مرضی بھی شامل نہیں۔"

نو بیاہتا دلہن کو کبھی بھی اپنے کیلئے جملے کی توقع نہیں ہوتی۔ نیہا نے چونک کر نگاہیں اٹھائی تھیں۔ اگر تو یہ کوئی فلم یا ڈرامہ ہوتا تو یقیناً اتنی زور کا بادل کڑکتا، بجلی کڑکتی کہ ہر چیز اس کے جھٹکے سے سیاہ راکھ میں بدل جاتی، نہیں تو پھر دکھ، غم کی بارش میں بھیگی روتی ہچکیاں تمام منظر کو سرمئی کر دیتی۔ جہاں اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا لیکن وہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

نیہا کے ہونٹ آپس میں جڑے تھے، خاموش شکوہ کناں نگاہیں، ارقم کے بے تاثر چہرے پر تھیں، اتنا تو اسے یقین تھا زندگی میں اسے کوئی رشتہ سہل اور آسانی سے نہیں ملا تھا۔ جب پیدا ہوئی اماں ابا، بڑھاپے کی منزل کی جانب تیزی سے چڑھ رہے تھے۔ اگرچہ اپنی جان نچھاور کرتے ہر طرح کے لاڈ اٹھاتے لیکن اتنے جتنے ایک بوڑھے ماں باپ اٹھا سکتے ہیں۔ جلد ہی بے چارے اکھڑتی سانسوں سے بے حال ہو جاتے، بھائی اتنے بڑے تھے ان کے ساتھ کھیلنا تو دور کنار ان کے رعب میں ہی دبی رہی، لیکن قسمت میں نہیں تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا شوہر اسے پہلی رات ہی سہل اور آسانی سے مل جاتا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا بس ایک نگاہ ارقم کو دیکھ کر اپنے لپ اسٹک زدہ ہونٹوں پر زبان پھیری اور نگاہوں کا رخ بدل لیا، اور اس کے کان ان جملوں کی مزید تشریح سننے کے لیے مکمل تیار ہو گئے تھے۔

اس کی ایک ہی خاموش نگاہ ارقم کے دل میں کسی تیر کی طرح اتری ضرور تھی، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا نیہا دلہن بن کر اس قدر معصوم اور خوب صورت لگے گی۔ اپنے کہے الفاظ پر اچھی خاصی شرمساری بھی ہوئی۔ لمبا چوڑا قد، وہ گندمی رنگ کا بندہ اور نئی نویلی دلہن پر گرج رہا ہو۔ بات تو خاصی معیوب اسے بھی لگی لیکن فوراً مرد کے ساتھ ایک مرد بھی تھا جس کی رائے کو وہ بڑا اہم نہ سمجھا گیا۔

مرد اگر اپنی مردانگی کا جلوہ نہ دکھائے تو وہ خود کو خود تسلیم نہیں کرتا۔ کسی نے کیا کرنا، اس کا دل تھا نیہا اس کے جملوں کا رسپانس دے جواباً کچھ کاٹ دار بولے یا جلوہ دکھاتے ہوئے تسلیم ہی کر لے۔

"گر حضور آپ کی زندگی میں شامل ہو گئی ہوں تو قبول کر لیجیے۔" لیکن وہ کچھ بھی نہیں بولی، اسے لگا شاید یہ فیصلہ اس کے اوپر بھی ٹھونسا گیا ہے، اب کے اس کا لہجہ کچھ بدلا تھا۔

"آپ سے آپ کی مرضی پوچھی گئی تھی؟"

جواب تو نیہا کے دل میں بہت سے آئے تھے تلخ بھی اور مزاحیہ بھی کہ لگا کر دے سارا دل ہلکا ہو جائے لیکن وہ عام سے لہجے میں کہنے لگی۔

"اگر پوچھی بھی جاتی، تو میری مرضی میرے بوڑھے ہوتے ماں باپ کی مرضی میں ہی شامل ہوتی، اس لیے مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔"

ارقم کی تنی بھنویں یک دم ڈھیلی ہوئیں، اپنا آپ بہت ہی چھوٹا لگا، لیکن وہ کیا کہتے ہیں مرد ہوتا بھی ہو پھر بھی ہوتا تو مرد ہی ہے، وہ شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے بولتا ہوا سامنے سے ہٹتا جا رہا تھا۔

"ہاں کچھ لڑکیوں کو فرماں برداری کا بہت شوق ہوتا ہے۔ خیر کم فرماں برداری کا ثبوت تو میں نے بھی نہیں دیا، نکاح تو ابو کی مرضی سے کر ہی لیا لیکن آگے کی توقع مجھ سے مت رکھیے گا۔"

اس نے شیروانی سے ایک مخملی ڈبیا نکال کر بیڈ پر ہی نیہا کے قریب بے رخی سے رکھی اور شیروانی صوفے پر اچھال کر بیڈ پر سونے کے انداز میں لیٹ گیا، پاؤں پر پاؤں مار کر کشن اٹھا اور اچھالے تھے ایک ایک کونے میں جا گئے۔

نیہا کی نگاہیں ڈبیا پر ہی تھیں، آنکھوں سے آنسو چھلکانے سے پہلے اس نے منہ کھول کر خاموشی سے گہرا سانس لے لیا اور ڈبیا اٹھائی کھولی اندر نگینہ جڑے ایک نگ کی انگوٹھی تھی، نیہا نے انگوٹھی نکالی اور اپنی انگلی میں پہنی، بس آن سے دیکھتے رخسار اپنا

مذاق خود اڑانے کے انداز میں چھلکے۔

"شکریہ....." ارقم نے آنکھوں سے کہنی ہٹا کر اسے دیکھا۔ نیہا استہزائیہ ہنسی سجائے انگوٹھی کو بغور دیکھ رہی تھی۔ "باتوں کے الفاظ ضائع کرنے کے بجائے آپ نے تحفے کے رنگ سے اپنے دل میں میری حیثیت واضح کردی۔ بہت اچھا لگا آپ کا یہ سب پہلے دن بتا دینا۔"

آخری جملہ ادا ہوتے اس کی آواز خود بہ خود بھاری ہوگئی تھی، قریب تھا اس کے آنسو چھلک جاتے لیکن ایک کمزور مرد کے سامنے رونے، بین کرنے سے کہیں بہتر تھا وہ اپنی آنکھوں کو آگ لگا دے۔ اس نے اپنے تاثر حیران ہوتے ارقم سے کمال طریقے سے چھپائے اور اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ اس کی بات ارقم کے اوپر سے گزر گئی تھی، اس نے تو انگوٹھی کھول کر بھی نہ دیکھی تھی کیسی ہے کیسی نہیں۔ اسی نے وہی جیب میں ڈال لی، اور اگر دیکھ بھی لیتا تو فورس کا شنگ، اوپر سے جلا کٹا بندہ کیا کہتا۔ "نیلا نیلم، نیلا تھوتھا" وہ نخوت سے اسے دیکھتا کروٹ بدل سو گیا۔

☆☆☆

سمیرا، سارہ وہ چار اور ہوسٹل کی سہیلیاں لے کر اس کے ولیمے میں خوب تیار ہو کر آئیں۔ سارہ کی جب جب ارقم پر نگاہ جاتی نیہا کے کان میں کہہ دیتی۔

"یار اس کا کوئی بھائی وائی نہیں ہے، ذرا پتا تو کرنا چاہیے ماں کا کوئی تو ہوگا، بس میرا یہ کام اب تمہیں کرکے دینا ہے۔" نیہا نے اس وقت صرف کنی سے کام چلایا تھا، سو وہ اپنی تلاش پر خود ہی نکل گئی۔ سمیرا کی نگاہیں بہت زیرک تھیں اسے محسوس ہو گیا تھا کچھ ایسا ہے جو نیہا چھپا رہی ہے۔ سب کے بیچ اور وہ بھی ولیمے کا فنکشن، معاملہ بعد پر اٹھا رکھا۔ سارہ سے ہوسٹل آکر ذکر کیا اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔

"یار سنا ہے فورسز کے بندوں کو صبح اٹھا کر الٹا لٹکا کر پانی میں ڈبکیاں دیتے ہیں، پھر بندے نے ایسا ہی بدمزاج ہونا ہے، خیر سے ہماری نیہا بہت اچھی ہے، گوڈے گوڈے اس کے عشق میں ڈوب گیا تو نام بدل دینا۔" اور اس وقت سمیرا کا دل کیا سارہ کو کسی سمندر میں ڈبکیاں دے آئے، باتیں کرتے کرتے نا صرف اس نے سمیرا کی چائے میں بسکٹ بھگوئے بلکہ ڈبو بھی دیے، سمیرا نخوت سے گھور کر رہ گئی تھی، پچ بھی وہ روتی سے مانگ کر لائی تھی۔

☆☆☆

جب وہ پہلی بار میکے گئی، ماما کو اس کی بلاوجہ ہنسی میں کچھ خالی پن محسوس ہوا، بہت پوچھا مگر وہ ہنس کر ٹال گئی۔ ساس سسر نے بار بار پوچھا، اس نے کوئی شکوہ شکایت نہیں کی، ایک ہی بات ساس کے بار بار پوچھنے پر وہ مسکرا دی۔

"آنٹی آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے، ہمارے درمیان کوئی فاصلہ ہے۔"

"مائیں سوتے بچے کو دیکھ کر بتا دیتی ہیں، اس وقت وہ کیا خواب دیکھ رہا ہے۔ تم تو پھر چلتے پھرتے سامنے ہو۔"

فریدہ کا جواب اسے لاجواب کرنے کو کافی تھا، مگر وہ بہت حوصلے سے کہہ گئی۔

"جب کسی ارادے کے لیے قدم بڑھا ہی دیے ہوں تو بلا جواز پلٹانے نہیں چاہئیں۔ آپ بے فکر رہیں، اگر زندگی کا سفر بہت اچھا نہیں گزرا تو بہت برا بھی نہیں گزرے گا۔"

الفاظ سے زیادہ اس کا دکھی سا لہجہ ان کے اندر اتر گیا تھا۔ ارقم نے حد تو یہ کی تھی چند دن برائے نام چھٹی پر رہا اور پھر کراچی جانے کی تیاری شروع کردی۔ زبیر کو اس کی یہ حرکت تاؤ دلا گئی۔

"اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے کر جاؤ۔"

"کہاں رکھوں گا، خود تو میس میں رہتا ہوں۔"

اس کے پاس بہترین جواب تھا۔

"شادی ہوگئی ہے تمہاری، گھر کے لیے اپلائی کرو مل جائے گا۔"

"آپ کے ہاں شادیاں آناً فاناً ہو سکتی ہیں،



لیکن سرکار کے ہاں ایسے گھر نہیں بانٹ رہے۔ دو تین سال تک گھر نہیں مل سکتا۔" زبیر دانت کچکچا گئے۔

"اگر اتنے ہی نالائق ہے سرکار تمہیں گھر الاٹ نہیں کر رہی تو کرائے پر لے لو۔"

"تنخواہ محدود ہے میری، کرایہ نہیں دے سکتا۔"

"کرایہ تمہارا باپ دے دے گا، کراچی بیوی کو ساتھ لے کر جاؤ۔"

"ابھی دیر ہو رہی ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹرالی سوٹ کیس پر نگاہیں۔ بیوی سے زیادہ ابو بے تاب ہو رہے ہیں۔

اسے رہ رہ کر اس پتھر کی دیوی پر غصہ آتا، جو گلہ شکوہ تو کیا کرتا، سب کے سامنے ایسے مسکراہٹ سجائے رکھتی جیسے میاں نے بہت خوش رکھا ہوا ہو۔ وہ تلملاتا کمرے سے نکل رہا تھا جب ہی کمرے میں چائے کے کپ لے کر نیہا داخل ہوئی۔ اندازہ تو اسے بخوبی ہو چکا تھا مگر اس نے ظاہر نہیں کیا۔ مسکرا کر زبیر کو دیکھا، چائے کی ٹرے ان کی جانب بڑھا دی۔

"انکل ارقم بتا نہیں پا رہے، دراصل کراچی جانے سے میں نے خود انکار کیا ہے، مجھے انسانوں کی بھیڑ سے ڈر لگتا ہے۔ اور ویسے بھی چھٹی پر آتے جاتے رہیں گے، پھر آج کل تو کال کی بہت سی سہولیات ہیں، آپ بے فکر رہیں۔"

زبیر اس کی بات سمجھ پائیں، ارقم کے جلتے دل پر تیل کا کام کر گئے تھے۔ اس کا دل چاہا اس عداوت کی گٹھڑی کو سوٹ کیس میں رکھے اور گردن باہر لٹکا کر سوٹ کیس زور سے بند کر دے۔

"پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو، جب تک خود منہ سے شکوہ نہیں کرے گی میں بھی جھکنے والا نہیں۔ یاد ہی کرے گی کس سے پالا پڑا ہے۔"

اسے دو دن بعد جانا تھا، وہ دن پہلے چلا گیا۔

"یہاں تو یوں ہی سہی۔"

☆☆☆

خوا مخواہ اور بلاوجہ کی ضد میں ارقم نے خوب صورت لمحے جلانے شروع کر دیے۔ جب چھٹی پر آتا تو جان کر اسے نظر انداز کرتا۔ وہ باقاعدہ مخصوص طریقے سے اس کے کام کرتی، فون ماں باپ کو کرتا، وہ اپنے درمیان میں لگے لگائی جیسے اسی سے بات کی جا رہی ہو۔ ارقم کو اس کی ڈھٹائی پر شدید غصہ آنے لگا، یہاں تک کہ ارقم کی پسند ناپسند اس کے لباس اور خوراک میں دکھائی دینے لگی، جو ارقم کو بھی محسوس ہوتی تھی۔

وہ چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا، نیہا بہت دل سے اور بہت وقت لگا کر تیار ہوئی تھی، لباس ارقم کی پسند کا، رنگ ارقم کی پسند کا، میز پر سجایا گیا کھانا ارقم کی پسند کا، جھنجھلانے کے علاوہ اس قاتل حسینہ سے نگاہ ہٹانا بھی مشکل بنا دیا تھا اور سب سے مشکل تو رات بتانا لگتا تھا، جب وہ خوشبو میں نہا کر رخ بدل کر لیٹے ارقم کے بیڈ پر خاموشی ایک جانب کروٹ لیے لیٹ جاتی اور حد تو یہ کردی صبح سویرے اٹھ کر ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی گیلے بال برش کر رہی تھی۔ ارقم اس کے قریب آیا اور آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالے دانت جما کر بولا تھا۔

"تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو، یہ خود کو اتنا بدل کس خوشی میں رہی ہو؟"

نیہا بہت اطمینان سے برش ڈریسنگ پر رکھ کر اٹھی اور اس کے مقابل کھڑی ہوگئی۔ نرم نگاہیں ارقم کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

"اپنے شوہر کے دل کا آئینہ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں، شاید کوئی عکس دکھائی دے جائے۔"

"ہونہہ شوہر۔" اس کی نگاہوں کی تپش سے فرار کے لیے ضروری تھا وہ کسی کا سہارا لے کر سامنے سے ہٹ جاتے، سو ہٹ گیا۔

☆☆☆

جب شادی کو تقریباً سال ہونے ہی والا تھا انہی دنوں وہ پھر چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا، نیہا اپنے کمرے کی صاف ستھری چیزیں بلاوجہ صاف کر رہی تھی، وہ بیڈ پر بیٹھا اس ڈھیٹ دل کی لڑکی سے چڑچڑاہٹ کی حد تک خار کھانے لگا تھا، آخر تنگ آ کر بولا۔

"کتنی وہمی ہو تم، اتنا نظر انداز کسی جانور کو بھی کرو، وہ بھی گھر چھوڑ جاتا، تم تنگ نہیں آگئیں مجھ سے۔"

وہ ازلی مسکراہٹ سے اسے دیکھ کر بلاوجہ مسکرائی، ارقم اور بھی جل بھن گیا۔ "میرا نہیں خیال کوئی بیوی اپنے شوہر سے تنگ آئی ہوگی۔"

"بیوی۔ کون سی بیوی، میں نے کون سا رشتہ رکھا ہے تم سے، جو اتنے دھڑلے سے حق جتا رہی ہو۔"

"کاغذ کا۔" اس نے اسی ٹھوس انداز میں کہا تھا لمحہ بھر تو ارقم بھی سٹپٹا گیا۔

"کہو تو اس رشتے سے بھی آزاد کر دوں۔" اس نے جان کر یہ جملہ کہا تھا، کہاں تک آخر مسکرائے گی۔

اور پھر بھی ہوا جو ارقم دیکھنے کا تمنائی تھا، نیہا کو لگا جیسے ساری کائنات کسی چھناکے سے ٹوٹ گئی ہو، اور اس کا بے جان وجود ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو، آنکھوں کی پتلیوں میں پانی کی چمک ابھری، وہ بولی کچھ بھی نہیں بلکہ سانس کی آواز بھی رک گئی تھی صرف نگاہ اٹھا کر ارقم کو دیکھا "اللہ جانتا ہے اس ایک نگاہ میں شکوہ تھا، محبت تھی، بے بسی تھی، لاچارگی تھی، بے گناہی تھی یا صرف رشتے کے بچائے رکھنے کا مان۔ پتا نہیں کیا تھا۔ ارقم کو لگا کوئی چھناکا چور کائنات سے اس کا دل بری طرح نہ صرف زخمی ہوا ہو، بلکہ اس سے ایسا خون نکلا ہو جو بہت دور دور تک پھیل گیا ہو۔ وہ مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہ گیا، ایسے جیسے سن ہو گیا ہو، کائنات کی گردش تھم گئی ہو، ان کے قریب رکھا نیہا کا موبائل چیخ چلا کر بند ہو گیا تھا، آواز دونوں تک نہیں آ رہی تھی تب ہی کمرے پر دستک ہوئی اور فریدہ نے آواز دی۔

"نیہا بیٹا تمہارے ابا کا فون ہے۔" وہ اپنی پوروں سے آنکھوں کے کونے دباتی تیزی سے باہر نکلی فریدہ سامنے ہی کھڑی تھیں۔

"تمہارے ابا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، تمہیں رحیم یار خان بلا رہے ہیں۔"

آواز سن کر ارقم بھی باہر آ گیا تھا۔ نیہا فریدہ کے سامنے ذرا قریب ہی کھڑی تھی، مشکل سے خاصی بوکھلائی ہوئی، کچھ خوف زدہ سی آواز بھی انجانے خوف سے کپکپا سی گئی۔

"ک۔۔۔۔کیوں بلا رہے ہیں ابا۔۔۔۔کیوں بلا رہے ہیں۔ آ۔۔۔۔آنٹی ابا ٹھیک تو ہیں۔ وہ ٹھیک ہیں ناں آنٹی امی نے تو انہیں کبھی کچھ نہیں بتایا، میں نے تو کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا، کبھی کسی سے گلہ نہیں کیا، صرف اس لیے کہ اپنے کیے فیصلے پر وہ کبھی نہ پچھتائیں، میں اپنے بوڑھے باپ کا سر بیٹیوں کے سامنے جھکتے نہیں دیکھ سکتی آنٹی پھر ابا کو کیسے کچھ ہو سکتا ہے میں نے واقعی کچھ نہیں بتایا۔"

جانے کب کب اور کس کس بات پر رکے آنسو ایک لڑی کی صورت اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

آواز کی لرزش پر فریدہ بھی حیران تھیں اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا، انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ذرا سی طبیعت کا بتایا ہے اور بچی یوں بلک بلک کر تڑپ رہی ہے اور ارقم کے زخمی دل پر اس کے آنسو بوند بوند گرنے لگے۔ نیہا کی لرزش اسے کسی زلزلے کی مانند محسوس ہوئی۔ اس کے ایسے سسکیاں لے کر رونے سے فریدہ بھی بوکھلا گئیں اسے پیار کرتے ہوئے سنبھال رہی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوا بھائی صاحب کو، میری جان۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں، بس تمہیں یاد کر رہے ہیں۔ تمہیں دیکھنے کو دل چاہ رہا ہوگا ان کا، اور تو کوئی بات نہیں ہے بیٹا۔ ماں باپ ایسے ہی بہانے سے بیٹیوں کو میکے بلایا کرتے ہیں میری جان۔"

"آپ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، ناں۔ آنٹی ان کے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہو، جو مجھے پناہ دینے کا سوچے، کوئی بھی نہیں ہے۔"

اس کے آنسو مسلسل بہے جا رہے تھے۔ ارقم کو ایسی شرمندگی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، نیہا کے لفظ اسے مردانگی پر طمانچے کی صورت لگے۔

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو بیٹا۔ میں ہوں، تمہارے انکل ہیں، یہ گھر اور۔۔۔" ارقم کو انہوں نے کنکھیوں سے نگاہ



سے دیکھا، وہ نگاہ چرا گیا "اور تمہارا شوہر۔"

شوہر لفظ پر اس کے آنسو سسکیوں میں بدلے اس نے اپنا سر فریدہ کے سینے میں چھپا لیا۔ فریدہ اسے بہلاتی پیار کرتی اس کا دل ہلکا کر رہی تھیں، جب اس نے اپنے آنسو پونچھتے ان سے پوچھا تھا۔

"آنٹی، مجھے انکل لے جا سکتے ہیں۔ یا۔۔۔ یا مجھے بس پر بٹھا دیں، ہوسٹل سے بھی کئی لڑکیاں اکیلے چلی جاتی ہیں۔ میں۔۔۔۔ میں ابا کے پاس چلی جاؤں گی مل کر آ جاؤں گی۔ پلیز۔۔۔۔"

فریدہ نے ایک شکوہ کناں نگاہ بیٹے پر اٹھائی۔ ارقم کا بھی دل بے طرح سے دھڑکا، جی میں آیا دل کڑا کر کے کہے۔

"بس میں کیوں، جب میں موجود ہوں، میری گاڑی موجود ہے پھر بس کا سوال کیسے؟" لیکن وہی ازلی مردانگی، کڑھ اندر ہی اندر شرمندہ ہوتا رہا۔

"نہیں، نہیں بیٹا، اکیلے کیوں۔ تمہارے انکل نے ڈرائیور کو گاڑی تیار کرنے کا کہا ہے، وہ ابھی تمہیں لے جائیں گے، پریشان مت ہو میرے بچے اور یقین مانو تمہارے ابا بالکل ٹھیک ہیں، چاہو تو ان سے بات کر لو اور جا کر اپنی تیاری کرو۔ شاباش۔"

اس لمحے ارقم کا بے حد دل چاہا وہ خود نیہا کو سسرال لے جائے، جتنا بھی سنگ دل بنا تھا مگر اب اتنا بھی نہیں تھا کہ اس کے آنسوؤں کی تاب میں بھی اکڑا کھڑا رہتا۔ لیکن کسی نے اسے لفٹ ہی نہیں کروائی۔

زبیر آفس سے آئے اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے رہے، وہ خود ان کے حکم کا منتظر تھا۔ شادی کا اعلامیہ تو خود فوراً جاری کر دیا تھا اب سسرال بھیجتے سب ان کے کہنے کے منتظر تھے۔ زبیر کا خیال تھا اسے کہنے کا سوائے دکھ لینے کے دوسرا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک سال میں جتنا وہ کھوٹ بن چکا ہے، بھلا کوئی یوں بھی بیوی کو بلی چوہا سے دور رکھتا ہے جبکہ ماں باپ کی جانب سے مکمل اجازت ہو اور فریدہ نے بھی ارقم کو سوائے دیکھنے کے کچھ نہیں کہا۔ دونوں میاں بیوی خود ہی نیہا کو ہوسٹل کے پاس لے گئے۔ وہ دن ارقم کے کمرے کی تنہائیوں کا نہایت قیامت خیز گزرا تھا، قصور اپنی انا، ضد کا۔ زندگی بے چارے سامان کی توڑ پھوڑ کر ختم کی۔

☆☆☆

ابا کی طرف آئے اسے کئی دن گزر گئے تھے، اسے پورا یقین تھا ارقم واپس جا چکا ہوگا، کیوں کہ وہ ہفتے کی چھٹی پر آیا تھا۔ وہ دن تو اس ہرجائی کے سامنے ہی گزر گئے تھے، یہاں آئے بھی نیہا کو چار پانچ دن ہو گئے تھے۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار کراچی نہیں گیا تھا اور بے رخی بھی ہنوز قائم تھی لیکن جانے نہیں ایک عجیب سی کیفیت تھی جسے وہ کوئی نام نہ دے نہیں پائی۔ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے گھر فون کیا جو اسی نے اٹینڈ کیا تھا اور نیہا کی جانب سے کسی بات کا منتظر تھا، لیکن جب نیہا نے سلام کے بعد فوراً آنٹی کا پوچھا وہ بھی جھٹ سے بولا۔

"مجھے یقین تھا امی سے ہی بات کرنا ہو گی، ابھی بلاتا ہوں۔"

نیہا کا دل تیز دھڑک دھڑک کر کہتا تھا۔ "نہیں آپ سے، صرف اور صرف آپ سے۔۔۔" مگر کہہ نہیں پائی۔

فریدہ سے ہی اسے پتا چلا تھا ارقم کل واپس کراچی جا رہا ہے۔ باتیں تو وہ بہت دیر کرتی رہیں، ابا کا بار بار پوچھا لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے سننے سوچنے کی تمام صلاحیت مفقود ہو گئی ہے، خاموش آنسو بہتے رہے۔ شادی کو ایک سال ہونے کو تھا، ارقم کا اسے نظر انداز کرتے رہنا اچھی طرح جان چکی تھی۔ امید ہوتی تو نہیں چاہیے تھی لیکن اسے ایک گمان سا تھا، چلو مجھ سے کوئی دلی لگاؤ نہیں، کوئی پسند ناپسند کا رشتہ نہیں لیکن کاغذ کا رشتہ تو بڑا اہم ہے۔ اس کے سامنے ابا کی طبیعت کا فون آیا تھا، کیا جاتا صرف ایک بار، صرف اور صرف ایک بار میرا نہ سہی ابا کا ہی پوچھ لیتے۔ وہ الگ بات تھی کہ اس نے خود خلیل الرحمان کے نمبر پر کال کر کے ان کی عیادت کر لی تھی لیکن نیہا کے علم میں نہیں تھا۔ اس کے نزدیک وہ شخص تو اب کاغذ کا رشتہ بھی رکھنا نہیں چاہتا، یہ کتنی تکلیف دہ بات تھی اس کے لیے۔ ایسے

انداز سے تو بھائیوں، بھابھیوں نے پہلے دن ہی لگا لیے تھے، وہ یہ سب قبول بھی کر لیتی لیکن اس کے بعد ابا، جنہوں نے پورے یقین کے ساتھ اور ذمہ داری سے یہ رشتہ طے کیا اور ابا کا یقین کہ میں نے یہ رشتہ اللہ کے آسرے لگایا۔ کیا ابا کا یقین ٹوٹ جائے گا، ہو سکتا ہے ارقم اس بار کراچی جاتے ہوئے اسے اس فرضی تعلق سے بھی آزاد کر جائیں۔"

یہ سوچ ہی روح فرسا تھی، تبھی دعائیں التجائیں کی، درود کسی نماز، تلاوت کے بعد۔

"اللہ جی میں ساری زندگی ایسے ہی بسر کر لوں گی لیکن میرے بوڑھے باپ کے سفید بالوں پر رحم کھا، اگر ایک فیصلہ بیٹوں کی اجازت کے بغیر کر ہی لیا، تو ان کی پگڑی جھکنے سے بچا لے۔ ارقم کے دل میں بے شک میری محبت نہ ڈال، بس اتنا خیال ڈال دے اس کا غذی رشتے سے الگ نہ کریں۔"

اگر وہ اپنی اس دعا کا ذکر بھی سارہ کے سامنے کر دیتی اس نے تین چار طمانچے لگانے کے بعد ہی کہنا تھا۔

"اے پاگل لڑکی اللہ تو اپنا ہے، کم از کم اس سے تو بندہ مکمل کر مانگ لے۔ اب مجھے ہی دیکھ روزانہ باقاعدگی سے کوہ قاف کے شہزادوں کے نام بتا بتا کر مانگتی ہوں۔"

"اب یہ تمہاری قسمت، وہاں سے اللہ جی، شہزادہ بھیجتے ہیں یا دیو......"

یہ جملہ سمیرا نے لگانا تھا جس پر سارہ سمیرا کی نہ ختم ہونے والی لڑائی چھڑ جانی تھی، لیکن یہ سب تو نیہا کے تصورات تھے۔

☆☆☆

خود سے باتیں کرتے سوچتے اسے پورا دن اور اگلی رات بھی گزر گئی۔ یہی خوف تھا کہیں، ارقم واقعی سب ختم نہ کر دیں، کیا ابا بیٹوں کے سامنے پھر جی پائیں گے۔ وہ انہی سوچوں میں گم گن میں چکر لگاتی رہی بھی دل گھبرائے جا رہا تھا۔

سارہ نے واٹس ایپ پر اپنی پکس بھیجنی شروع کر دیں، شہزادہ تو نہیں اور نہ ہی دیو، البتہ اچھی شکل صورت کا بندہ بطور منگیتر اس کی زندگی میں آ چکا تھا، جس پر وہ ہزاروں شکل پڑھ رہی تھی کہ کم از کم اب ہوسٹل لائف، پڑھائی سے جان چھٹی۔

سمیرا کا تعلیمی ریکارڈ اتنا بہتر ضرور تھا اسے کہیں بہت اچھی ہی جاب دلا سکے۔ کئی جگہ انٹرویو دے چکی تھی، جیسے اچھے انٹرویوز ہوئے اسے پوری امید تھی وہ اپنی خواہش کے مطابق جاب حاصل کرے گی۔

ایک وہ ہی تھی جو بنا کسی مقصد کے یونی گئی تھی اور بنا کسی مقصد کے چھوڑ آئی، ابا بہو بیٹوں کی باتوں سے فرار چاہتے تھے سو فرار اب ہوسٹل کے بجائے ارقم کا گھر کر دیا، ظاہر ہے ہر انسان کی خواہشیں پوری نہیں ہوتیں، نیہا سوچتے ہوئے پھیکا سا مسکرائی۔

"اگر زندگی دل کے رستے پر گزرنے لگ جائے تو کیسے جنت کی خواہش ہو۔"

وہ ٹہلتی ہوئی باہر لان میں آموں کے درختوں کے نیچے ٹہلنے لگی، پرندوں کی تھکی تھکی آوازیں، اپنے آشیانوں کی جانب تیزی سے بڑھ رہی تھیں، سورج دہکتی شعاعوں کو پر سکون کرنے لیے، زمین کے کسی کونے میں چھپا جا رہا تھا، وہ ٹہلتے ہوئے جھولے پر بیٹھ گئی، اور آہستہ آہستہ جھولا جھولنے لگی۔

یک دم اس کا جھولا ایسے رکا تھا جیسے کسی نے اس کی پیٹھ پر بھاری پاؤں رکھ دیا ہو، نیہا نے ڈر کر بند آنکھیں کھولیں، وہ پلٹ کر مڑی آنکھیں پتھر کی طرح ٹھہر گئیں، جس دن وہ زبیر کے ساتھ رحیم یار خان کے لیے روانہ ہوئی ارقم کے دل کو ایک اور دھکا لگا۔ پہلے ہی اس کی بھی آنکھوں کے زیر اثر تھا، اوپر سے اس کے پیچھے آنسو، باپ کے بارے میں جذبات اور وہ دوگو جو بتا بتائے لا کو پتا چل گیا، ارقم کو اس کے ابا کے جملے بری طرح جھنجوڑ گئے۔ جب رحیم یار خان کے لیے گھر سے روانہ ہوئے وہ آہستہ قدموں سے ہی سہی مگر گیٹ تک آیا تھا، دل میں کہیں مبہم سی خواہش بار بار انگڑائی لے رہی تھی، شاید ابو کچھ بتا دیں۔

"ارقم تم اسے لے جاؤ، سسر کی طبیعت بھی پوچھ لینا۔"



لیکن انہوں نے تو جیسے اب قسم ہی کھائی تھی، کیا وہ کنارے میں بیٹے کو پلٹ کر دیکھا بھی نہیں، ہاں نیہا جب گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول رہی تھی تب ایک بار مڑ کر ارقم کو دیکھا۔ کوئی عجیب فریاد تھی، جو ارقم کو اندر تک۔ زمین میں گاڑ رہی تھی، چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اس نے کال کر کے مزید چند چھٹیاں بڑھوا لیں اور نیہا کی شاپنگ کر کے ادھر آیا تھا، امی ابو کو پہلے ہی بتا دیا۔

"گھر الاٹ ہو گیا ہے، وہاں سے ہی آگے چلے جائیں گے۔"

یہ سب لاہور میں ہو رہا تھا، نیہا تو اس سب سے بے خبر تھی۔ فریدہ نے بھی فون پر بیٹے کے ارادے کی بھنک نہ پڑنے دی۔ اب یوں اچانک ارقم کی آمد وہ بھی پھولوں کا سرخ بوکے کندھے پر بجانے سے۔ نہ اسے اتنی امید تھی نہ خواہش۔ ہاں ایک گمان سا تھا شاید چپکے سے بہار آ جائے اب اس بہاروں پر اس کے تاثرات وہی تھے منہ بھی کھلا بالکل ویسے جیسے ارقم نے جب کہا تھا۔

"کہو تو اس رشتے سے بھی آزاد کر دوں۔"

لیکن تب میں اور اب کی حیرت میں صرف تاثرات کی زبان کا فرق تھا۔ تب تو ایسے لگتا تھا جیسے ملک الموت کو سامنے دیکھ کر پہلے ہی خوف سے جان نکل گئی ہو، اور اب، بہار میں زندگی کی تو یلی ہو۔۔۔ بولی تب بھی نہیں۔ بولی اب بھی نہیں ـــــ اور اس بار تو ارقم بیچ کچ زچ ہو گیا۔

"کہیں تم گونگی تو نہیں ہو یار!"

نیہا کی آنکھیں اب اور طرح چھلکیں۔

"نہیں نہیں گونگی تو واقعی نہیں ہو، مجھے لگتا ہے اتنے اسمارٹ، حسین شوہر کو دیکھ کر شاید گویائی سلب ہو جاتی ہے، ورنہ بھئی تمہاری تیز طرار سہیلیاں ہیں، لگتا ہے منہ میں زبان ایک کزن کی تو ضرور ہوگی۔"

اب بھی نیہا کا منہ حیرت سے پھٹا تھا آنکھیں بھی سہیلیوں کی شان میں ہونے والے قصیدے پر حیرا نگی سے پھیلیں۔ وہ جھولے سے اٹھ کر ارقم کو دیکھے جا رہی تھی اور ارقم دانت آپس میں جمائے جھنجلاہٹ کا شکار ہوا، بوکے ایک بار پھر اس کے چہرے سے ٹکرایا۔

"خدا کے واسطے رحم کرو، مجھے گونگوں کی زبان نہیں آتی۔"

نیہا بہت زور سے ہنستے ہوئے سر پیچھے تک لے گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"اوئے اوئے۔" کہتے ارقم قریب ہوا اور اس کے آنسو صاف کر دیے۔ "بہت اچھے، بھئی بہت اچھے۔ میکے میں رونا دھونا بجا کرا اپنے بھائیوں سے بچوا جاتی ہو۔ بھئی کرائے کے پیسے جمع کر لیے ہیں پلیز اب ساتھ ہی چلنا، مجھے سسرال میں ذلیل ہونے کا کوئی شوق نہیں۔"

ارقم کے محبت بھرے انداز پر اس کے آنسو تیز ہوئے اور اسے دیکھتے ہوئے مسکراہٹ گہری، ارقم کا بازو اس کے کندھوں پر پھیلتا چلا گیا۔

"ایم سوری۔ ایسا نہیں ہے تم اچھی نہیں لگی تھیں۔ لیکن وہ کیا کہتے ہیں مرد کو حکومت کی عادت ہوتی ہے ناں، پھر زندگی کا سب سے اہم موڑ اس کی ووٹنگ کے بغیر کا بینہ میں آ کر بیٹھ جائے وہ بھی علاقہ غیر کا تو یار اتنا غصہ تو شہنشاہ کا بنتا ہے۔" نیہا نے شکوہ کناں نگاہ اٹھائی ارقم مسکرا دیا۔

"سوری انکین ریئلی ویری سوری اور پلیز اتنی سوری کے بعد آپ بھی اپنی زبان مبارک کو گویائی بخش دیں۔"

نیہا نے مسکراتے ہوئے اپنا سر سرشاری میں اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔

"اٹس او کے مائی ڈیئر ہزبینڈ۔ اینڈ رئیلی آئی لو اینڈ مس یو آل ٹائم، اپنی ڈیئر۔"

"اوووو۔" ارقم کا لمبا سا اوہ نکلتے لب گولائی میں سکڑے۔ "یہ سب اگر پہلی صبح ہی کہہ دیتیں تو پورا سال نہ لگتا مجھے چلے کاٹنے میں، نالائق بیوی۔"

اس نے ایک بار پھر بوکے اس کے چہرے سے ٹکرایا تھا۔

☆☆

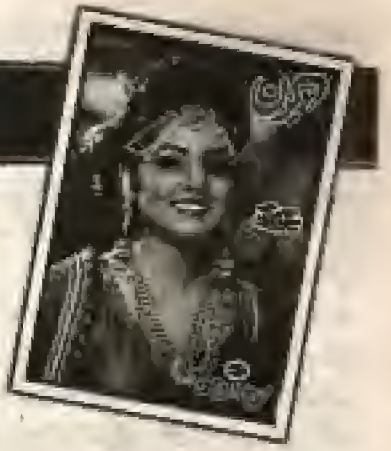

سالگرہ نمبر

**نفیسہ سعید**

# دل ہے بچپن کا

"آج کل جانے مائرہ بھابھی کو کیا ہوا تھا ہر وقت ایک ہی دھن سوار تھی اور وہ تھی خود کو کم عمر ثابت کرنے کی دھن۔ شاہ نے محسوس کیا اس چکر میں وہ بھی جان سے ہلکان ہوئے جا رہی تھیں نہ صرف اپنی باتوں، بلکہ اپنے عمل سے بھی۔ ان کی یہ بھرپور کوشش ہوتی کہ سامنے موجود شخص یہ مان لے کہ وہ اپنے بچوں کی اماں کم اور بڑی بہن زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی شادی کی مدت میں بھی از خود دو سال کی کرتے ہوئے پچھلے ماہ شادی کی بارہویں سالگرہ منائی تھی۔ لیکن چونکہ یہ ان کا اپنا بالکل ذاتی مسئلہ تھا اس لیے شاہ خاموشی سے ان کی ہر بات سن اور دیکھ رہی تھی جبکہ امی اکثر اوقات ان باتوں پر جیسے چڑ بھی جاتیں اور بلاوجہ شاہ کو باتیں سنایا کرتیں۔ جیسے سارا قصور اس کا ہی ہو۔

آج بھی جب شاہ اوپر گئی تو ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس بھابھی فون پر کسی سے محو گفتگو تھیں۔ شاہ کو دیکھ کر وہ ہلکا سا مسکرائیں اور بیٹھنے کا اشارہ کر دیا شاہ نے دیکھا فون پر بات کرنے کے دوران وہ مسلسل سامنے لگے قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھیں اور پھر فون رکھتے ہی انہوں نے شاہ کی سمت دیکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے ایک نئی خبر سنائی۔

"جازبہ آپا مجھ سے پورے آٹھ سال بڑی ہیں لیکن دیکھ لو سارے سسرال میں مشہور کر رکھا ہے کہ ہم دونوں ہم عمر ہیں۔ یہ بات ابھی ان کی جٹھانی نے مجھے بتائی تو مانو میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔"

اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کو رکیں جبکہ شاہ حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔ جن کی زبانی کافی نئے انکشافات اس تک پہنچ رہے تھے۔

ویسے جاری تو آج تک خود بھابھی سے بھی یہ ہی سنتی آئی کہ جازبہ آپا اور مائرہ بھابھی میں کچھ ماہ کا فرق ہے۔ جس کے حساب سے جا کر یہ ان سے چھوٹی بھی کیونکہ ویسے بھی آپا، جاوید بھائی سے تین سال چھوٹی تھیں اور جازب سے تین سال بڑی۔ ایسے میں اگر وہ بھی بڑی بھابھی سے آٹھ یا سات سال بڑی ہو گئیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ بھی بڑی بھابھی سے بڑی...... بس اس سے آگے مزید سوچنے کی اس میں تاب نہ رہی اور وہ خاموشی سے بھابھی کا بیان سننے لگی جو کسی سیاست دان کی طرح زور و شور سے جاری تھا۔

"سب غلط ہے ان کی میٹرک کے بعد شادی ہوئی۔ ارے کون سا میٹرک کرتے ہی ہو گئی تھی۔ میٹرک کے بعد پورے چھ سال گھر بیٹھیں پھر شادی ہوئی اور اب بنی بن گئیں اپنے بچے نہیں دیکھے جوان



ہو گئے اور ہم عمر میری بن رہی ہیں۔"

آج بھابھی اپنے سابقہ ہر بیان کو رد کرنے پر تلی ہوئی تھیں اسی لیے شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے ان کی شکل دیکھی اور پھر اچانک بول پڑی۔

"ایک بات کہوں بھابھی آپ سیاست میں کیوں نہیں آ جاتیں۔ ماشاء اللہ! آپ کا دماغ کسی سیاسی لیڈر سے کم نہیں ہے اور اہم بات یہ کہ آپ میں دوسروں کو اپنی مٹھی میں لینے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔"

اور پھر شاید شاہ کی قسمت اچھی تھی جو آج پہلی بار بڑی بھابھی اس کی بات کی گہرائی تک پہنچے بنا کچھ پل سوچنے کے بعد بولیں۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو مگر گھر کی سیاست بھی کون سا ملکی سیاست سے کم ہے، پہلے اسی سے نپٹ

لوں تو کہیں دور کی سوچوں۔"

ان کا جواب سن کر ثناء نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ امی کی جانب سے پھینکا جانے والا طنز نہیں سمجھ سکی تھیں ورنہ تو جانے کیا ہو جاتا اور جاذب آپا کا غصہ اس پر ہی اتر جاتا تھا اور یہ ہی سب سوچتی وہ نیچے آ گئی کیونکہ اب اوپر بیٹھ کر بڑی بھابھی کی باتیں سننے کی ہمت فی الحال ختم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"یہ مائرہ کو کیا ہو گیا ہے؟" دوپہر میں سبزی بناتی امی کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا تو ثناء کو مخاطب کرتے ہوئے حیرت سے بولیں۔

"کیوں؟ خیریت؟ آپ اوپر گئی تھیں کیا؟ کل تک تو ٹھیک تھیں۔"

امی کی بات سنتے ہی ثناء کو بھابھی کی طبیعت وغیرہ شاید کچھ خراب ہے اس لیے جلدی سے بول اٹھی۔

"کہاں ٹھیک تھی؟" امی نے چشمہ کی اوٹ سے ثناء کو دیکھتے ہوئے برا سا منہ بنا کر سوال کیا۔

"اپنے گھر میں؟" ثناء ابھی تک ان کی بات نہیں سمجھی تھی۔

"لگتا ہے تمہارا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے جو ماں کی بات سمجھے بولے چلی جا رہی ہو۔" اب امی کو غصہ آ گیا تو وہ تنگ آ کر بولیں اور ثناء خاموش ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"آج صبح بچوں کو چھوڑنے اسکول جا رہی تھی تو میں اس کا حلیہ دیکھ کر ہی حیران ہو گئی۔" امی کے غصہ کی وجہ کچھ کچھ ثناء کی سمجھ میں آنے لگی۔

"بھلا کوئی عورت پاجامہ پر ٹی شرٹ پہن کر بچوں کو اسکول چھوڑنے جاتے دیکھی ہے اوپر سے کھلے بال گلے میں ڈالے دکھتے پر دوپٹا جھولتا رہا۔ دل تو چاہا صبح راستہ روک کر کھری کھری سنا دوں پھر سوچا بلاوجہ ماحول خراب ہوگا اس لیے خاموش رہی۔"

"جس اسکول میں ان کے بچے پڑھتے ہیں امی وہاں اکثر مائیں ایسے ہی حلیے میں آتی ہیں۔" ہمت کرتے ہوئے ثناء نے کہنا چاہا۔

"آتی ہوں گی مجھے دوسری ماؤں سے کیا لینا دینا، بات تو میں اپنے گھر کی کر رہی ہوں جہاں کا یہ طور طریقہ بھی نہ رہا جواب مائرہ نے بنا دیا ہے۔ اوپر سے انتہا دیکھو کل میرے سامنے ہی فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے جاذب کو آپا کہہ رہی تھی، پہلے تو مجھے لگا سننے میں غلطی ہوئی ہے مگر پھر پتا چلا کہ اب جاذب ان کے لیے بھی آپا ہو گئی ہے۔ ماشاء اللہ کیا کہنے۔ لوگ وقت کے ساتھ بڑے ہوتے ہیں ہماری بہو چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔"

یہ وہ تبدیلی تھی جو وہ خود بھی کچھ عرصے سے لوٹ کر رہی تھی مگر کچھ کہہ نہ سکتی تھی، اس لیے خاموش تھی۔ جبکہ امی اپنے حقوق حکمرانی استعمال کرتے ہوئے بولنے کی قدرت رکھتی تھیں۔ لہٰذا اس وقت انہیں بولنے سے کم از کم ثناء نہیں روک سکتی تھی، اس لیے بہتر تھا ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہے۔ لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن سمجھ چکی تھی کہ عنقریب امی اور بھابھی میں کوئی بڑا معرکہ ہونے والا ہے۔ جس کا آغاز آج امی کی جانب سے ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رات امی اور جاذب کسی عزیز کی عیادت کو گئے تو وہ اپنی بوریت دور کرنے کے لیے اوپر بھابھی کے پاس آ گئی جو اسے دیکھتے ہی ایسے کھل اٹھیں، جیسے سیاست دان جلسے میں موجود عوام کو دیکھ کر کھلتے ہیں کہ کوئی تو ہے جو ان کی باتیں سننے کو موجود ہے بالفاظ دیگر بے وقوف بننے کو تیار ہے۔ پھر جب وہ بھابھی کے پاس بیٹھی تو اسے اپنے خیال کی سچائی کا سو فیصد یقین بھی ہو گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد بھابھی نے اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے ایک سسپنس پھیلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔



"چاچی! آج کیا ہوا؟" سوال کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے تازہ تازہ کٹے ہوئے بالوں کو اک ادا سے جھٹکتے ہوئے پیچھے کیا۔

"صبح جب میں بچے اسکول چھوڑ کر قریبی پارک واک کے لیے گئی تو پتا ہے ایک آنٹی نے مجھ سے کیا سوال کیا؟"

مزید سسپنس پھیلاتے ہوئے وہ اس طرح بولیں کہ ثناء کا مارے تجسس برا حال ہو گیا اور وہ جلدی سے بول اٹھی۔

"اب بتا بھی دیں کیا کہا؟"

"ایسے کیسے بتا دوں۔" ثناء کو بھرپور تجسس میں گرا دیکھ کر بھابھی نے کسی پرانی فلمی ہیروئن کی طرح ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنے لمبے لمبے ناخنوں پر لگی لال نیل پالش کو گھورا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ آنٹی کہنے لگیں کہ آج..."

"ممما... مما... یہ دیکھیں زریاب مجھے ٹی وی کا ریموٹ نہیں دے رہا۔"

بھابھی کی بات درمیان میں ہی رہ گئی جب تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر بچی اندر داخل ہوئی اس کی آواز کے ساتھ ہی ساری بات کا مزا بھی کرکرا ہو گیا جو ابھی ثناء نے سنی بھی نہ تھی۔

"بند کرو ٹی وی اور جا کر سو جاؤ تم دونوں صبح اسکول بھی جانا ہے۔"

غصے میں بولتی بھابھی بیڈ سے اٹھیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں تاکہ ٹی وی بند کر کے بچوں کو کمرے میں بھیج سکیں اور جب تک وہ اپنے اس عمل سے فارغ ہو کر واپس نہ آ گئیں ثناء کا سانس جیسے سینے میں ہی اٹکا تھا وہ سوچ رہی تھی اللہ جانے آج پارک میں ایسا کیا ہو گیا تھا جس نے بڑی بھابھی کے چہرے کو سو والٹ کے بلب جیسی روشنی بخش دی تھی بالآخر سارے مسئلے نمٹانے کے بعد بھابھی دھپ سے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پھر سے اس کی جانب متوجہ ہوئیں اور جوش سے بولیں۔

"ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ پارک میں آنٹی نے مجھ سے پوچھا۔ بیٹا آج آپ اکیلی آئی ہیں انکل نہیں آئے آپ کے ساتھ...!" بڑی بھابھی کی بات ختم ہوتے ہی ثناء جیسے چونک اٹھی۔

"انکل... مگر آپ تو شاید جاوید بھائی کے ساتھ جاتی ہیں نا صبح واک کے لیے۔"

"ہاں بھئی۔ ان کے ساتھ ہی جاتی ہوں اب تم خود دیکھو کتنا فرق ہے میرے اور ان کے درمیان کہ اب لوگوں کو وہ میرے انکل نظر آنے لگے ہیں۔"

بھابھی کے الفاظ تھے کہ کوئی ایٹم بم شکر ہے ثناء کھڑی نہ تھی ورنہ ممکن تھا بھابھی کی وضاحت سن کر وہیں کھڑے کھڑے قد سے ڈھے جاتی۔ ابھی بھی بمشکل اس نے بیڈ کا کنارہ پکڑ کر خود کو بے ہوش ہونے سے بچایا، اسی وقت جاوید بھائی نے کمرے میں اپنے قدم رکھے۔

فرمائے اور شاہ بھابھی کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دے سکی البتہ اس نے جاوید بھائی کا ایک تنقیدی جائزہ ضرور لیا جن کے سر کے بال قدرے کم ہو کر انہیں اپنی عمر سے بڑا ضرور دکھا رہے تھے مگر اتنا بڑا بھی نہیں کہ وہ بھابھی کے انکل نظر آئیں اور پھر وہ بنا کوئی جواب دیے خاموشی سے نیچے آ گئی۔

رات جب کمرے میں سونے گئی تو یہ ذکر جاذب سے کرنا نہ بھولی، شومئی قسمت جاذب اسی وقت پانی پی رہا تھا اور شاہ کی بات سنتے ہی اس کے گلے میں ایسا پھندا لگا کہ ایک پل کے لیے شاہ بھی بڑی بھابھی کو بالکل فراموش کر بیٹھی اور پھر گلاس ہاتھ سے نیچے رکھتے ہوئے جاذب نے پلٹ کر اسے دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

”یار ایسی باتیں ذرا دھیرے دھیرے بتایا کرو تم جانتی ہو نا کہ میں کتنا کمزور دل مرد ہوں، ایسا نہ ہو تمہاری طرف سے اچانک کیا جانے والا کوئی ڈرون حملہ میرا دل ہی فیل کر دے۔“

”اللہ نہ کرے جو ایسا ہو بلاوجہ کی فضول باتیں کر رہے ہیں آپ۔“ شاہ جو پہلے بھی اپنی جلد بازی پر شرمندہ تھی اب مزید شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

”اس لیے تو ڈیئر بیگم امیرا تمہیں ایک قیمتی مشورہ ہے جب اوپر جایا کرو اپنے ساتھ اپنا برتھ سرٹیفکیٹ لے جایا کرو خدانخواستہ تمہیں کسی دن بھابھی جان تمہیں بھی آنٹی یا خالہ نہ کہہ دیں۔“

بات تو سو فیصد سچ تھی وہ خدشہ جو پچھلے کئی دنوں سے شاہ کے دل میں ایک پھانس بن کر پھنسا ہوا تھا آج جاذب کی زبان سے بھی ادا ہو گیا۔ مطلب یہ ہوا اس کا خدشہ بے جا نہ تھا لیکن پھر بھی وہ ہلکی سی مزاحمت آمیز لہجے میں بولی۔

”ایسے کیسے مجھے خالہ یا آنٹی بنا دیں گی دماغ خراب ہے کیا ان کا۔“

”دماغ کا تو مجھے نہیں پتا، ٹھیک ہے یا خراب لیکن وہ تمہیں آنٹی ضرور بنا سکتی ہیں اس بات کا مجھے سو فیصد یقین ہے بالکل ویسے ہی جیسے جاذب آپا اور جاوید بھائی انکل بن چکے ہیں۔“

جاذب تو اپنی بات کی مکمل وضاحت دے کر ٹی وی دیکھنے میں مشغول ہو گیا لیکن شاہ کے دل کو اس حوالے سے بے چین کر دیا کہ اس دن کے بعد وہ جب بھی بڑی بھابھی سے ملی ہمیشہ ایسا لگا وہ ابھی اگلے جملے میں اسے بھی آپا یا آنٹی کہہ دیں گی مگر صد شکر ایسا ہوا نہیں اور فی الحال اس کا خدشہ خدشہ ہی رہا۔

☆☆☆

اپنا وزن کم کرنے کے لیے مائرہ بھابھی نے کوئی جم جوائن کر لیا تھا جہاں جاتے ہوئے وہ عموماً ٹریک سوٹ پر اسکارف لیا کرتیں اور شاہ ہمیشہ یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی کس طرح جاوید بھائی انہیں اجازت دیتے تھے کہ وہ اس حلیے میں گھر سے باہر جایا کریں جبکہ جاذب تو اپنی عادتوں کے حساب سے اپنے بھائی سے بالکل مختلف تھا یہی وجہ تھی کہ شاہ کبھی بھی سر ڈھکے بنا گھر سے باہر نہ نکلی۔ جب کہ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ بھی رنگ پکڑ لیتا ہے۔ تو مانیں یہ بات یہاں بالکل درست قرار پائی اور شاہ کے دل میں بھی یہ خواہش انگڑائیاں لے کر بیدار ہو گئی کہ اسے بھی جم جوائن کرنا چاہیے اور شومئی قسمت رات ہی وہ یہ ذکر جاذب کے سامنے کر بیٹھی جو پہلے تو اس کی بات سن کر ہنس دیا اور پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔

”تم تو ماشاءاللہ اچھی خاصی سلم و اسمارٹ ہو پھر بھلا تمہیں یہ جم جوائن کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔“

”جم اسمارٹنس کے لیے جوائن نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا مقصد فٹنس ہوتا ہے۔“ بھابھی سے سنی جانے والی تازہ ترین بات اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے حافظے میں محفوظ تھی جسے من وعن اس نے جاذب کے سامنے ایسے بیان کیا جیسے کوئی نیوز چینل بریکنگ نیوز دیتا ہے۔ جاذب کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے پوری امید تھی کہ وہ یہ بات سن کر فوراً سے پیشتر ہی شاہ کی ذہانت کا قائل ہو جائے گا مگر ایسا تو نہیں ہوا الٹا



جاذب نے بے ساختہ ہنس کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ خیال تمہارا ہے یا بڑی بھابھی کا۔“ شاہ گڑبڑا گئی، سمجھ میں ہی نہیں آیا کیا جواب دے۔

”ویسے تمہارا ہو نہیں سکتا کیونکہ مجھے تم سے اتنی سمجھداری کی بھی امید نہیں رہی۔“ شاہ کے جواب دینے سے قبل ہی وہ ایک بار پھر سے بول اٹھا۔ شاہ نے دیکھا اب وہ پھر سے مسکرا رہا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ کو اپنی فیلڈ تبدیل کر کے محکمہ پولیس جوائن کر لینا چاہیے۔ عوام کا خاصا بھلا ہو جائے گا۔“ جاذب کی بات سن کر شاہ قدرے چڑتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ آپ بنا کسی تفتیش کے خاصے اچھے تکے لگا لیتے ہیں۔“ جاذب اس کی بات سن کر زور سے ہنس دیا جبکہ منہ بناتی شاہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”تم جانتی ہو جاوید نے ہمیشہ میری کم عمری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔“

بڑی بھابھی اپنے تئیں شاہ کو لیے گھیرے بیٹھی تھیں جیسے کوئی عامل اپنے کسی مرید کے سامنے وعظ بیان کر رہا ہو اس امید پر کہ جواباً اسے داد ہی داد سمیٹنے کو ملے گی مگر نتیجہ ان کی توقع کے برخلاف نکلا اور سامنے بیٹھی معصوم سی نظر آتی شاہ نے فوراً سے پیشتر اپنی آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے انہیں دیکھا اور نہایت سادگی سے بولی۔

”ویسے آپ جاوید بھائی سے کتنی چھوٹی ہیں؟“

”یہی کوئی دس سال۔“ دل ہی دل میں حساب لگاتی بڑی بھابھی تھوڑا سا گڑبڑا گئیں کہیں ان کا بتایا جانے والا اندازہ غلط نہ ہو جائے۔

”اوہ۔۔۔!“ شاہ نے اپنے ہونٹ سکوڑے ”ویسے آپ کی شادی کس عمر میں ہوئی تھی؟“

کیونکہ عام طور پر وہ اتنی جرح نہیں کرتی تھی۔ شاہ کی جانب سے کیے گئے اگلے سوال نے بڑی بھابھی کو تھوڑا سا حیران کیا، مگر پھر اگلے ہی پل خود کو سنبھالتے ہوئے وہ قدرے مسکرا دیں اور بولیں یہ ہی


عمران ڈائجسٹ

Emaie: id@khawateendigest.com



مارچ 2019

سلطان محمد فاتح

ملت اسلامیہ کے اولوالعزم کردار ”سلطان محمد فاتح“ کے کارنامے

محترمہ شاہدہ لطیف

انمول شوق

جاوید راہی کی کاوش

معیاری دشمن

امیر آغا کے قلم سے

زیست پرستم

فریحہ ملک

خزاں کے بعد

محمد سلیم اختر کی جادو بیانی

شام کے بعد

صائمہ عروج

مارچ 2019 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

سولہ سال کی تھی میں اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ میں اپنی کم عمری کے باعث ہی جاوید کی چکنی چپڑی باتوں میں پھنس گئی ورنہ تو۔"

"ویسے تیر مجھ سے آپ ابھی بھی پورے دس سال بڑی ہیں۔" شاہ ان کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی جسے سنتے ہی بھابھی ایسے چونکیں جیسے بھرے مجمع میں کسی سیاسی لیڈر پر جوتا پھینک دیا گیا ہو۔ جب ان کے کانوں سے شاہ کی آواز ایک بار پھر سے ٹکرائی "کیونکہ میری شادی آپ کے پورے دس سال بعد ہوئی ہے اور یہ تو آپ نے بھی دیکھا ہی تھا کہ میرا ابھی ابھی سولہواں سن ہی شروع ہوا تھا دراصل میں نے میٹرک بھی بارہ سال کی عمر میں ہی کرلیا تھا اور ہماری فیملی میں سب ہی اتنی ہی عمر میں پڑھ لیتے ہیں۔" بھابھی کی طرف سے آنے والے سارے تیر واپس ان کی طرف پھینکتے ہوئے شاہ اطمینان سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

جب وہ نیچے آئی تو بڑی بھابھی کے چہرے کے تاثرات یاد کرکے کافی دیر تک مزا لیتی رہی کیونکہ ان کے ساتھ وہ کم از کم یہ ضرور جان گئی تھی کہ اگر جیتنا ہے تو جیسا ہے اس کے ساتھ ویسا ہی گیم کھیلا جائے کیونکہ اس نے یہاں تماشا دیکھنے والوں کو ساری زندگی بھرے مجمع میں دوسروں کو کھیلتے دیکھ کر اچھل کر داد دیتے ہی دیکھا تھا، اس لیے زندگی جینے کے لیے ضروری تھا کہ تماش بین کے بجائے کھلاڑی بنا جائے جو فی الحال شاہ بن چکی تھی۔

☆☆☆

آج دوپہر وہ نیچے ہی ٹی وی دیکھ رہی تھی جب امی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور قدرے حیرت سے بولیں۔

"خیریت تو ہے بیٹا آج کل اوپر کا دانہ پانی بند ہے کیا جو تم خیر سے دروازہ بند کیے سارا دن اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی ہو۔" امی کی گفتگو سن کر شاہ کا بے اختیاری ہنسی دینے کو جی چاہا کیونکہ اپنی طرز گفتگو میں وہ کسی طور انور مقصود سے کم نظر نہ آرہی تھیں۔

"ویسے ہی امی دل نہیں چاہ رہا۔" بے دلی سے جواب دیتی شاہ بیڈ پر اٹھ بیٹھی تاکہ امی کے بیٹھنے کی جگہ بنا سکے۔

"دل بھی کیسے چاہے گا اب اس عمر میں تو بندہ اپنے ہم عمر لوگوں سے ہی بات کرکے خوشی محسوس کرتا ہے یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تمہاری جٹھانی تو تمہاری بھی بچی بنی ہیں اب سوچو بھلا ایسے میں کسی بچے سے بات کرکے کیا خاک مزا آئے گا۔"

امی کی بات سن کر شاہ بے اختیار ہنس دی کچھ دیر قبل والی کوفت جس نے اس کی طبیعت کو بے زار کر رکھا تھا ایک پل میں ہی اڑن چھو ہو گئی۔

"ہنسنے کی بات نہیں ہے بیٹا رونے کا مقام ہے وہ وقت جب بچوں کو ماں کی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے ماں چوبیس گھنٹے اپنے پر ہی توجہ دینے لگے تو سوچو ذرا گھر کا کیا بنے گا۔ یہاں تو یہ عالم ہے بیوی ایسے جیسے مقابلہ حسن کے لیے خود کو تیار کر رہی ہو اور میاں بے چارے اسے دیکھ دیکھ کر مارے خوشی ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ بچے کیا کر رہے ہیں دونوں میں سے کسی کو کچھ پتا نہیں۔"

شاہ بڑے تحمل سے امی کی باتیں سن رہی تھی کیونکہ اس کے پاس ان تمام باتوں کا کوئی جواب نہ تھا سوائے خاموشی کے جسے اختیار کیے، آج وہ اس محاورے کی سچائی کی دل سے قائل ہو چکی تھی۔ ایک چپ سو سکھ۔ ویسے بھی کئی بار بڑی بھابھی باتوں ہی باتوں میں اسے یہ جتا چکی تھیں کہ میری زندگی ہے میں جیسے مرضی جیوں تو پھر بھلا کسی کے اعتراض کی کوئی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی تھی اور پھر وہ خاموشی سے اپنا زیادہ وقت نیچے ہی گزارنے لگی۔

☆☆☆

آج بڑے عرصہ بعد شاہ نے اوپر کے فلور پر ہونے والا شور شرابا سنا جس میں خلاف توقع جاوید بھائی کی آواز کافی نمایاں تھی جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ خاصے غصہ میں ہیں۔ اس دوران امی تو خاموشی سے تلاوت کلام پاک میں ایسے مشغول رہیں کہ جیسے انہیں کوئی آواز سنائی نہ دے رہی ہو جبکہ



چونکہ عالی اس سیاسی کارکن جیسا تھا جو دوسری پارٹی کی ٹوہ لینے میں ہلکان ہوتا کہ جیسے ہی کوئی نئی خبر ملے اسے میڈیا تک پہنچا کر سرخرو ہو جائے۔ یہی وجہ تھی جو جاوید بھائی کے کمرے سے باہر جاتے ہی وہ چہرے پر بھرپور ہمدردی کے تاثرات سجائے اوپر جا پہنچی کیونکہ تاریخ گواہ ہے۔ آپ جتنا ہمدردی کی آڑ میں دوسرے کے دلوں تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں اتنے کامیاب کسی اور عمل سے نہیں ہوسکتے اور ایسا ہی ہوا شاہ کے ہمدردی کے بول سنتے ہی مانو بھابھی تو جیسے کسی غبارے کی مانند پھس ہو گئیں فوراً سے پیشتر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور شاہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہوں نے کسی پرانی فلمی ہیروئن کی طرح اپنے سینے سے دو چار گہرے گہرے سانس باہر خارج کیے اور ادا سے بولیں۔

"میں نے شاید تمہیں کبھی بتایا ہو کہ جاوید میری خوب صورتی سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں انہیں خدشہ ہے کہ کہیں میں انہیں چھوڑ کر نہ چلی جاؤں۔"

"ہیں....." بڑی بھابھی کی بات سن کر مارے حیرت شاہ کا منہ کھل گیا کیونکہ ان کا دوسرا جملہ شاہ کو بالکل پسند نہ آیا تھا۔

"ہاں تو اور کیا....." اس کے ہیں کا مطلب بڑی بھابھی نے اپنی مرضی سے اخذ کیا اور جیسے مطمئن ہوتے ہوئے بولیں۔ "تم تو جانتی ہو آج کل میں اکیلی ہی پارک واک کرنے چلی جاتی ہوں کیونکہ جاوید کے پاس ٹائم نہیں ہوتا اب دیکھو راکل گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا تو میں نے نیٹ کے ذریعے چلنے والی ایک سروس کار بلوائی جس کا ڈرائیور خاصا خوب صورت سا لڑکا تھا یقین مانو پارک جاتے ہوئے پندرہ منٹ کے دوران اس نے گاڑی کا شیشہ سیدھا کرکے کئی بار مجھے دیکھا اور جب میں اترنے لگی تو اپنا فون نمبر دیتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے بہت اچھی لگیں میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کو مجھ میں کوئی دل چسپی محسوس ہوئی ہو تو پلیز اس نمبر پر ایک میسج کردیجیے گا۔" اتنا کہہ کر وہ تو چلا گیا اور میں کارڈ ہاتھ میں تھامے واک کے بعد جو گھر آئی تو یہ بات جاوید کو بھی بتادی بس تب سے ہی وہ اتنے غصہ میں ہیں کہ اگر کہیں وہ لڑکا مل گیا تو سمجھو جان سے بھی مار دیں گے ہائے بے چارہ غریب مجھے پسند کرنے کی سزا میں کہیں مارا ہی نہ جائے۔"

بھابھی اتنا کہہ کر ایک بار پھر سے رونے کی تیاری کرنے لگیں لیکن ان کے الفاظ سن کر شاہ کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ اس وقت اصل ہمدردی کے قابل کون ہے؟ بھابھی یا جاوید بھائی۔ خود نمائی کی ماری کوئی عورت اتنا بھی آگے جا سکتی ہے یہ سوچ کر ہی حیرت ہوئی کہ کس طرح بھابھی نے یہ ساری بات جاوید بھائی کو بتائی ہوگی مزید یہ کہ کیسے اس نوجوان میں اتنی ہمت ہوئی کہ اپنے سے بڑی عمر کی عورت کو اپنا سیل نمبر تھما کر چلتا بنا آخر غلطی کس کی تھی جاوید بھائی کی جنہوں نے بیوی کو بے جا آزادی دی۔ یا بھابھی کی جنہوں نے اپنے میاں کی دی گئی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس حد تک جا پہنچیں کہ آتے جاتے لوگ انہیں اپنا فون نمبر تھمانے لگیں اور سب سے بڑا مقام افسوس یہ تھا کہ انہیں اس بات کا اندازہ بھی نہ تھا کہ لوگ ان کے بارے میں کتنی غلط رائے قائم کر رہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ آزادی کسی بھی شکل میں ہو ایک خاص حد تک ہی اچھی لگتی ہے۔ یہی سوچتی شاہ انہیں اسی طرح روتا چھوڑ کر خاموشی سے اٹھ کر اپنے فلور پر واپس آ گئی کیونکہ اس بار اسے بڑی بھابھی سے بجائے ہمدردی کے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ عورت جو خود کو کم عمر ثابت کرنے کے لیے اس حد تک آگے بڑھ جائے کہ غیر لڑکے انہیں اپنا نمبر تھمانے لگیں۔

اس وقت فی الحال شاہ کو کسی ہمدردی کے بجائے قابل ترس لگ رہی تھیں اور کاش یہ بات مائرہ جیسی عورتوں کی سمجھ میں آسکے جو خود نمائی میں اتنا آگے نکل جاتی ہیں..... اے کاش!

☆☆

ام طیفور

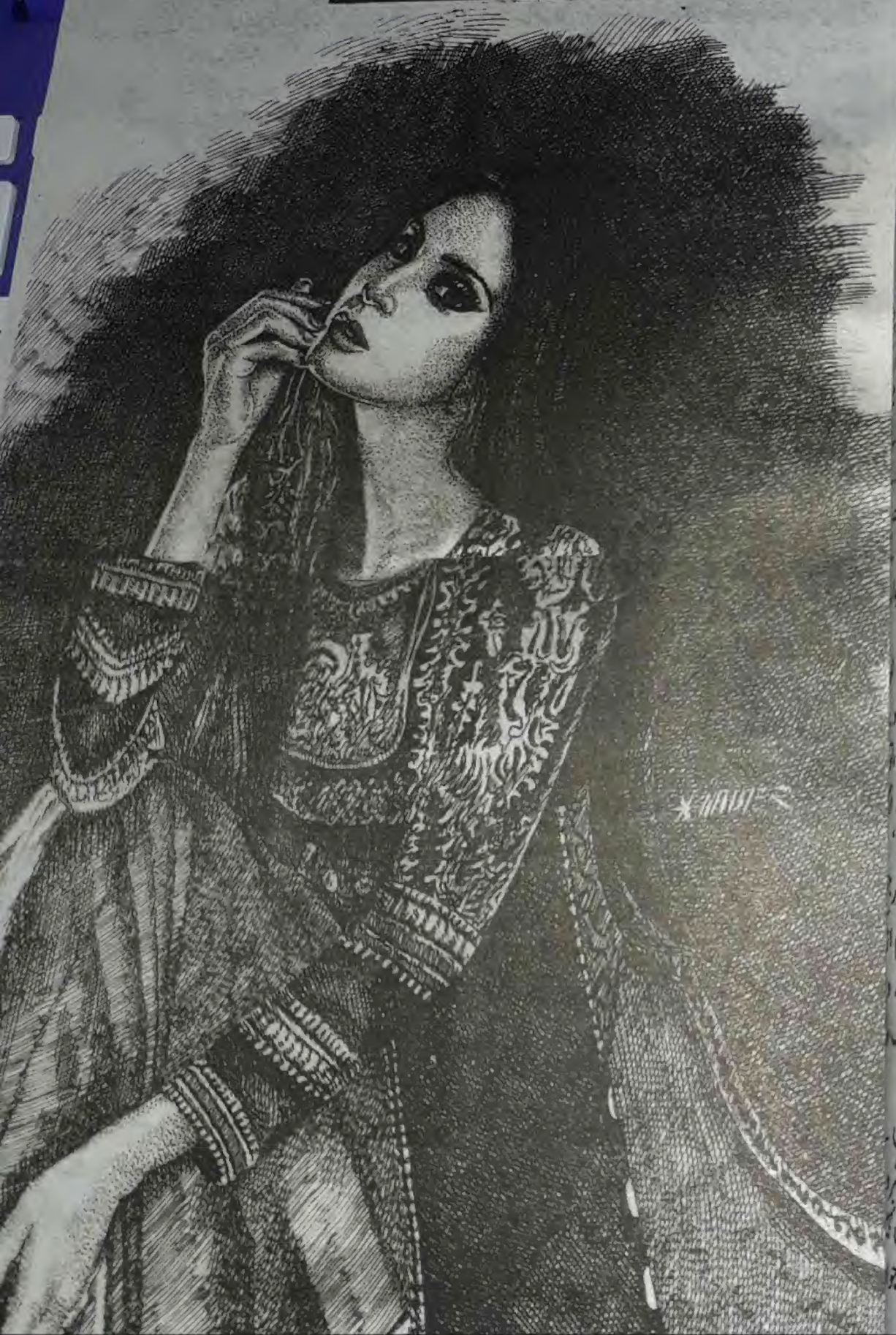

# ساگر کنارے

شام ڈھلے ماحور کی گھر واپسی ہوئی تھی۔ ابرش کو شاپنگ کرنی تھی اس لیے آج کچھ لیٹ ہو گئی تھی۔ گھر میں قدم رکھنے سے پہلے ہی باہر گلی میں آتی اونچی اونچی آوازوں نے اسے باور کرا دیا کہ اندر گھمسان کا رن پڑا تھا۔ نیم وا گیٹ کو پورا کھولتی وہ اندر داخل ہوئی تو صحن میں جیسے مداری کا تماشا لگا تھا۔ بڑی فرصت سے اس کے بہن بھائی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ سامنے کرسیوں پر رائنہ اور عاقب بھائی بھی ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے لطف اٹھاتی نگاہوں سے صحن کے بیچوں بیچ لڑتے عقیل مغل اور دادی کے درمیان زبانی کلامی ہوتی دھواں دھار لڑائی دیکھ رہے تھے۔ ماحور کا سر گھوم کر



رہ گیا۔ اب بھلا یہ ہونا باقی تھا کیا؟ نڈھال سی وہ رائنہ کی بغل میں پڑی کرسی پر ٹک گئی۔ اسے کہنی متوجہ کیا تو جواباً اس نے مکھی اڑانے والے انداز ماحور کو "پرے مرو" کا اشارہ کیا جیسے ایک سیکنڈ بھی دھیان ادھر سے ادھر گیا تو سامنے ادا ہو مکالموں سے جھڑتے قیمتی موتی ہاتھ آنے سے جائیں گے۔ اس نے بے زاریت سے سب چہرے دیکھنے کے بعد صحن کے درمیان فلمائے جا والے سین کو دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کی۔

"کم بخت۔ ایک ایک چیز کا حساب گی۔ میرے گھر کے بلب تک تو تو نے اتار کر بیچ نشئی۔ تجھے کیا لگا کہ چاچی کبھی واپس نہیں آئے گی تیرا دل کرے گا میرے گھر سے چرا کر ٹھکانے جائے گا۔ اب دیکھتا جا، میں تجھے بیچوں گی۔ سمجھا۔"

"ارے چاچی۔ مجھے بیچو گی تو تمہیں در انڈے بھی نہ ملیں گے۔ تمہارے بلب بیچ کر کم میں نے درجن بڑیاں تو لے لی تھیں۔ کتنے میرے سکون سے گزر گئے تھے۔ دعائیں الگ تھیں تمہیں۔"

"دیکھو۔ دیکھو کیسا بے حیا ہے یہ۔" انہوں جملہ حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو شر دن سے ایسا ہی تھا عقیل۔ تجھے عزت کبھی راس آئی۔ کاش کہیں سے ذرا سی عقل خرید لی ہوتی۔ جو

اولاد تیرے گھر میں تھی۔ کیا کچھن سکھا رہا ہے انہیں؟"
ماحور نے اس بات پر بے ساختہ سر جھٹکا۔ بھلا بابا نے انہیں سکھایا ہی کیا تھا۔

"ہونہہ۔ ایسی ذلیل اولاد کو کیا سکھانا ہے چاچی۔ کتے ہیں یہ سب۔ ساری عمر ہڈی ڈالی مگران منحوسوں نے دم ہلانا نہ سیکھی۔"

عقیل مغل پٹڑی سے اترنے لگے تھے۔ وہ سب بہن بھائی بدمزا ہو گئے۔ عاقب بھائی اور رائنہ بھی نظر چرا گئے۔ ماحور اٹھ کر اندر جانے سے پہلے رائنہ کے کان میں بولی۔

"تم شرافت سے گھر جاؤ۔ ورنہ تمہاری ساس کو کال کرکے بتاتی ہوں کہ یہاں بیٹھے دونوں سینما دیکھ رہے ہو۔"

"ہی ہی ہی۔" رائنہ نے دانت دکھائے۔

"تمہارے آنے سے دو منٹ پہلے وہ بھی یہاں بیٹھی یہی سینما دیکھ رہی تھیں۔ ہیں جی۔ اس لیے کوئی فائدہ نہیں۔ نماز پڑھنے گئی ہیں۔ اگر ان کے فارغ ہونے تک یہ فلم چلتی رہی تو ابھی واپس آکر کنٹی نیو کریں گی۔"

ماحور نظروں ہی نظروں میں "آفرین" کہتی اٹھی اور اندر کمرے میں چلی آئی۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے دادی کا جملہ سنا تھا اور بے ساختہ مسکرا دی۔

"اب ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ میں بھی یہاں سے جانے والی نہیں۔ تجھے انسان بنا کے جاؤں گی۔"

اس نے بیگ ایک کونے میں پڑی چھوٹی سی اسٹڈی ٹیبل پر اچھالا اور بیڈ پر بیٹھ کر پاؤں اوپر کر لیے۔

"کاش کہ کوئی واقعی بابا کو بھی سدھار دے۔ ادھم مچاتی پریشانیوں میں کوئی تو خوشی اپنا بھی سر نکالے۔"

اس نے سوچا اور نیم دراز ہوتے ہوئے کمر ٹیک لی۔ کتنا اچھا ہو جو واقعی بابا کی چاچی یہیں رہ جائیں۔ ان کے گھر میں بھی کوئی ایسا ہو جو سب سے بازپرس کر سکے، سب کی فکر کرے۔ بابا کو ڈانٹ سکے، انہیں کوس سکے۔ وہ گھر سے باہر ہو تو اسے پیچھے اپنے بہن بھائیوں کی فکر نہ ہو۔

وہ آنکھیں بند کرکے خود کو آرام پہنچانے لگی۔ ساتھ ہی مومن کا خیال ذہن کے پردے پر ابھرا تو ہونٹ خود بخود مسکرا دیے۔ آج آفس میں بہت کام تھا، ایک بار مومن کی کال آئی بھی تو پک نہیں کر سکی۔ سوچا گھر جا کر سکون سے بات کرے گی۔ مگر آف ہونے کے بعد ابرش کو شاپنگ کا ہڑکا لگا اور مالز کے چکر کاٹنے میں اتنا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر اسٹڈی ٹیبل سے بیگ کا اسٹریپ کھینچ کر اسے اپنے قریب کیا اور اندر ٹھونسے ردی کاغذوں میں سے ٹٹول کر اپنا سیل فون ڈھونڈ نکالا۔ مومن کے نمبر پر کال کرتے ہوئے اب اس کا دل خواہ مخواہ دھڑک اٹھا تھا۔ کل رات دوسرے نمبر سے آنے والے اس کے میسجز ابھی تک اسے لطف دے رہے تھے۔ اگر مومن کے پاس خود اس نے دوسری سم دیکھ نہ لی ہوتی تو اسے کبھی نہ پتا چلتا کہ اس نمبر سے اس کے ساتھ رومانس جھاڑنے والا وہ ہی ہے۔ شاید جناب کا ارادہ اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کا تھا تو پھر یوں ہی سہی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جب تک مومن اسے خود نہیں بتائے گا کہ وہ کون ہے تب تک وہ بھی اس پر یہ ظاہر ہونے نہیں دے گی کہ وہ اسے پہچان چکی ہے۔ اس لیے اس نے مومن کے پہلے نمبر پر ہی کال ملائی تھی۔ چوتھی بیل پر کال اٹھایا تھا۔ مگر یہ مومن تراب کی آواز نہیں تھی۔ اس نے موبائل کو کان سے ہٹا کر ایک بار گھورا اور پھر دوبارہ سے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے مسلسل کوئی بھاری مگر ضعیف سی آواز ابھر رہی تھی۔

"بول شادا بول۔ نہیں کچھ کہتا میں۔ بول بھی پڑ بیٹا۔"

اس نے بغیر کچھ کہے سٹپٹا کے کال کاٹ دی۔ ایک دو لمبے لمبے سانس لے کر خود کو نارمل کیا اور موبائل واپس رکھنے ہی لگی تھی کہ میسج کی بیپ ابھری۔

"عمر رائگاں کر دی، تب یہ بات مانی ہے
موت اور محبت کی ایک ہی کہانی ہے
کھیل جو بھی تھا جاناں اب حساب کیا کرنا
جیت گو کسی کی ہو، ہم نے ہار مانی ہے"

"دھت۔ آ گئے جناب فٹافٹ چھیڑ چھاڑ کرنے۔ میرے ساتھ ڈبل کراسنگ۔ ہمم۔" ہولے سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے جوابی کرارا سا میسج ٹائپ کیا جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا اور ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ موبائل میز پر رکھ کر واپس صحن کا رخ کیا جہاں سے آتی دادی کی آواز اسے مزا دے گئی۔

"اب اگر تو نشہ کر کے گھسا نا یہاں عقیل۔ تو دیکھ میں تیرا سر کیسے گنجا کرتی ہوں۔"

اس نے سوچا وہ بھی جا کر دادی کو کمک پہنچائے۔ مدتوں کی دل میں جمع بھڑاس دادی کے کندھوں پر بندوق رکھ کر نکلے تو سہی۔ وہ کمرے سے جا چکی تھی اور پیچھے اس کے موبائل پر کال آ رہی تھی۔ جس کی اسکرین پر مسلسل مومن کالنگ بلنک کر رہا تھا۔

☆☆☆

مومن مسلسل کمرے کے چکر کاٹ رہا تھا۔ بے چینی اس کے ہر ہر انداز سے ہویدا تھی اور دادا تھے کہ بیڈ پر لحاف میں گھسے اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ساتھ ساتھ مونگ پھلی چھیل کر دانے منہ میں ڈالتے اور چھلکا مومن کا نشانہ لے کر اسے دے مارتے۔ وہ جھنجلا کر رہ گیا۔

"کیا دادا۔ آپ کو بھلا کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ میرے موبائل پر آئی کال پک کریں۔ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ میرا باس ہو سکتا تھا۔ میرا کوئی کولیگ ہو سکتا تھا۔"

وہ یہ کہہ کر دوبارہ سے ماحور کا نمبر ملانے لگا۔ مسلسل بیل جا رہی تھی مگر وہ پک نہیں کر رہی تھی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ دیوار میں سر دے مارے۔ نہ جانے کون سی گھڑی تھی جب وہ اپنا سیل دادا کے کمرے میں بھول گیا۔

"نہ تیرا باس تھا نہ کولیگ۔ لڑکی تھی لڑکی۔ وہی لڑکی جسے تو ابھی تک کھیسے میں چھپائے بیٹھا ہے۔ وہی لڑکی جس کے گھر رشتہ لے کے چلنے کو کہہ رہا ہوں کب سے۔ اب وہ نمانی میری آواز سن کر غش کھا گئی تو میرا کیا قصور۔ جوانی سے بڑھاپا آ گیا مگر تیرے دادے کی آواز کا جادو ابھی تک سر چڑھ کر ہی بولتا ہے۔" دادا کی خوش گمانیاں کبھی بوڑھی نہیں ہوئی تھیں۔

"دادا۔ وہ غش کھانے والوں میں سے نہیں ہے۔ دلانے والوں میں سے ہے۔ ابھی آپ اسے جانتے نہیں ہیں۔ جب ملیں گے نا تب پتا چلے گا کہ مستقبل میں کیسی توپ فٹ ہونے جا رہی ہے ہمارے گھر۔ سارا دن گولا باری ہوتی رہا کرے گی۔"

"ہاں تو تیرا دادا بھی کسی سے کم نہیں۔ چھوٹی موٹی منجنیق تو میں بھی ہوں۔"

دادا کی بات پر مومن قہقہہ مار کر ہنسا۔ وہ بھی ہنس دیے۔ اس نے اپنے اضطراب پر قابو پایا اور دادا کے ہی لحاف میں گھس کر مونگ پھلی کھانے لگا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کل آفس سے واپسی پر ماحور سے ملے گا۔ دو دن نظر نہ آتی تھی تو پیٹ میں مروڑ پڑنے شروع ہو جاتے تھے۔

"ویسے دادا اگر اس کے بابا نے رشتے سے انکار کر دیا تو؟"

کڑچ کی آواز کے ساتھ مومن نے مونگ پھلی کا چھلکا توڑا۔

"نہیں کرے گا۔ اور اگر کرے گا تو شاویز کو اس کے ساتھ ایک کمرے میں بند کر دیں گے۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہو گی اس کے لیے۔ سارا نشہ ہرن ہو جانا ہے۔ اپنے شاویز کی شکل دیکھ کر کسی پھانسی گھاٹ کے جلاد کا خیال آتا ہے۔"

"یار دادا آپ بھی مبالغہ کرنے میں حد کرتے ہیں۔ اچھا بھلا لڑکا ہے اپنا شاویز۔ ذرا سا ڈینگا چبا (ٹیڑھا میڑھا) ہے۔ ورنہ اچھا بھلا ہے۔ یا تھوڑا شکل سے بھانڈ لگتا ہے۔ ورنہ اچھا بھلا ہے۔"

اور سارے کمرے میں دونوں کے قہقہے گونج اٹھے تھے۔

کل جب شاویز آتا تو یہ سب باتیں اس کے سامنے بھی دہرائی جاتی تھیں، جنہیں وہ بڑے سکون سے سن کر ہضم کر لیتا۔ اگر وہ ایک بھی دن نہ آتا تھا تو

دادا پیغام بھیج کر بلوا لیتے تھے۔ان کا اس کے بغیر بھلا گزارا ہی کب تھا۔

"بس دادا۔دو چار دن رک جائیں پھر آپ کو او کے کا سگنل دے دوں گا۔آپ سکون اور اطمینان سے رشتہ لے کر چلے جایئے گا۔"

"دو چار دن کا مطلب ،دو چار دن ہی ہو مومن۔اس کے آگے میں تمہاری بات اس سے پکی کردوں گا جس کی تصویر دیکھ کر شادیز کا بھی پکا منہ بن گیا تھا۔"

دادا نے چھلکا اس کے گال پر مارتے ہوئے کہا تو وہ سر جھٹکتا دوبارہ سے ماحور کو کال ملانے لگا۔ دوسری طرف بیل مسلسل جا رہی تھی مگر ریسیو ابھی بھی کوئی نہیں کر رہا تھا۔اسے اس قدر جھنجلاہٹ ہوئی کہ اگر دادا نہ بیٹھے ہوتے تو شاید اب تک وہ اپنا موبائل دیوار پر مار چکا ہوتا۔اسے اب کل ہر صورت ماحور سے ملاقات کرنی تھی۔وہ اسے شدید مس کر رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے گھڑی پر وقت دیکھا۔رات کے ساڑھے آٹھ ہو چکے تھے۔عادل پاشا کی غیر موجودگی میں وہ اکثر گھر لیٹ ہی آتا تھا۔واپسی پر کسی نا کسی دوست کی طرف نکل جاتا اور وقت گزارتا تھا۔ناعمہ پاشا کا سامنا کرنے سے وہ حتی الامکان کتراتا تھا۔عادل پاشا دو دن کا کہہ کر گئے تھے مگر انہیں ہفتہ مزید لگ گیا تھا۔وہ ان کا خطرہ بھی تھا، کیونکہ ماحور کے حوالے سے اسے حتمی بات کرنی تھی۔ماحور کا خیال آتے ہی اس نے اپنا سیل فون نکالا اور کل رات کی طرح ایک خوب صورت سا شعر بھیج کر گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔وہ کل سے سرشاری کی کیفیت میں تھا۔اس کے لیے یہ سوچ ہی بے حد جاں فزا تھی کہ ماحور اس کے جذبات سے آگاہ تھی۔جوابی میسج نے اس کی مرضی سالک پاشا پر عیاں کر دی تھی۔اگر وہ چاہتا تو اسے کال بھی کر سکتا تھا مگر یہ ڈھکا چھپا انداز، یہ لکا چھپی والی کیفیت اسے مزا دے رہی تھی۔وہ بہت جلد اس کے روبرو ہونا چاہتا تھا۔پورے استحقاق کے ساتھ۔

میسج بھیج کر وہ وہیں اپنی گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے اس کے میسج کا انتظار کرنے لگا۔چند لمحے بعد اس کا میسج آیا جسے پڑھ کر بلند و بانگ قہقہہ اس کے حلق سے آزاد ہوتا فضا کی نذر ہو گیا۔گیٹ پر کھڑے گارڈ نے حیرت سے سالک بابا کو دیکھا جنہیں یوں ہنستا وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔سالک نے ایک بار پھر سے اسکرین پر نظر آتے ماحور کے ٹیکسٹ کے الفاظ پڑھے۔

"میرے پاس جتنا اسٹاک تھا نا، وہ میں کل رات ختم کر ڈالا اور اب اگر تم نے مزید اپنی شاعری کی آبیاری میرے زرخیز دماغ میں کرنے کی کوشش کی نا تو یہ سارا کلام وہاں پہنچاؤں گی جہاں سے پڑنے والے دو جوتے تمہارے سر کی ساری کھجلی اجاڑ دیں گے۔سمجھے!"

اب کی بار سالک پاشا نے بآواز بلند ہنسنے سے اجتناب کیا تھا۔یہ لڑکی کیا شے تھی۔اپنی باتوں سے ساری تھکن چن لیتی تھی۔آج تک بھلا کسی سے سالک پاشا سے اس انداز میں گفتگو کی ہو گی۔ تیکھا بولتی تھی، اتنا ہی دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔

وہ موبائل کی اسکرین پر محبت بھری نگاہ ڈالتا اٹھ کی طرف بڑھا۔اپنے کمرے کی کھڑکی کے ٹھنڈے برف شیشے سے پیشانی ٹکائے ناعمہ پاشا نے ٹھہری ساکت نگاہوں سے سالک کو دیکھا تھا۔جس دن عادل پاشا گئے تھے، وہ موقع کی تلاش میں تھیں کہ کبھی بھی ہو سالک سے وہ ماحور کے حوالے سے بات کر مگر وہ ہاتھ ہی نہیں آتا تھا۔آج وہ اگر وقت پر گھر تھا تو انہیں اس چانس کو گنوانا نہیں تھا۔انہوں نے کھڑکی کے پردے برابر کیے اور گرم شال کو کاندھوں کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر اپنے کمرے سے نکل سالک پاشا کے کمرے کا رخ کیا۔مگر پھر کچھ خیال آ پرکچن کی طرف چلی آئیں۔خانساماں کو اس کے اس کی پسند کا ڈنر تیار کرنے کا کہہ کر وہ اگلے چند پل ہتھیلیاں آپس میں مسلتی سالک پاشا کے کمرے



دروازے کے باہر کھڑی تھیں۔آنکھیں بند کر کے انہوں نے ایک بار دل ہی دل میں الفاظ کو ترتیب دیا۔

سالک پاشا اور ان کے رشتے میں اس قدر تکلف تھا کہ اپنے بچوں کی عمر کے عادل پاشا کے بیٹے سے بات کرنے میں ان کے جسم کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ان کی کانپتی انگلیوں نے دروازے پر دستک دی۔اندر سے سالک کی بارعب آواز سنائی دی۔وہ اندر آنے کی اجازت دے رہا تھا۔ناعمہ پاشا نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں بھرا اور اندر داخل ہو گئیں۔سالک غیر متوقع طور پر انہیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔وہ سمجھا تھا خانساماں اس کے لیے کافی لایا ہو گا، جس کی اس وقت اسے شدید طلب تھی۔ ناعمہ پاشا بوجھل اور جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ اس کے کمرے میں کھڑی تھیں۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں بیٹھنے کو کہے یا ہمیشہ کی طرح منہ موڑ لے۔اس گھڑی ان کے چہرے پر ایسی بے چارگی تھی کہ وہ بے ساختہ انہیں کاؤچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر گیا۔خود وہ سپاٹ تاثرات کے ساتھ بیڈ کے کنارے پر ایک گھٹنا اوپر لٹا کر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا۔اس کی استفہامیہ نگاہوں میں اتنی سرد مہری تھی کہ ناعمہ پاشا کا دل بے اختیار اٹھ کر بھاگ جانے کو چاہا، مگر ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"بیٹا۔میں۔مجھے آپ سے آپ کی شادی کے حوالے سے بات کرنی تھی۔"

ہکلاتے لہجے میں ادا ہوئے اس جملے نے سالک پاشا کو طیش دلا دیا۔بھلا اس نے کب انہیں اتنی اجازت دی تھی کہ وہ اس کے ذاتی معاملات پر بات کرنے کے لیے اس کے بیڈ روم تک چلی آئیں۔

"کس حیثیت سے؟" اس نے سرد لہجے میں استفسار کیا۔

"ماں کی حیثیت سے۔" ناعمہ پاشا کی شکستہ آواز بھی اس پر کوئی تاثر چھوڑنے میں ناکام رہی تھی۔

ماہنامہ حنا
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور
مارچ 2019 کا شمارہ "بہار نمبر" شائع ہو گیا ہے
مارچ 2019 کی شمارت کی ایک جھلک
ہر گھر کے لیے ماہنامہ حنا
☆ "دل کا فیصلہ" اُم ایمان کا مکمل ناول،
☆ "سفر جنون" فوزیہ سرور کا مکمل ناول،
☆ "تم میرے پاس رہو" درثمن بلال کا مکمل ناول،
☆ "می رقصم" بشریٰ سیال کا ناولٹ،
☆ "شہر دل کا راستہ" تحسین اختر کا ناولٹ،
☆ "کھل اٹھے گلاب" حنا بشریٰ کا ناولٹ،
☆ آبی ناز، تمثیلہ زاہد، سادیہ چوہدری،
اور سباس گل کے افسانے،
☆ "دل گذیدہ" ام مریم کا سلسلے وار ناول
☆ "پربت کے اس پار کہیں" نایاب جیلانی
کا سلسلے وار ناول اپنے اختتام کے موڑ پر،
اس کے علاوہ
پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشلہ نامہ،
عید کے پکوان، مہندی کے رنگ اور وہ تمام مستقل
سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں
مارچ 2019
کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی
بک اسٹال سے طلب کریں

"ماں۔ کس کی ماں۔ میں نے کب آپ کو ماں بنایا ہے جو مان بھی لوں۔ آپ میرے باپ کی بیوی ہیں۔ وہی رہیں۔" وہ کبھی بھی اتنا بدتمیز نہیں رہا تھا۔ مگر نہ جانے ناعمہ پاشا کو دیکھ کر وہ اپنے اعصاب پر سے کنٹرول کیوں کھونے لگتا تھا۔ دو آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر گود میں رکھے ہاتھوں پر ٹپک گئے۔ وہ رندھی آواز میں بولیں۔

"آپ کی نہ سہی۔ کسی کی ماں تو ہوں نا۔ میں صرف آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں بیٹا۔ آپ کے ابی اس لڑکی کو مروا دیں گے مگر آپ کی بیوی نہیں بننے دیں گے۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے۔ آپ کا نہیں۔ میں ابی کو ہینڈل کرلوں گا۔" وہ بدستور رکھائی سے بولا۔

"نہیں۔ یہ آپ کا نہیں میرا مسئلہ ہے۔ کیونکہ اگر آپ کی شادی ماحور سے کروانے میں کوئی آپ کی مدد کرسکتا ہے تو وہ میں ہی ہوں۔ صرف میں۔"

ان کے ٹھہرے مضبوط لہجے پر سالک پاشا بری طرح چونکا تھا۔ وہ غیر مرئی نقطے کو دیکھتی اسے بالکل بھی حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔ پہلی دفعہ اس نے قدرے نرمی سے ناعمہ پاشا کو دیکھا تھا جن کا چہرہ اس پل شدید اندرونی خلفشار کا مظہر تھا۔

☆☆☆

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ عقیل مغل کب کے بکتے جھکتے اپنی "ضرورت" پوری کرنے کے لیے گھر سے نکل گئے تھے۔ دادی نے انہیں دبا لیا تھا یا یوں کہنا مناسب ہوگا کہ نشے نے عقیل مغل کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک کسی کے مقابل ٹک سکیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ سب بہن بھائی دادی کو گھیر کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ سبھی جاننا چاہتے تھے کہ وہ کون تھیں اور اب تک کہاں تھیں۔ رائنہ کو بھی یہ تجسس مارے ڈال رہا تھا۔ وہ تو عاقب بھائی کی منتیں کرتی رہی کہ آج کی رات اسے ماحور کے پاس چھوڑ جائیں مگر دادی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"اے مینڈکی۔ چل اپنے گھر چل۔ میاں اکیلا چھوڑ کر یہاں رہنے کی تیری بھلا۔ تک کیا لو بھلا بتاؤ۔ ساس بھی ایسی دیوانی ہیں کہ ساری دیکھ کر گئیں اور اب بہورانی کا جی دوسرا حصہ کو مچل رہا ہے۔ چل شاوا نکل لے اب۔ صبح کو گی نا تو ساری ریل تیری یہ سہیلی چلا دے گی تیر لیے۔"

عاقب بھائی کا ہنسی برداشت کرنے کے میں منہ سرخ انار ہو گیا تھا۔ جبکہ یہ سب بہن بھائی کوئی تکلف نہیں کر رہے تھے۔ کھل کر ہنس رہے تھے۔ رائنہ منہ پھلاتی اور پیر پٹختی چلی گئی تھی مگر جاتے دادی کو کہنا نہیں بھولی۔

"دادی۔ ساری باتیں نہ سنانا۔ کل جب بھی آؤں گی تب کے لیے کچھ رکھ لیں۔ پلیز۔"

"چل ہٹ۔ مینڈکی!" دادی نے لاپ سے ہاتھ جھٹکا۔ عاقب بھائی کھینچتے کھانچتے بیوی گئے۔

اب وہ تھے اور ان کے بیچوں بیچ صوفے ٹیک لگائے آرام دہ حالت میں بیٹھی دادی زونی، ماحور کی گود میں سر رکھے زبردستی جا کوشش میں نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ جنت دادی دائیں پہلو سے ٹک کر بیٹھی تھی۔ وہ کم سخن تھی مگر بھی بے حد تھی۔ پہلی بار کوئی قریبی رشتہ دیکھا تھا لیے ایکسائیٹڈ تھی۔ سیف اور ریان ایک دوسر ٹانگوں میں قینچی کی صورت ٹانگیں پھنسائے نیم تھے۔

"میں تم لوگوں کے باپ کی سگی چاچی ہ یہ عقیل میرے ہی ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے۔ تم لو کی دادی زیادہ تر بیمار ہی رہا کرتی تھی اس لیے میرے کمرے میں گھسا رہتا تھا۔ میرے ہی سے کھانا کھاتا تھا۔ دو ہی بھائی تھے یہ۔ تمہارا بیبا بچہ تھا جبکہ یہ شروع سے ہی شرارتی اور منچلا جوں بڑا ہوتا گیا توں توں اس کے مزاج میں غ لاپروائی کا عنصر بڑھتا گیا مگر پھر بھی مجھ سے ا



بہت پیار تھا۔ اس کی شادی کی ساری تیاری میں نے خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ تُو چھوٹی سی تھی جب میرے دونوں بیٹے کینیڈا سیٹ ہوگئے تو مجھے بھی وہیں اپنے پاس بلا لیا۔ بس پھر رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی خبر گیری سے بھی گئے۔ خطوں سے ٹیلی فون کال پر آئے اور پھر کالوں کا بھی کال پڑ گیا۔ تُو چھوٹی سی تھی جب میں بیٹوں کے پاس گئی تھی۔" انہوں نے ماحور کی ٹھوڑی کو چھوا "اور اب بڑھاپا آ گیا۔ سوچا کہیں موت بھی گوروں کے بیچ نہ آجائے۔ اس لیے واپس آ گئی ہوں۔ بیٹے بھی کچھ عرصے میں کوشش کر کے شفٹ ہو جائیں گے۔ مگر یہاں آ کر اپنے گھر کا کباڑ دیکھ کر ہوش ہی اڑ گئے۔ خالی ڈھنڈار گھر۔ چھت والے پنکھے تک اتار دیے اس عقیل بے حیا نے۔ مجھے پڑوس سے پتا چلا کہ عقیل ہر دوسرے مہینے میرے گھر میں گھستا تھا اور واپسی پر اس کے ہاتھ میں میرے گھر کی کوئی بھی چیز ہوتی تھی۔ محلے والے پوچھتے تھے تو بولتا تھا کہ چاچی چابیاں دے کر گئی ہوئی ہے۔ باہر کینیڈا میں حالات بہت خراب ہیں اس کے بیٹوں کے، اس لیے مجھ سے کہہ کر کوئی نہ کوئی چیز بکوا دیتی ہے اور میں پیسے اسے بھجوا دیتا ہوں۔ بتاؤ بھلا۔ ایسا پائے کا ایکٹر چور بھی نہ دیکھا ہوگا کسی نے۔"

دادی کی باتیں سن کر ماحور متاسفانہ ہنسی۔ اس نے گود میں سر رکھ کر لیٹے زونی کو دیکھا تو وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ دوبارہ دادی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اب جب تک میں اپنا نقصان اس کی نشے کی ماری ہڈیوں سے پورا نہ کراؤں گی، اپنے گھر جا کر رہنے والی نہیں میں۔ سالوں ملک سے باہر گزار دیے۔ واپس آ کر تم لوگوں کے حالات کا ادھر ادھر سے سنا تھا۔ اس عقیل نے تو ہر چیز کی شرم حیا اتار کر بیچ کھائی ہے۔ اب میں کچھ عرصہ یہیں گزاروں گی۔ اس کے کس بل نکالوں گی اور ذرا تم لوگوں کا بھی دھیان رکھ لوں گی۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے لڑکی؟"

وہ ہر سوال کا خود ہی جواب دے کر آخری سوال ماحور سے کر رہی تھیں۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ ایک زخم خوردہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اتری۔

"کاش اب سے کئی سال پہلے بابا نے آپ کے گھر چوریاں کرلی ہوتیں۔ اسی بہانے آپ تب ہی ہمارے گھر آ جاتیں تو زندگی کے چھوٹے بڑے دکھ جھیلنے آسان ہو جاتے۔"

لاؤنج میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ دادی نے سر جھکا کر بڑی اذیت سے اس کی باتوں پر آنکھیں میچیں۔ اب وہ اسے کیا بتاتیں کہ وہاں وہ اپنے بیٹوں کی دست نگر کن حالوں میں تھیں اور یہاں آنے کی وجوہات کیا بنیں۔ انہیں تو ان سب بہن بھائیوں پر ترس آ رہا تھا جو حالات کے تھپیڑے کھا کھا کر کیسے تلخ ہو گئے تھے۔ نہ ماں نہ باپ۔ دونوں رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی کیسی لاچاری اور بے بسی۔

اتنے وقت میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بچے ماضی میں رونما ہونے والے واقعات سے انجان تھے۔ جن سے وہ خود جزئیات سمیت واقف تھیں۔

☆☆☆

آفس میں ٹیبل کی دراز میں کافی دیر سے منہ گھسائے بیٹھی ابرش کی کھڑپٹر ماحور کی برداشت سے باہر ہو چلی تھی۔ وہ فائلز میں الجھی کب سے ساتھ ساتھ پوچھے جا رہی تھی کہ وہ کیا ڈھونڈ رہی ہے؟ مگر اس کا ایک ہی جواب۔ "بتاتی ہوں۔ ابھی بتاتی ہوں۔"

ماحور کا دماغ گھوم گیا تھا۔ ساری میز، دراز میں پڑی الم غلم چیزوں بھرتی جا رہی تھی۔ تنگ آ کر وہ اٹھی اور ابرش کے قریب جا کر ایک ہی بار دراز باہر نکالی اور اسے میز پر الٹ کر دونوں بازو سینے پر باندھ کر ابرش کو جتاتی نظروں سے دیکھنے لگی۔ کہنے کا مطلب

تھا "اب سکون ہے؟"
ابرش نے تحیر سے ایک نظر ماحور پر ڈالی اور دوسری میز پر پڑے کیاڑ پر اور تیسرے پل دبی دبی سی چیخ اس کے حلق سے نکلی۔
"یہی ہے۔ مل گئی۔ کب سے اسے ہی تو ڈھونڈ رہی تھی میں۔ ماہی یو آر سمپلی گریٹ۔"
وہ ایک سم کو پکڑے اسے بے تابانہ چومتے ہوئے بولی۔ ماحور نے اپنا ہاتھ پیٹ لیا۔ واپس سیٹ پر آ کر بیٹھتے ہوئے وہ اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"سو پاگل مرے ہوں گے تو ایک تم پیدا ہوئی ہو گی ابرش۔ ایک سم کے لیے تم نے سارا آفس اکھاڑ ڈالا۔ جیسے سم نہ ہو گئی سالک پاشا ہو گیا تمہارا۔"
"یہ....." ابرش نے تالی مارتے ہوئے جوش سے کہا۔ "سالک پاشا ہی سمجھو اسے ماہی۔ سالک پاشا ہی سمجھو۔ اس سم سے میں اسے پٹاؤں گی۔" وہ چٹکی بجا کر بولتی ماحور کو سچ میں پاگل خانے سے بھاگی ہوئی پاگل لگی۔ اس نے پاس پڑا پیپر ویٹ اٹھایا اور اسے دھمکاتے ہوئے بولی۔
"اب اگر تمہارا ارادہ اس سم سے سالک کو کال کرنے کا ہے تو ایک بات لکھ لو کہ تم پٹو گی اور میں تمہارا ساتھ ہرگز نہیں دینے والی۔ سمجھیں۔"
"ہاں سمجھ گئی۔" ابرش نے پلکیں نزاکت سے جھپکاتے ہوئے کہا۔ "تم نہ صرف میرا ساتھ دو گی بلکہ اگر میں پھنسی تو مجھے بچاؤ گی بھی۔ سمجھیں۔"
ماحور نے اس کے اس قدر یقینی انداز میں بولنے پر بے بسی سے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ یہ لڑکی مروائے گی ایک دن۔
"کس کی سم ہے یہ ابرش؟" اس نے کڑے تیوروں سے استفسار کیا۔
"بھیا کی۔" ابرش اب موبائل کا بیک باڈی کور ہٹائے سم ڈال رہی تھی۔ "سڈنی جانے سے پہلے یہی سم تھی ان کے پاس۔ ایک دن ان کے روم کی صفائی کروانے کے دوران میرے ہاتھ لگی تو میں نے رکھ لی۔ آج کام آئے گی یہ شہزادی۔" اس کے کولاڈ سے شہزادی کہنے پر نہ چاہتے ہوئے بھی ماحور کو ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ فکر مند ہو رہی تھی۔
"ابرش میرا خیال ہے کہ تم اپنے نمبر سے کال کر لو۔ کبھی اگر اسے پتا چلا کہ تم اسے ڈسٹرب کرتی تھیں یا میسجز کرتی تھیں تو ہو سکتا ہے وہ تمہارے بارے میں غلط سوچے۔"
اس کی بات میں وزن ہونے کے باوجود ابرش نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"جیسے اپنے نمبر سے کروں گی تو وہ مجھے موبائل میں تول دے گا۔ کھڑوس ہے ایک نمبر کا۔ سنگ ہے دو نمبر کا اور ایسے بندے کو پتا نہیں لگنا چاہیے نمبر کا۔ کچھ سمجھیں؟"
"تمہیں اگر اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو پھر دہانے میں منہ دینے کا تو دو پھر۔" ماحور دونوں ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے بولی۔
"تم اپنے سیل سے ذرا مجھے کوئی اچھی پھڑکتی ہوئی غزل بھیجو۔ اس نمبر پر۔ میں وہی فارورڈ کروں گی اسے۔ جلدی ذرا۔" یہ کہہ کر ابرش اس سم کا نمبر نوٹ کروانے لگی۔ ماحور نے اس کی پر ماتم کرتے ہوئے اسے، اسی کی بھیجی ہوئی غزلیں اور شعر بھیج دیے۔ اب یہ اتفاق کہ ابرش اسی غزل کو سالک پاشا کے نمبر پر فارورڈ کر ماحور نے مومن کا نمبر جان کر سالک پاشا کو بھیجی محض دو سے تین منٹ گزرے ہوں گے، پاشا نے میسج کے جواب میں کال بیک کر دی ابرش جو ریلیکس پوزیشن میں ٹھوڑی میز پر ٹکائے سامنے پھیلا کر سیل فون کی اسکرین کو محبوب کا چہرہ کر بڑی پریت سے دیکھے جا رہی تھی، یک دم اچھلی گویا سالک پاشا کی کال نہیں، وہ خود سے باہر ٹپک پڑا ہو۔ سٹپٹا کر اس نے موبائل ماحور گود میں اچھال دیا۔
ماحور چار سو والٹ کا جھٹکا کھا کر اٹھ کھڑی اور موبائل واپس ابرش کی طرف اچھالا۔ ابرش بمشکل کیچ کر کے واپس اسے تھماتے ہوئے کال پک کرنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں ایک گھنٹیاں ختم ہونے کے بعد دوبارہ کال آنی شروع ہو چکی تھی۔
"ہرگز نہیں۔ تم خود پک کرو۔" ماحور نے صاف انکار کیا۔ ابرش نے کال منقطع کر دی مگر دوسری طرف سے دوبارہ کال کر دی گئی تھی۔ وہ دونوں بری پھنسی تھیں۔ ابرش میں ہمت نہیں تھی کہ وہ بات کر پاتی اور ماحور کے پاس جواز نہیں تھا۔ اسی دھکم پیل میں نہ جانے کیسے کال پک ہو گئی اور موبائل ماحور کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں کی سانسیں تھم گئیں۔ ابرش اسے دونوں ہاتھوں سے "کام ڈاؤن" کا اشارہ کر رہی تھی جبکہ ماحور اسے خفگی سے دیکھتی گردن پر چھری کی طرح انگلی پھیرتے ہوئے کڑے نتائج کی دھمکی دے رہی تھی۔ اسے ایک ہی حل سوجھا اور اس نے موبائل کان سے لگا کر شستہ انگریزی میں کہا۔
"دا نمبر یو ہیو ڈائیلڈ، از ناٹ آنسرنگ ایٹ دا مومنٹ۔ پلیز ٹرائی لیٹر۔"
ساتھ ہی ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے تیزی سے کال کاٹی تھی مگر کاٹنے سے پہلے اس کی سماعت نے دوسری طرف سے ابھرتا ایک جاندار قہقہہ ضرور سنا تھا۔ یعنی سالک پاشا کو "ماموں" بنانے کی جو کوشش کی گئی تھی وہ ناکام ٹھہری تھی۔ اس کے باوجود وہ دونوں دھپ سے اپنی اپنی سیٹس پر یوں بیٹھی تھیں جیسے شکنجے سے جان نکلی ہو۔
"ابرش کی بچی اب اگر تم نے میرے سامنے اسے کال کرنے کی یا میسج کرنے کی کوشش بھی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"
"ہرگز نہیں یار ماہی۔ سوچنا بھی مت۔ اب میں اسے اکیلے میں ہی کروں گی۔ پکا۔"
ابرش نے ڈن کرتے ہوئے اسے تسلی دی۔ ساتھ ہی مسکراہٹ چھپانے کے لیے میز پر سے فائل اٹھا کر اپنے چہرے کے آگے کر لی۔ ماحور ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اس لڑکی کی دیوانگی کا کوئی حل نہیں تھا۔

☆☆☆

بڑی سی گلاس وال کے سامنے ایک کہنی اونچی کیے شیشے کے ساتھ لگائے اور دوسرے ہاتھ میں تھامے موبائل کو دیکھتے ہوئے اس کا بس نہیں تھا کہ وہ ساری کائنات کو اپنی خوشی میں شامل کر لے۔ سرشاری اس کی آنکھوں میں جوت بن کر چمک رہی تھی۔ وہ جو ایک مدت سے خول میں بند ہو چکا تھا، اسے توڑ کر محبت کی حسین رہگزر پر بہت دور نکل آیا تھا۔
ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ مگن سا کام میں مصروف تھا تو اس کے سیل پر میسج کی بیپ ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دھیان میں میسج اوپن کیا۔ ایک انجان نمبر سے ہو بہو وہی غزل اسے بھیجی گئی تھی جو محض دو دن پہلے ماحور اپنے نمبر سے بھیج چکی تھی۔ اس کا روم روم جھوم اٹھا۔ گلے کے ہزارویں حصے میں اسے خیال گزرا کہ ماحور اسے کسی اور نمبر سے پیغام بھیج کر اس کی ٹرک اسی پر الٹ رہی ہے اور جب کال ملانے پر اس نے بے حد فارمل لہجے میں کسی کو کہتے سنا۔ "دا نمبر یو ہیو ڈائلڈ از ناٹ آنسرنگ ایٹ دا مومنٹ۔ پلیز ٹرائی لیٹر۔" اس کے ساتھ ہی وہ چھت پھاڑ قہقہہ لگاتا ہنستا چلا گیا۔ یہ ہو بہو ماحور کی آواز تھی۔ بھلا اسے پہچاننے میں غلطی کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ تو اب اس کی روح میں بستی تھی۔ اس کی ہر ادا اسے ازبر تھی۔ تو آواز کیسے نہ پہچانتا۔ کال کٹ چکی تھی اور وہ جیسے ہواؤں میں تھا۔ اب تو کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ ماحور بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کی منزل ہی اس کے ہم قدم تھی۔ اس نے فوراً یہ نمبر اپنے کانٹیکٹس میں سیو کیا۔ اب اسے ماحور سے اسی نمبر پر بات کرنا تھی۔
وہ آنکھیں بند کیے اسے ہی سوچ رہا تھا جب ڈور ناک کرنے کے بعد مومن نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ اس نے پلٹ کر خوش دلی سے اسے اندر آنے کی اجازت دی اور موبائل ٹیبل پر رکھ دیا۔ خود بھی دونوں ہاتھوں سے کالر جھٹکتا سیٹ پر بیٹھ

گیا۔

"خیریت سر۔ آج تو آپ کا موڈ بے حد فروٹی ہے۔" مومن کے استفسار پر اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"یہ فروٹی کیا ہے؟"

"میری اپنی اصطلاح ہے۔ اگر آف موڈ میں ہوتے تو میں کھٹا میٹھا کہتا۔ اگر اداس ہوتے تو سالٹی کہتا، لیکن چونکہ آپ اس وقت بے حد خوش ہیں اس لیے میری نظر میں یہ فروٹی موڈ ہے۔"

"ہاہاہا۔" سالک کھل کر ہنسا اور بولا۔ "تم بھی عجیب شے ہو مومن۔ اچھا اگر میرا موڈ تمہارے دادا جیسا ہوتا تو کیا کہتے؟" مومن کی ہر دوسری بات میں دادا کا تذکرہ ہوا کرتا تھا اس لیے اب سالک کو بھی غائبانہ آشنائی تو ہو ہی چکی تھی۔

"ان کا موڈ تو کالئیل ہے سر۔ ہر ذائقہ، ہر رنگ، ہر خوشبو بیک وقت۔ وہ تو گرو ہیں سر۔ گرو۔"

"سوپر۔" وہ ایک بار پھر توصیفی انداز میں ہنسا۔ "ویسے تمہاری سنگت میں کوئی بھی بور نہیں ہو سکتا مومن۔ تم اپنی باتوں سے باندھ لیتے ہو۔"

"وہ بھی یہی کہتی ہے سر۔" بے اختیار اس کی زبان سے پھسلا۔

"آں ہاں۔ وہ کون بھئی۔ مجھے نہیں بتایا اب تک؟"

"آں۔ مجھے لگا آپ خاصے سمجھ دار ہیں۔ اندازہ ہو گیا ہوگا؟" اس کے لطیف طنز پر وہ ہنس دیا۔ اب تو ہنسی بات بے بات اس کے ہونٹوں سے پھوٹتی تھی۔

"میری سمجھ بوجھ تو لمبی چھٹی پر جا چکی مومن تراب۔ اگر کسی مرد کی ذہانت کو عورت مہمیز کر سکتی ہے تو اس کی عقل ماؤف میں کرنے کی صلاحیت بھی عورت ہی رکھتی ہے اور یہ لڑکی۔ یہ لڑکی ماہ۔" اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتا، آفس کا دروازہ جھٹکے سے کھلا تھا اور عادل پاشا سپاٹ تاثرات لیے اندر داخل ہوئے۔ مومن فوراً سیٹ چھوڑ کر الرٹ سا کھڑا ہو گیا۔ سالک پاشا بھی باپ کو دیکھ کر ایک پل کو حیران ہوا تھا مگر پھر فوراً اپنی جگہ چھوڑتا، ٹیبل کی سائڈ سے گھوم کر سامنے کھڑا ہوا۔ عادل پاشا ناک کی سیدھ میں چلتے ان کے روبرو آئے اور تشنی انداز میں بیٹے کو گلے سے لگا کر جانچتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"کیسے ہو بیٹا۔ مجھے کافی دن لگ گئے۔ امید ہے سب کچھ ٹھیک جا رہا ہوگا۔"

"فائن ابی۔ اور سب کچھ اوکے ہے۔ آپ کب آئے۔ آئی مین فلائٹ سے سیدھا آفس آ رہے ہیں یا گھر گئے تھے؟"

سالک پاشا کے انداز میں اس قدر ٹھہراؤ تھا کہ مومن ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔ دونوں باپ بیٹے اسے ضرورت سے زیادہ فارمل محسوس ہوئے۔

"نہیں۔ سیدھا آفس آیا ہوں۔ ایک دو امپارٹینٹ کام تھے، سوچا نبٹا کر ایک ہی بار گھر جاؤں تھوڑا ریسٹ لوں۔ تم بھی شام میں جلدی آ جانا۔ بہت ضروری کام ہیں۔ جو میں مزید پینڈنگ میں نہیں ڈال سکتا۔" سرد اور گہرے لہجے میں کہتے وہ سالک کو باور کرا رہے تھے کہ وہ کچھ بھی نہیں بھولے۔ سالک کے ماتھے کی رگ پھڑک کر رہ گئی۔ وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔ اسی پل اس کا دھیان مومن کی جانب گیا تو چونک کر تعارف کروانے لگا۔

"ابی۔ میٹ ہم۔ مومن تراب۔ آپ سے ذکر کیا تھا میں نے۔ اتفاق سے آپ کی ابھی تک تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکی مومن سے۔ یہ تراب الحسن انکل کے بیٹے ہیں۔ آپ کے فرینڈ ہوا کرتے تھے وہ۔"

عادل پاشا نے بغور مومن کو دیکھا۔ جانچا اور آنکھیں سکوڑ کر، دونوں ہاتھ کوٹ کی پاکٹس میں ڈالتے ہوئے بولے۔

"مرے ہوئے لوگوں کو میں دوست نہیں رکھتا اور زندوں کے ساتھ میں دوستی نہیں کرتا، محض تعلق نبھاتا ہوں۔ اینی ویز ینگ مین۔ تم سے پھر ملاقات ہوگی۔" وہ ایک استہزائیہ نگاہ مومن تراب پر



ڈال کر ایڑیوں کے بل گھومے اور آفس سے باہر چلے گئے۔ مومن تراب تنے اعصاب کے ساتھ ان کی پشت دیکھتا رہ گیا۔ اسے بے حد ہتک کا احساس ہوا تھا۔ جبکہ سالک پاشا اس صورت حال میں عجیب سی کیفیت کا شکار چپ کا چپ کھڑا رہ گیا۔ وہ اپنے ایمپلائز کی عزتِ نفس کا بے حد خیال رکھتا تھا اور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ مومن تراب کی عزتِ نفس مجروح ہوئی ہے مگر اس گھڑی اسے سمجھائی نہیں دیا کہ وہ اس سے کیا کہے۔

☆☆☆

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے کافی شاپ پر بیٹھا ماحور کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ ہر شے زہر لگ رہی تھی۔ عادل پاشا نے آفس میں جس طرح سے اس کی توہین کی تھی، ایک پل کو تو جی چاہا کہ لات مارے اس نوکری کو مگر ان کے جانے کے بعد سالک پاشا نے اس سے مناسب الفاظ میں اپنے والد کے رویے کی معذرت کی تھی۔ اس کے باوجود دل سے ملال کم نہیں ہوا تھا۔ جو رعونت اسے عادل پاشا کی آنکھوں میں دکھائی دی تھی وہ رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ اس نے علی الصباح گھر سے نکلنے سے پہلے ماحور کو ٹیکسٹ کر دیا تھا کہ آفس ٹائم کے بعد کافی شاپ پر ملے۔ وہ دونوں اکثر یہیں ملا کرتے تھے مگر اب ماحور کو آنے میں دیر ہو رہی تھی اور اس کا پہلے سے خراب مزاج مزید بگڑ رہا تھا۔ اس نے میز پر رکھا پانی کا گلاس ایک سپ میں خالی کر کے خود کو نارمل کرنے کی سعی کی۔ تبھی اسے دور سے ماحور لنگڑاتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ وہ خشمگیں نظروں سے اسے دیکھتا رہا، حتیٰ کہ وہ دھپ کر کے اس کے سامنے کرسی پر آ بیٹھی۔

"سوری۔ میں لیٹ ہو گئی۔" اس نے تھکی تھکی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ چہرہ دمک رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ مگر مومن کے دماغ پر غصہ اس قدر حاوی تھا کہ وجہ پوچھنے کے بجائے دیر سے آنے پر ناراض ہونے لگا۔

"کہا نا سوری۔ آفس میں کام بہت تھا۔ پھر ٹریفک اور اس سے بڑی مصیبت میرا جوتا۔" وہ اس کے غصے سے خائف ہوتے ہوئے بولی۔

"بہانے مت بناؤ ماہی۔ صاف کہو کہ آنا نہیں چاہتی تھیں۔ یہ تو میں ہی پاگل ہوں جو پیچھے پڑا رہتا ہوں تمہارے۔" وہ ہنوز منہ پھلائے درشتی سے بولا۔

"ایسا بھلا ممکن ہے مومن کہ میرا دل تم سے ملنے کو نہ کرے۔ کس بات پر خفا ہو۔ کاہے کی ناراضی ہے؟" اس نے رسان سے پوچھا۔

"میرا دماغ نہیں خراب ماہی کہ کہیں کا غصہ کہیں پر نکالوں۔ تمہیں میری پروا نہیں ہے۔ تم محض اپنی سہولت دیکھتی ہو۔ یہ کبھی نہیں سوچتیں کہ میرا دل کیا چاہتا ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے مومن۔ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں اگر پروانہ کرتی تو تمہارے ایک ہی بار کہنے پر یہاں چلی نہ آتی۔ جب کہ تم جانتے ہو کہ مجھے گھر پہنچنا ہوتا ہے۔"

"ہاں تو نہ آتی نا۔ کیا کہہ لینا تھا میں نے۔ میں کہہ ہی کیا سکتا ہوں۔ اوقات ہے میری؟"

"میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ جب تمہارا موڈ ٹھیک ہو جائے تو مجھے کال کر لینا۔" وہ بیگ کندھے پر ڈالتی کھڑی ہونے لگی۔ انداز سست تھا کہ مومن شاید اپنے غلط رویے کا احساس کرتے اسے روک لے۔ مگر وہ چیخ کر بولا۔

"آپ جناب میری کال اٹھاتی ہی کہاں ہیں۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں تمہارے لیے بیٹھا خوار ہو رہا ہوں اور تم ہو کہ مزے سے ٹہلتی آ رہی ہو۔"

"میں ٹہلتی نہیں آ رہی تھی مومن۔ میرا جوتا ٹوٹ گیا ہے اور اس کی وجہ سے میں نے اپنے اسٹاپ کی بس مس کر دی اس لیے آفس سے یہاں تک پیدل لنگڑاتی ہوئی آئی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئی اور جلدی سے مڑ کر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا تھا،

جسے مومن کے سامنے ہرگز نہیں بہانا تھا اسے۔ اس کی بات پر مومن تراب پل بھر کو ساکت رہ گیا۔ پھر سر دونوں ہاتھوں میں گرا کر خود کو جی ہی جی میں جی بھر کر کوسا اف! عادل پاشا پر آئے غصے نے اس کی عقل اتنی سلب کر لی تھی کہ ماحور کو لنگڑاتے ہوئے آتا دیکھ کر بھی اسے خیال نہیں آیا کہ وہ ایسے کیوں چل رہی ہے۔ اب حسب معمول وہ تولے بنا بول بیٹھا تھا۔ ٹیبل پر پڑا گلاس اگر کانچ کا نہ ہوتا تو وہ لازمی اپنے سر پر دے مارتا۔ پیشانی کو دو بار ہلکے ہلکے مکے مارتا وہ تیزی سے اٹھا اور ماحور کے پیچھے لپکا۔ اس کا ٹوٹا ہوا کیوں شود یکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا۔

حالت تو ان کی ویسے بھی کافی خستہ تھی مگر وہ ان ہی سے کام چلا رہی تھی۔ وہ سیٹی بجانے کے انداز میں سانس خارج کرتا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں بالکل خاموشی سے چلتے فٹ پاتھ پر ہو گئے۔ نہ ماحور نے اس کی طرف دیکھا اور نہ اس نے اسے بلانے کی غلطی کی۔ کچھ آگے جا کر موڑ مڑتے ہی جوتوں کی دکان تھی۔ قریب آنے پر اس نے یک دم ماحور کا ہاتھ تھاما اور بغیر اسے سنبھلنے کا موقع دیے وہ اسے لیے اندر داخل ہو گیا۔ ایک سیلز مین خیر مقدمی مسکراہٹ سجائے تیزی سے ان کی جانب بڑھا۔

"السلام علیکم۔ مجھے اپنی مسز کے لیے اچھے سے فارمل شوز دکھایے۔" وہ سیلز مین سے کہتا اسے لیے کنٹر سیٹ پر آ بیٹھا۔ سیلز مین سائز پوچھ کر تیزی سے واپس مڑ گیا۔ ماحور نے جھٹک کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالا اور دھیمی آواز میں غراتے ہوئے بولی۔

"یہ کیا تماشا ہے۔ مجھے نہیں لینا کوئی جوتا شوتا اور تم نے کس کھاتے میں مجھے بیوی کہا اپنی۔ دماغ چل گیا ہے کیا؟"

"دادا کہتے ہیں میرے پاس دماغ نامی آئٹم ہے ہی نہیں۔ اس لیے اسے کیا چلانا اور کیا بٹھانا۔ باقی رہ گئی مسز کہنے والی بات تو..... تو۔" مومن نے اس کی طرف رخ پھیر کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، اس کا لہجہ بھاری ہوا۔ ماحور کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "تو قسم لے لو مزا آ گیا ایسا کہہ کر ہوئے۔ مجھے بڑا تجسس تھا کہ وہ کیا لطف ہوتا ہو جب کوئی کسی حسین دوشیزہ کو اپنی مسز بلاتا ہوگا۔ پتا چلا کیسا سواد آتا ہے۔ واہ۔" اب وہ نارمل لہجے میں چٹخارہ بھرتے کہہ رہا تھا۔ ماحور نے بیگ کھینچ کر اس کی ٹانگ پر دے مارا۔

سیلز مین جوتوں کے ڈبے اٹھائے ان کے قریب چلا آیا اور ایک ایک کر کے ماحور کے آگے رکھنے لگا۔ وہ بادل ناخواستہ انہیں پہن پہن کر چیک کرنے لگی۔ مومن نے خود ہی دو نفیس سے ڈیزائن والے شوز پسند کیے اور انہیں پیک کرنے کا کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بالکل کسی ذمہ دار شوہر کی طرح اسے اپنی پشت سے ڈھانپے ساتھ ساتھ لیے وہ کیش کاؤنٹر پر بل پے کرنے کے بعد باہر نکل آئے۔ ایک باکس میں سے جوتے نکال کر مومن نے اسی وقت ماحور کے پیروں میں رکھے تا کہ وہ ابھی ہی انہیں پہن سکے۔ اپنے پاؤں جوتے میں ڈالتے بے اختیار اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو لڑھک کر گالوں پر پھسل گئے۔ اتنی پروا۔ اتنا تردد۔ وہ بھی اس کے لیے۔ اسے خواب سا لگ رہا تھا سب۔ مومن نے بلیک کورٹ شوز میں دھنسے اس کے سفید پیروں سے نگاہ چراتے ہوئے اس کی پانی بھری نگاہوں میں جھانکا۔

"دھت تیرے کی۔ بندہ کس کس طرف سے دامن بچائے۔"

اس کی گرے آنکھیں آنسوؤں سے دھل کر کانچ کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ تھوڑا بگڑتے ہوئے بولا۔

"کیوں رو رہی ہو۔ مرا نہیں ہوں ابھی۔ اب اگر یہ چاہ رہی ہو کہ تمہارے آنسو چن لوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر تم نے یہی جوتا اٹھا کر مار دینا ہے مجھے۔"

"مجھے گھر جانا ہے۔ ان جوتوں کی قیمت بتا دو۔ میں ادا کر دوں۔" وہ اس کی بات نظر انداز کرتی



پوری سنجیدگی سے بولی۔ مومن چڑ گیا۔

"کیوں۔ تم کیوں ادا کرو گی۔ کون ہوں میں ماہی؟ صرف انگوٹھی پہنانی باقی ہے ورنہ میں تمہیں فی الوقت اپنی منگیتر اور آنے والے وقت میں اپنی مسز ہی سمجھتا ہوں۔ تو کیا میں اپنی منگیتر سے پیسے لوں گا۔ شرم آتی ہے؟ ہاں دادا ہوتے تو ضرور لے لیتے۔" اس نے ایسا کہہ کر ماحور کو ہنسانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مگر وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔ وہ خاموشی سے ایک طرف چل دی۔ پتا نہیں دل کیوں بھر بھر آ رہا تھا۔ مومن اس کی ناراضی کی وجہ اپنے رویے کو گردانتے ہوئے صفائی دینے لگا۔

"سوری ماہی۔ میں غصے میں تھا۔ اوپر سے تم نے آنے میں اتنی دیر کر دی۔ ساری فرسٹریشن تم پر نکل گئی۔ سو سوری۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ شرمندہ سا اسے بولنے پر اکسا رہا تھا مگر وہ اسی کیفیت میں سپاٹ سی چلتی چلی جا رہی تھی۔ تنگ آ کر وہ ایک دم اس کے سامنے آ کھڑا ہو۔ ماحور کو اگلے ہی پل رک جانا پڑا ورنہ ٹکرا جاتی۔

"میری بات کا جواب دو ماہی۔ ورنہ میں نہ خود ہلوں گا یہاں سے نہ تمہیں جانے دوں گا۔"

"مومن تراب۔ آپ نے تو اپنی فرسٹریشن نکال لی۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ کوئی ہے ایسا شخص جس پر میں اپنی کھولن نکال لوں۔"

"نکالتی تو ہو۔" ماحور کے ایسا کہنے پر وہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے بولا۔ "مجھ پر۔"

دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور پھر یک بیک دونوں ہی ہنس دیے۔

"اب بتاؤ۔ کیا ہوا۔ کیوں اتنے غصے میں تھے؟" ماحور نے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے کہا۔ مومن نے عادل پاشا کا رویہ اور گفتگو لفظ بہ لفظ بتا دی۔ اسے سچ میں بے حد افسوس ہوا۔ کبھی کبھار بااختیار انسان سب سے زیادہ بے اختیار ہو جاتا ہے، کیونکہ جس کا اپنے لب و لہجے پر بس نہیں، اس سے زیادہ کمزور انسان کون ہوگا بھلا؟

"حیرت ہوتی ہے مجھے یہ سوچ کر کہ سر سالک جیسا فرینڈلی اور ہمبل انسان ان کا بیٹا ہے۔ میں اپنے بابا کے حوالے سے بہت پکی ہوں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا ان کی دوستی کو بے مول کرنا۔ دادا بتاتے ہیں کہ میرے بابا نے سر عادل کی تب مدد کی تھی جب یہ بے حد مشکل میں گھرے تھے۔ ہمارے ہی گھر کے اوپر والے پورشن کے دو کمرے تقریباً آٹھ ماہ تک ان کے زیر استعمال رہ چکے ہیں اور آج یہ ایسے بن رہے تھے جیسے میرے بابا پر الٹا ان کے احسانات ہوں۔"

ماحور جواباً کچھ نہیں بولی۔ اس کے چہرے پر دکھ کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ مومن نے اس کی طرف دیکھا تو دل کو کچھ ہوا۔ اسے تاسف ہوا کہ محض اس کی وجہ سے ماحور افسردہ ہو گئی تھی۔ پہلے بلاوجہ ناراضی دکھائی اور بعد میں یہ سب بتا کے اس کا دل دکھا دیا۔ وہ تو ہمیشہ سے مشکلات اور مصائب میں گھری رہی ہے، بھلا وہ اس پر اپنی تکلیف کا بوجھ کیوں ڈال رہا ہے۔ اس نے تو ہمیشہ اسے خوش رکھنے کا عہد باندھا تھا۔ ساتھ چلتے مومن نے خود کو ملامت کیا اور پھر شرارت سے اپنا کندھا ماحور کے کندھے سے ٹکرا کر اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ اس طرح کی حرکت کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی سو لڑکھڑا کر گرنے ہی لگی تھی کہ مومن نے جھٹ اس کا بازو تھام لیا اور ہنس دیا۔ ماحور نے اسے گھورا اور جواباً دونوں ہاتھوں سے اسے دھکا دے دیا۔ وہ الرٹ کھڑا تھا، ٹس سے مس نا ہوا بلکہ مزید ہنستے ہوئے اسے چڑانے لگا۔ ماحور نے دونوں آنکھیں سکوڑ کر چند ثانیے اسے گھورا اور نئے نئے پہنے کورٹ شوز سے اس کا جاگرز میں مقید پاؤں کچل دیا۔ جواب میں مومن نے اتنی بلند چیخ ماری کہ ماحور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتی اردگرد سے نظر چراتی تیزی سے اس سے کچھ فاصلے پر ہو کر چلنے لگی۔ مومن اس کے تیور دیکھ کر ہنسی دباتے ہوئے شرافت سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ذرا آگے جا کر ایک

گھر کے تھڑے پر اسٹاپو بنا ہوا تھا۔ شاید بچے کھیلتا چھوڑ گئے تھے۔ مومن نے بغور دیکھا اور اگلے ہی پل دونوں ہاتھ جینز کی پاکٹس میں پھنسائے اسٹاپو کے خانے پھلانگ رہا تھا۔ ماحور حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"اب تمہاری باری ماہی۔" سامنے کھڑے رہتے ہوئے اس نے ہاتھ سے ماحور کو کھیلنے کا اشارہ کیا۔

"پاگل ہو کیا۔ مجھے نہیں کھیلنا آتا۔ میں نے بچپن میں بھی کبھی نہیں کھیلا۔" ماحور بدکی۔

"جیسے میں نے کیا ہے، ویسے ہی کرنا ہے سمپل۔ آؤ نا۔"

ماحور نے اب انکار نہیں کیا بلکہ اپنا بیگ مضبوطی سے تھامتی وہ بالکل مومن کے انداز میں اسٹاپو کے خانے پھلانگ رہی تھی۔ خوشی اور جوش نے یک دم اس کی رنگت سرخ کردی تھی۔ اسے ایسا کرنے میں بے حد لطف آیا تھا۔ یوں لگا جیسے ٹینشن سے ریلیف ملا ہو۔ چند ساعتوں بعد وہ دونوں باری باری آگے پیچھے خانے پھلانگتے دوبارہ واپس جاتے اور پھر یہی عمل دہراتے۔ دونوں کے قہقہے بے فکرے اور نکھرے ہوئے تھے۔ مومن، ماحور کو ہنسانے کے گر جان گیا تھا۔ وہ اس کی خوشی میں خوش رہنے کی ادا سیکھ گیا تھا۔

☆☆☆

عادل پاشا آفس کی ریوالونگ چیئر پر دھیرے دھیرے جھولتے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ بایاں ہاتھ مسلسل پیپر ویٹ گھمائے جا رہا تھا۔ سامنے کچھ ڈاکومنٹس کھلے پڑے تھے جن کے اوپر دھرا پین بھی یونہی کھلا رکھ دیا گیا تھا۔ سوچیں مستقل ایک ہی مسئلے کے گرد گھوم رہی تھیں۔ وہ آج ہی کراچی سے واپس لوٹے تھے اور سیدھے آفس چلے آئے تھے۔ ان کا دو دن کا پروگرام کچھ ضروری کاموں کی وجہ سے کئی دن پر چلا گیا تھا۔ مگر اتنی مصروفیت میں بھی ان کا ذہن سالک پاشا کے رویے اور اس کی ضد سے نہیں ہٹا تھا۔ جب جب انہیں سالک کا دوٹوک انداز لب ولہجہ یاد آتا رہا تب تب انہیں اس انجان لڑ ماحور پر طیش آتا رہا تھا جس کی وجہ سے آج ان کا بی ،ان کے روبرو بولنے کی جرات کر پایا تھا۔ یک ایک خیال آنے پر انہوں نے پیپر ویٹ ہاتھ سے چھوڑا اور موبائل پکڑ کر کسی نمبر پر کال کی۔ دوسری طرف سے فوراً کال ریسیو کرلی گئی تھی۔

"ہاں ایاز۔ ایک کام کہا تھا تمہیں۔ کیا بنا اس کا؟"

دوسری جانب سے ایسا کچھ کہا گیا تھا کہ ان کے ماتھے کی رگیں ابھرنے لگی تھیں اور چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ پڑنے لگا تھا۔ وہ اپنی آواز کو پرسکون رکھتے ہوئے بولے۔

"ہمم۔ یعنی میرا شک درست نکلا۔ ٹھیک ہے ایاز۔ تم مجھ سے آفس میں ملو۔ باقی ڈیٹیلز یہاں آکر ڈسکس ہوں گی۔ سی یو۔"

کال کاٹ دینے کے بعد وہ کھڑے ہوئے انہوں نے پیپر ویٹ تھاما اور اسے پوری طاقت سے سامنے لگے ایل ای ڈی پر مار دینا چاہا مگر اگلی ساعت انہیں ہوش کے ناخن دلا گئی۔ انہیں خود کو کمپوز رکھنا تھا۔ یہ وقت بے وقوفی کرنے کا نہیں تھا۔ عقل مندی سے چال چلنے کا تھا۔ انہیں ایسا کچھ کرنا تھا کہ سالک خود بخود اس لڑکی سے دستبردار ہو جائے اور ناعمہ کو بھی احساس نہ ہونے پائے کہ وہ اس لڑکی کی اصلیت جان گئے ہیں۔ وہ واپس سیٹ پر بیٹھے اور لمبے لمبے سانس لے کر خود کو پرسکون کرنے لگے۔ دھیان اس لڑکے مومن تراب کی جانب بھی چلا گیا آنکھیں میچ کر ایک بار پھر کڑوی گولی نگلی ہو جیسے۔

"بلڈی ایڈیٹس۔ قبر کے مردے اب نکل کر سامنے آنے رہ گئے ہیں بس۔"

بھلا وہ مومن تراب کو کیسے نہ پہچانتے۔ وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا جب انہیں اس کے باپ تراب الحسن کے گھر چند ماہ کے لیے قیام کرنا پڑا تھا۔ وہ دن تھے جب ان کی زندگی نے "یوٹرن" لیا تھا۔

☆☆☆

ماحور کو مومن گھر چھوڑنے کے بعد واپس ہوا تھا تو راستے میں اسے ریان ایک بہترین فرنیچر شاپ سے سامان لوڈ کرواتا نظر آیا۔ وہ حیران سا اس کی طرف چل دیا مگر اس سے پہلے ہی سامان کی لوڈنگ مکمل ہوئی اور وہ خود لوڈر کے ساتھ کھڑی بائک پر بیٹھے لڑکے کے کندھے کو تھپتھپاتا اس کے پیچھے بیٹھا اور لوڈر کو چلنے کا اشارہ دیا۔ لوڈر پر ایک سیون سیٹر نیا صوفہ، سینٹرل ٹیبل، ایک چھوٹے سائز کا کاؤچ اور خوب صورت شوکیس لوڈ کیا گیا تھا۔ مومن کو یہی لگا کہ یقیناً ماحور نے گھر میں نیا فرنیچر ڈلوایا ہے۔ لامحالہ اسے خوشی بھی ہوئی۔ ماحور کی ہر کامیابی اسے اپنی ذاتی کاوش لگتی تھی۔ اس نے سوچا کہ انہی قدموں واپس ماحور کے گھر کی طرف چل دے اور ریان کے ساتھ سامان ان لوڈ کروانے میں مدد بھی کروا دے۔ لیکن اگلے ہی پل وہ اچنبھے سے ریان کو مخالف سمت جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں لوڈر بھی چل دیا۔

"ہوسکتا ہے کہ یہ سامان ریان کے کسی دوست کا ہو اور ریان مدد کی غرض سے اس کے ہمراہ ہو۔" وہ خود سے ہی قیاس کرتا کندھے اچکاتا اپنی راہ ہولیا۔ مگر اچانک سے نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ قریب سے گزرتے رکشے کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھ کر لوڈر کی نشان دہی کرواکے اس کا پیچھا کرنے کو کہا۔ ابھی تک وہ لوگ نظر سے اوجھل نہیں ہوئے تھے۔ مگر جس رفتار سے رکشا جا رہا تھا، اسے لگتا تھا کہ وہ یقیناً ادھر ادھر ہو جائیں گے۔ اسے افسوس ہوا کہ کاش اپنی گاڑی میں ہوتا تو اب تک بالکل سر پر پہنچ چکا ہوتا ان کے۔ شاویز کو اپنے میاں جی کو لے کر ڈاکٹر کے ہاں جانا تھا سو اس کی آسانی کے لیے اسے خود گاڑی کی چابی پکڑائی تھی۔ مگر اس گھڑی گاڑی کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی تھوڑی سی تگ و دو کے بعد رکشے والا ان کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چند مزید موڑ مڑ کر ریان اور وہ لڑکا ایک تنگ اور چھوٹی سی گلی کے دہانے پر پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے لوڈر بھی رک گیا۔ گلی کے اندر اسے لے جایا نہیں جا سکتا تھا لہٰذا یہیں سے وہ لڑکا اور ریان لوڈر والے کے ساتھ مل کر سامان اتروانے لگے۔ مومن کسی گاڑی کی آڑ میں ہو کر سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ سامان اتروایا جا چکا تھا اور اب اندر گلی سے ہی ایک دو مزید ہٹے کٹے سے جوان لڑکے باہر نکلے اور احتیاط سے سامان اٹھا کر اندر لے جانے لگے۔ ریان بھی ان کے ساتھ مدد کروا رہا تھا مگر وہ لوگ بڑی عزت اور احترام سے اسے بار بار ایسا کرنے سے روک رہے تھے۔

"یعنی ریان ایز اے ہیلپر ان کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اسے ہاتھ بٹانے سے منع کیوں کر رہے ہیں؟ اور اگر ہیلپر نہیں ہے تو کیا بائیر (خریدار) ہے؟ مگر اس نے یہ سارا سامان بھلا کس کے لیے اور کیسے خریدا ہے۔ اتنی رقم کہاں سے آئی اس کے پاس۔"

ایسی کتنی ہی سوچیں اس وقت مومن کو پریشان کر گئی تھیں۔

وہ گاڑی کی آڑ سے نکل کر ذرا فاصلے پر بنی پودوں کی باڑھ کے پیچھے آ بیٹھا۔ اب اسے گلی کے اندر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سامان ایک ہلکے سبز رنگ کے گیٹ والے گھر کے اندر جاتا دکھائی دیا اور ریان بڑے فخر سے گردن اکڑائے گیٹ کے ساتھ کھڑا جیسے سپرویژن کر رہا تھا۔ سارا سامان اندر جا چکا تو ایک خاتون اندر سے باہر آئیں اور آتے ساتھ ہی چٹا چٹ ریان کی بلائیں لینی شروع کر دیں۔ ان کا انداز چاپلوسانہ تھا۔ چہرے اور جثے سے ہی خاصی چالاک دکھائی دیتی تھیں۔ وہ بائک والا لڑکا اور دوسرے دونوں لڑکے بھی اس کے گرد کھڑے نثار ہوتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر اگلا منظر مومن کے لیے زیادہ حیرت انگیز تھا۔ وہ خاتون اس کو پیار کر کے ایک جھٹکے سے سپاٹ سا چہرہ لیے واپس اندر مڑ گئی تھیں۔ ان کی تقلید میں تینوں لڑکے بھی چلے

گئے۔ ریان نے بھی اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے مگر گیٹ پوری طاقت سے اس کے منہ پر ہی بند کر دیا گیا۔ وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر جو کھسیاہٹ اور شرمندگی تھی، وہ مومن دور سے بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔ مومن کو کچھ کچھ نہیں، کافی کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔ یہ سارا سامان ریان نے ان لوگوں کو دیا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیسے اور کیوں؟ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟ کیا ماحور کو اس بات کا پتا تھا؟

وہ ابھی ریان اور سیف کے ساتھ اس قدر فرینک نہیں تھا وہ کہ ڈائریکٹ ریان سے ہی پوچھ لیتا۔ اس کا ردعمل شدید بھی ہو سکتا تھا۔ ریان منہ لٹکائے واپس آ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ اس کی نگاہ مومن پر پڑتی، وہ تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ مگر گھر پہنچنے تک اس کا ذہن مسلسل انہی باتوں میں الجھا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ریان کسی بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو چکا ہے۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچی تو پہلی بار اسے گھر کا ماحول بے حد پرسکون اور نکھرا نکھرا لگا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر اور ہر کام مکمل۔ صفائی سے لے کر کچن تک زلیخا دادی نے سمیٹ رکھا تھا۔ جب وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو سیف اور زونی دونوں فرش پر بچھے پرانے قالین پر آڑے ترچھے لیٹے ہائے وائے کی مصنوعی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ ماحور کو دیکھتے ہی دونوں نے لیٹے لیٹے واویلا شروع کر دیا تھا۔

"ایسا بڑا ظلم ہوا آپ کے بھائیوں پر۔ دادی نے سارا گھر صاف کروایا ہے ہم سے۔ زونی سے صحن دھلوایا اور مجھ سے سر پر کھڑے ہو کر اندر سے گھر صاف کروایا۔ کچن جنت نے صاف کیا۔ یقین مانیں جوڑ جوڑ ہلا دیا انہوں نے ہمارا!"

صوفے پر زلیخا دادی جنت کو گھٹنوں میں لیے اس کے بالوں میں تیل لگا کر انہیں ہلکے ہاتھوں کی مالش کر رہی تھیں۔ جنت آنکھیں موندے بڑے خوش کن تاثرات کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ورنہ وہ بہت کم کسی بات پر تاثر دیتی تھی۔ وہ سیف کی بات پر ہنستے ہوئے دھپ سے دادی کے پہلو میں گری۔

"اے ہائے۔ دھان پان سی ہو مگر صوفے کی چولیں ہلا دیں تم نے۔ سکون سے بیٹھو۔ پہلے ہی سارے گھر کا سامان پانی کا بلبلہ بنا ہوا ہے۔ ادھم ٹھیس لگی، ادھر پٹ سے پھٹا۔" وہ اس کے یوں بیٹھنے پر چڑتے ہوئے بولیں۔ ہاتھ ہنوز مصروف تھے۔

"آپ سامان کی کیا بات کرتی ہیں دادی۔ یہاں تو ہم خود پانی کا بلبلہ ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ اتنی ٹھیس لگی ہمیں مگر ہم فنا نہیں ہوئے۔"

"مت کروایسی باتیں ماحور۔ زندگی بہت سے لوگوں کا بڑا کڑا امتحان لیتی ہے۔ دنیا بھری پڑی ہے جنہیں قدم قدم پر زندگی نے آزمایا۔ اونچائیوں سے پٹخا۔ پستیوں میں لا گرایا۔ مگر ان کے صبر پر حرف نہ آیا۔ ہر بار گرنے پر وہ پہلے سے زیادہ مضبوط قدموں سے کھڑے ہوئے۔ مجھے انکار نہیں تم لوگوں کی صعوبتوں سے مگر کیا یہ کم ہے کہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تمہارے پاس اہلیت تو تھی۔ قابلیت تو تھی۔ کیا ہوتا اگر تم خود معذور ہوتیں یا اپنے کسی بہن بھائی کو ایسی تکلیف میں دیکھنا پڑتا۔ زندہ تو تب بھی رہنا ہی پڑتا نا۔ اس لیے میرا بچہ جو گزر گیا اسے اعمال کی زکوٰۃ سمجھو اور آنے والے کل کی تیاری رکھو، جو زندگی رہی تو۔ اگر برا وقت دیکھا ہے تو اسی لیے کہ اچھے کی قدر کر سکو۔"

وہ گیلی آنکھیں لیے گم صم سی بیٹھی سنتی رہ گئی تھی۔ سیف نے بھی پورے انہماک سے زلیخا دادی کی باتوں کو سنا تھا۔ اس کے دل کو لگی تھی یہ گفتگو۔ زلیخا دادی نے جنت کے بال سلیقے سے باندھے اور اسے اٹھا کر ماحور کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے اپنے آگے بٹھا دیا۔

"ادھر بیٹھو۔ اب ذرا تم بھی اپنے بالوں میں تیل ڈلواؤ۔ دیکھو کتنے پیارے بال ہیں ماشاء اللہ۔ سنہری تاریں جھلملا رہی ہیں۔ ان کا خیال رکھا کرو بچے۔" وہ اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں چلاتی اس کا دھیان اب دوسری سمت موڑ رہی تھیں۔ ان کی انگلیوں کے لمس نے پل بھر میں ماحور کو آنکھیں موند لینے پر مجبور کر دیا۔ زلیخا دادی کی پوروں کے ذریعے ممتا کا نرم گرم احساس اس کی جلد میں سرایت کر رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وقت تھم جائے اور وہ یونہی مورت بنی بیٹھی رہے۔

"دادی۔" اس نے مدھم آواز سے انہیں پکارا۔ "دادی آپ کو اپنے بیٹوں کی یاد نہیں آتی؟ نہ ان کا کوئی فون آتا ہے نہ آپ انہیں کرتی ہیں۔ کیا آپ مس نہیں کرتی انہیں۔"

"کرتی ہوں۔ کیوں نہیں کرتی۔ بھلا ماں بھی کبھی اپنی اولاد کو یاد کیے بغیر رہ سکتی ہے۔ اولاد سے دوری کند چھری ہوتی ہے۔ نہ گردن اترتی ہے نہ جان نکلتی ہے۔ تو بھلا میں کیسے نہ یاد کرتی ہوں گی۔"

"نہیں دادی۔ ہر ماں اولاد کو یاد نہیں کرتی۔ کچھ مائیں بڑی عجیب ہوتی ہیں دادی۔ بڑی عجیب۔"

سیف نے اپنے موبائل سے نظر ہٹا کر فوراً ماحور کو دیکھا تھا۔ وہ اسے روک لینا چاہتا تھا اس موضوع پر بات کرنے سے۔ خاص طور پر زونی اور جنت کے سامنے تو وہ حتی المقدور کوشش کرتے تھے کہ ایسی کوئی بات ہرگز نہ ہو جس سے ان کے دلوں میں سوال اٹھیں۔ اس سے پہلے کہ زلیخا دادی کوئی جواب دیتیں۔ لاؤنج کا دروازہ دھاڑ سے کھلا اور ریان تپے تپے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ بنا سلام کیے سیدھا کمرے میں جانے لگا تھا کہ سیف نے روک لیا۔

"کہاں سے آ رہے ہو ریان! اور اتنے غصے میں کیوں ہو۔ کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟"

"کسی سے نہیں۔ پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کرے کوئی۔" اس نے نپا تلا سا جواب دے کر دوبارہ قدم کمرے کی جانب بڑھائے۔

"ریان۔ کیا ہوا ہے بیٹا۔ مجھے بتاؤ۔ تم آج کل اتنے بے زار سے کیوں رہتے ہو۔ مسئلہ کیا ہے آخر۔ کالج میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" ماحور پریشان ہو گئی تھی۔ وہ کئی دن سے ریان کے رویے میں عجیب سی تبدیلیاں نوٹ کر رہی تھی۔

"آپ میری اتنی فکر نہ کیا کریں اپیا۔ بچہ نہیں ہوں اب میں۔ یوں بات بات پر مجھ سے پوچھ تاچھ کر کے کیا ثابت کرتی ہیں کہ مجھے ہر بات اور ہر کام کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے؟ نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ چھوڑ دیں ہم لوگوں کو ہمارے حال پر۔ ہمیں اسپیس دیں اپیا۔"

اتنا بدتمیز لہجہ اور ریان کا۔ سب کو کچھ دیر کے لیے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ سیف غصے سے اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریان کو تھپڑ جڑ دیتا، ماحور نے فوراً جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ یہ اور بات کہ اس وقت اس کے اپنے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ سیف نے اس کی بے بسی کو ایک ہی پل میں محسوس کر لیا تھا۔ زلیخا دادی نے ریان کو بلا جھجک ڈانٹ کر اندر کمرے میں جانے کو کہا تو وہ راستے میں آئی ہر چیز ٹھوکر پر رکھتا اندر چلا گیا۔ ماحور صدماتی کیفیت میں بمشکل خود کو بٹھا پائی۔ سب حیران تھے، افسردہ تھے۔ زلیخا دادی نے ماحور کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دی۔ اسے اپنی ساری محنت اور ریاضت کھائی میں جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اپنی اولاد کی طرح بھائی پالے تھے اس نے۔ کیسے اسے طعنے مار گیا تھا۔ وہ جتنا بھی بلکتی کم تھا۔

☆☆☆

دوپہر میں عادل پاشا آفس سے آنے کے بعد سیدھے بیڈروم میں چلے گئے تھے۔ نائمہ کو حیرت نہیں فکر ہوئی تھی۔ ڈرائیور سے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کراچی سے آج صبح واپس آ چکے ہیں اور ائیر پورٹ سے سیدھا آفس چلے گئے ہیں مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ مزاج ہنوز برہم ہی ہوگا۔

عادل پاشا کی ہمیشہ سے عادت رہی تھی کہ گھر

آتے ہی ناعمہ کے پاس آتے اور چائے کی فرمائش کرتے تھے۔ اس کے بعد ہی کمرے کا رخ کرتے۔ مگر آج تو انہوں نے واپسی پر ناعمہ سے ملاقات کی نہ ہی چائے طلب کی۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی ہمت مجتمع کرکی بیڈروم میں داخل ہوئیں۔ عادل پاشا کپڑے تبدیل کرکے بیڈ پر بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم پاشا! کیسے ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں۔ ہمیشہ کی طرح فٹ ہوں اور پوری طرح باخبر بھی۔ آپ کے لیے یقیناً مایوس کن خبر ہے۔" ان کے سادے سے سلام کے جواب میں ایسا وزنی طنز ناعمہ کو سہارنا مشکل لگا۔

"اللہ نہ کرے پاشا۔ میرے لیے آپ کی سلامتی مقدم ہے۔ آپ کیوں مجھ سے بدگمان ہیں۔"

"دعا کیجیے ناعمہ! کہ میرے گمان درست ثابت نہ ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو بہت کانٹ چھانٹ کرنا پڑے گی۔ بڑی گرد اڑے گی۔ اور یہ گرد بہت سے رشتوں کو اوڑھنا پڑے گی۔"

"آپ انتہائی نیچ پر جا کر کیوں سوچتے ہیں پاشا۔ خدارا توازن رکھیں۔ زیرک نگاہی سے کام لیں گے تو کسی بھی رشتے پر خاک ڈالنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ایک ہی اولاد ہے آپ کی۔ کچھ اس کی مان لیں کچھ اپنی منوالیں۔ اسی میں بھلائی ہے۔"

بڑی جرأت کی تھی انہوں نے جو اتنا بھی بول لیا ورنہ وہ صرف سنا کرتی تھیں اور اتنا بھی عادل پاشا کو جلتے توے پر بٹھا گیا تھا۔

"آپ اس کے کندھے کیوں استعمال کر رہی ہیں۔ "میری اولاد" جتا کر کون سی اولاد کا دفاع کرنا چاہ رہی ہیں۔ میں نے جانے سے پہلے آپ کو وارن کیا تھا کہ اگر اس سارے سلسلے کی کڑیاں آپ سے جا ملیں تو یقیناً کسی کے بھی حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ اب آپ مجھے ڈکٹیٹ کرنا بند کریں اور اس معاملے کو مجھے ہی آخری حد تک لے جانے دیں۔" وہ سرد اور لاتعلق لہجے میں انہیں بہت کچھ باور کرا گئے تھے۔ ناعمہ پاشا کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔

"اب آپ جایئے۔ مجھے آرام کرنے دیں۔ رات کو ڈنر پر ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ لیٹ تھے۔ ناعمہ پاشا خاموشی سے کمرے سے باہر آ تھیں۔ اس سے زیادہ بحث ان کے لیے ممکن نہ تھی۔ ایک طویل رفاقت تھی ان کی عادل پاشا ساتھ، جس میں وہ ان کے مزاج کے وہ پہلو بھی جا چکی تھیں جو خود ان کے بیٹے سے بھی پوشیدہ تھے۔

رات ڈنر سے کچھ دیر پہلے ہی وہ دوبارہ کمر سے باہر نکلے تھے۔ ٹیبل لگنے تک کچھ وقت ٹی وی چمکتی اسکرین کو تکتے گزارا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ ان کی چپ نہیں ٹوٹی تھی۔ وہ اس قدر سنجیدہ اور سپا تاثرات لیے ہوئے تھے کہ ناعمہ پاشا کو ٹھنڈ پسینے آ رہے تھے۔ ابھی انہوں نے چند لقمے ہی ہوں گے کہ خوش باش اور فریش موڈ میں سالک وہا چلا آیا۔ یہ عادل پاشا کے لیے اچنبھے کی بات تھی انہوں نے حیرانی کا اظہار ہرگز نہیں کیا تھا۔

سالک پاشا بے حد چہک رہا تھا۔ ہر ڈش جیسے اسے آج ہی ٹرائی کرنا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ عادل پاشا کے ساتھ آفس کے چھوٹے مو مسائل بھی شیئر کر رہا تھا یہ پروا کیے بغیر کہ وہ اسے ایک بات کا بھی ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہ دے رہے تھے۔ عادل پاشا بڑی گہری نگاہ سے کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ سالک جو کل تک پاشا کے چہرے پر نگاہ ڈالنا گوارا نہ کرتا تھا، آج کے سامنے بڑے اطمینان سے نہ صرف کھانے تبصرہ کر رہا تھا بلکہ ان کے مٹھلی چیک اپ کے حوا سے بھی پوچھ رہا تھا۔ ناعمہ پاشا کن انکھیوں عادل پاشا کو دیکھتی ہوئی، گھبرائی گھبرائی سی اسے مختصر جواب دے رہی تھیں۔ انہیں عادل پاشا کے چہ پر چھائی سرد مہری شدید خوف میں مبتلا کر رہی تھی انہوں نے التجائیہ نگاہوں سے سالک کو دیکھا تو جواباً مبہم سا مسکراتے ہوئے کندھے اچکا گیا۔

"دونوں باپ بیٹا امتحان ہیں۔" وہ دل سوچتی چھوٹے چھوٹے نوالے توڑ رہی تھیں جب



عادل پاشا نے پلیٹ ذرا سی پرے کھسکائی اور نیپکن سے نفاست کے ساتھ ہونٹوں کے کنارے صاف کرتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ناعمہ پاشا نے فوراً سوال کیا۔

"کیا ہوا۔ آپ نے کھانا ادھورا کیوں چھوڑ دیا پاشا؟"

"تاکہ آپ دونوں کی گفتگو ادھوری نہ رہ جائے۔ میں اسٹڈی میں ہوں۔ پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"

عادل پاشا جا چکے تھے اور ناعمہ پاشا کی حالت کاٹو تو لہو نہیں والی تھی۔ انہیں ایسا لگا جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ سن سی بیٹھی اسی جگہ ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں جس رخ ابھی ابھی عادل پاشا گئے تھے۔ سالک پاشا نے ان کی رنگت اڑے چہرے کو دیکھ کر دھیرے سے اپنے بائیں ہاتھ میں تھامے فورک کو نفیس کانچ کے گلاس کی سطح پر بجا کر انہیں متوجہ کیا۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئیں۔

"آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں۔ ابی کو ہمیشہ سے اندھیرے میں تیر چھوڑنے کی عادت ہے۔ لگ جائے تو ٹھیک ورنہ روشنی میں ماردیں گے۔ ہاں! ماریں گے ضرور۔" سالک نے اپنی بات کا خود ہی مزا لیتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"آپ جانتے بھی ہیں کہ آپ کے ابی کو دھوکا دینا آسان نہیں ہے بیٹا۔ وہ مفروضوں پر نہیں چلتے۔ ان کا ہوم ورک ہمیشہ کمپلیٹ ہوتا ہے۔"

"میں بھی ان ہی کا بیٹا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ اس بار میں انہیں من مانی نہیں کرنے دوں گا۔ میں آپ کا ساتھ دوں گا اور آپ میرا۔ یہی طے ہوا تھا ہم دونوں کے بیچ۔ میری کامیابی آپ کی کامیابی ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔ لیکن میں عادل پاشا کی نیچر سے خائف ہوں۔ میں نے ان کے بڑے روپ دیکھے ہیں۔ نہیں چاہتی کہ بے خبری میں نقصان اٹھا لوں۔"

"اب کی بار ایسا نہیں ہوگا۔ آئی پرامس۔ آپ بس اب جلد از جلد جانے کی تیاری کریں۔ پلیز، میں اس معاملے کو مزید پینڈنگ میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

سالک پاشا کا نرم لہجے میں کہا گیا تسلی آمیز جملہ ڈائننگ ہال کی دیوار سے لگ کر کھڑے عادل پاشا نے بغور سنا تھا۔

"تم بہت بڑی بھول میں ہو میرے بیٹے۔ عادل پاشا کو ہلکا جان لیا تم نے۔ مجھے ہرانا تمہارے بس میں نہیں۔ میں وہ گرو ہوں جو آخری داؤ کسی کو نہیں سکھاتا، صرف خود کھیلتا ہے۔"

ایک استہزائیہ مسکراہٹ نے ان کے ہونٹوں کا احاطہ کیا اور وہ دبے قدموں وہاں سے ہٹ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ بڑی محنت سے ماحور سے پوچھ پوچھ کر دادا کے لیے سوپ تیار کرکے لایا تھا۔ کل رات سے دادا کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ سردی اپنا اثر دکھا گئی تھی۔ مسلسل بخار نے دادا کی حالت پتلی کر دی تھی۔ مومن کے لیے زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ وہ دل میں ہلکے ہلکے درد کی شکایت کر رہے تھے۔ شاویز گاڑی لے کر گیا ہوا تھا ورنہ وہ ابھی کے ابھی انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اس وقت وہ مستقل زیر لب شاویز کو گالیاں دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"اٹھیں دادا۔ ذرا سی ہمت کریں۔ یہ سوپ پئیں۔ تاکہ آپ کو حرارت ملے۔"

"میرا دل نہیں کرتا یار یہ پھیکا پانی پینے کو۔ نہ کوئی ذائقہ نہ مزا۔ حرارت کیا دینی ہے اس نے، الٹا طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔"

"یہ مزے کا ہے دادا۔ آپ کی بہو سے پوچھ پوچھ کر بنایا ہے۔ یقین مانیں بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔"

"تو اپنی ماں کے پاس گیا تھا؟ ہیں مومن۔ تو واقعی قبرستان گیا تھا۔ آصفہ سے سوپ بنانے کا

"طریقہ پوچھنے؟"
"جی ہاں۔ گیا تھا۔ لیکن وہاں دادی، امی سے لڑ رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگیں، اکیلا کیوں آیا ہے۔ جا۔ جا کر اپنے دادا کو بھی لا۔"
"بکواس بند کر۔ جھوٹ بولتے حیا نہیں آتی۔ بے شرم۔ تیری دادی کی تو عقل زندگی میں ہی پوری پوری تھی۔ پر کر تو بالکل ہی ماری گئی لگتا ہے۔ ایسا کر کل ذرا دادی قبرستان کا چکر لگا کے آ۔ چیک تو کر تیری دادی کی قبر بند ہی ہے نا۔"
"استغفار دادا۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ بندہ آپ سے مذاق نہ کرے بس۔ میں نے ماحور سے پوچھا تھا۔ وہ بھی تو آپ کی بہو ہی لگتی ہے نا۔" مومن نے جھنجلا کر سر پیٹ لیا۔
"ہاں تو کیوں کرتا ہے مجھ سے مذاق۔ وہ بس میں کر سکتا ہوں۔ اور بہو میری تب لگے نا جب میں اس کے ہاں رشتہ لے کر جاؤں۔ وہ قبول ہو جائے۔ تیری منگنی کروں۔ پھر مٹھائی بانٹوں۔ نہیں نہیں۔ کھاؤں۔ پھر پتا چلے گا کہ وہ بچی میری بہو ہے۔ ورنہ تو اگر چھت پر کھڑے ہو کر سامنے ڈار صاحب کے گھر آئی ان کی بھتیجیوں کو دیکھ کر بال سنوارے گا تو کیا میں انہیں بھی اپنی بہو مان لوں؟"
مومن کو ایسا زوردار جھٹکا لگا کہ سخت سردی میں اسے اپنے گال گرم ہوتے محسوس ہوئے۔ چھت پر اچھی دھوپ آئی تھی تو سردی کی وجہ سے ماسی شوکت کپڑے دھو کر اوپر ڈال آئی تھی۔ کل آفس سے واپسی پر دادا نے اسے کپڑے اتار لانے کو کہا۔ سامنے والے ڈار صاحب کے صحن سے بے تحاشا نسوانی قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کپڑے اتارتے ہوئے اس نے یونہی ذرا سا جھانک کر دیکھا تھا۔ تین جوان جہان لڑکیاں موبائل سے سیلفیاں لیتی، الٹے سیدھے منہ بناتی ہنسے جا رہی تھیں۔ انہوں نے مومن کو جھانکتے دیکھا تو شوخ ہو کر ایک دوسرے کے کان میں گھس کر نہ جانے کیا بڑبڑائے جا رہی تھیں۔ مومن میاں کو اپنا آپ راجا اندر محسوس ہوا اور بالوں میں انگلیاں چلاتے بے نیاز سا ... سے کھمبیاں ٹکائے آسمان میں دیکھتے دن میں ... گننے لگا۔ کن انکھیوں سے کسی کسی وقت لڑکیوں ... دیکھ رہا تھا۔ تبھی نیچے صحن میں بیٹھے دادا کی ... پکار سارے میں پھیلی اور مومن سٹپٹا کر نیچے ... لڑکیوں کے زوردار قہقہوں نے اس کی خوب ... اڑائی۔ اب وہ تو ایویں دل پشوری کر رہا تھا ... کبھار شاویز کے ساتھ بھی مل کر ہلکا پھلکا شغل ... تھا۔ لیکن اسے کیا پتا تھا کہ یہ کبھی کبھار کی شرارت ... کی نظروں میں آ چکی تھی۔ اب وہ ہونق بنا ... جھانک رہا تھا۔ قسمت سے شاویز کی اسی وقت ... ہوئی اور دادا کا دھیان بٹ گیا۔ مومن نے بھی ... سے آنے کے بہانے اس کے لتے لینے شروع کیے ...
"کہاں مر گیا تھا موٹے؟ اب تم ہانگو مجھ ... گاڑی تو دیکھنا۔ پتا ہے دادا کی طبیعت کتنی خراب ہے۔ مجھے انہیں ہاسپٹل لے کر جانا ہے۔"
"بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ ایک تو تمہارا ... انگوٹھی کے لیے اتنا خجل خوار ہو کر آیا ہوں، اوپر ... بجائے اس کے کہ میرے لیے چائے بنا کر لاؤ ... باتیں سنا رہے ہو۔" شاویز مومن کے اشاروں ... انجان، تلملاتے ہوئے بولا۔
"انگوٹھی۔ کیسی انگوٹھی؟" اب دادا ذرا ... سیدھا ہو کر بیٹھے۔ مومن گڑبڑا گیا۔ پہلے سوچا کہ ... بھی کہہ کر بات بنا لے مگر دادا فوراً بھانپ لیتے ... ایک لمبا سانس خارج کرتے ہوئے شاویز کو خو... خوار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
"وہ کیا ہے نا دادا۔ آپ کی طبیعت کی وجہ ... ابھی چند دن مزید ہم نہیں جا سکیں گے ماحور ... طرف۔ تو سوچا کہ...... کہ...... سوچا بس ایویں ... سر کے بال کھجاتا ہوا کنفیوز سا بولا۔ "کوئی ہلکی پھلکی ... انگوٹھی اپنی طرف سے اکیلے میں ماحور کو پہنا دوں ... بس ایویں دادا۔ ضروری نہیں ہے یہ۔ آپ جب ... بات طے کریں گے تو یہ کام تب ہو جائے گا۔ ... بھی ضروری نہیں۔ "نا" زبان اور تالو کا شاخہ بجا... ہوئے اس نے زوردار "نا" کی تھی۔
سب سے زیادہ لطف اندوز اس وقت شاویز ہو رہا تھا۔ رات کو مومن نے بارہ بجے اسے کال کر کے سرگوشیانہ لہجے میں بہترین سی انگوٹھی لانے کو کہا تھا۔ محب بھائی کی امیٹیشن جیولری کی چلتی ہوئی دکان تھی۔ ان کے پاس گولڈ پلیٹڈ رنگز بھی ہوتی تھیں۔ مومن نے شاویز کو مناسب قیمت پر بہترین انگوٹھی لانے کو کہا تھا۔ شاویز انگوٹھی نہ لایا، الٹا اس کا پول کھول کر اب منہ پھاڑے ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کرتا مومن کو بالکل نیلا تھوتھا لگ رہا تھا۔ دادا نے ہنکارا ابھرا اور دھیمی آواز میں بولے۔
"سوچ رہا ہوں کہ یہ وقت بھی دیکھنا تھا کہ تُو اب مجھ سے چھپ کر انگوٹھی پہنائے گا میری بہو کو۔"
"نہ۔ بالکل نہیں دادا۔ کیسی بات کرتے ہیں۔ بولا نا۔ یہ تو بس ایویں۔ ورنہ میں بھلا انگوٹھی پہنا کر کروں گا بھی کیا۔ یہ تو آپ کے کرنے کے کام ہیں۔" مومن کھسیاتا ہوا بول رہا تھا۔ دادا نے پاس پڑی چھڑی اٹھائی اور رکھ کے گھٹنے پر ماری۔ شاویز بلبلاتا ہوا صحن میں ناچنے لگا۔
"یار دادا۔ میں نے کیا کہا آپ کو؟ مجھے کیوں ماری آپ نے چھڑی۔ حد ہو گئی۔ خیر کا زمانہ نہیں۔ نہ بتاتا آپ کو تو آپ کا یہ پوتا آپ کی ناک کے نیچے انگوٹھی پہنا کر آ جاتا اور آپ کو پتا بھی نہ چلتا۔"
مگر دادا ان سنی کرتے اندر کمرے میں چلے گئے۔ ان دونوں کو بھی پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ خود بیڈ پر لیٹ کر شاویز سے بولے۔
"میرے قریب تُو ہی بیٹھا تھا یار۔ مومن بیٹھا ہوتا تو اسی کو مارتا۔ اب زیادہ پھدکنا بند کر اور میری الماری کھول ذرا۔ اس میں میرے کپڑوں کے نیچے ایک کالی جراب پڑی ہے وہ نکال کر لا۔"
مومن کرسی پر ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا اور الماری کھول کر کپڑوں کے نیچے ہاتھ مار کر جراب ٹٹولتے شاویز کو غیر دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ شاویز فضا میں آنکھیں گھماتا ہوا ہاتھ مارتا، منہ کھولے مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ چند ثانیے بعد اس نے ایک خستہ حال جراب باہر نکال ہی لی۔
"اے ہائے۔ دادا یہ کیا ہے۔ اس جراب میں کیا چوہے مار دوا ڈال کے رکھی ہوئی ہے۔ ایسی بدبو جون جولائی کے موسم میں میری جرابوں سے نہیں آتی۔" اس نے وقفے وقفے سے دو بار جراب کو سونگھ کر تبصرہ کیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ دادا کیسی خون آشام نظروں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔
"بکواس بند کر اور ادھر لا اسے۔ تجھے ابھی پتا نہیں کہ اس میں ہے کیا۔" وہ اسے دہکاتے ہوئے بولے۔
"دادا اگر اس میں فینائل کی گولیاں ہیں تو ایک اس شاویز کے بچے کے منہ میں ٹھونس دیں۔ بس تس سے جراثیم ختم ہو جائیں گے۔" مومن نے نیم مندی آنکھوں سے ہلکے پھلکے لہجے میں قیاس آرائی کی۔ کمرے میں چلتے ہیٹر کی وجہ سے اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔
"تم دونوں اپنی بکواس بند کرو اب ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ اس میں تمہاری دادی کی نشانیاں ہیں۔ سمجھے۔"
"دادی کی نشانیاں۔" اس نے ایک آنکھ پوری کھول کر اچنبھے سے پوچھا۔ "دادا کہیں آپ نے دادی کے دانت تو نہیں سنبھالے ہوئے۔"
دادا جواب دیے بغیر جراب کو لگی گرہ کھول رہے تھے۔ مومن بھی ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ شاویز پہلے ہی آدھا دادا کے اوپر چڑھا ہوا تھا۔ جراب کی گرہ کھل گئی تھی اور اب اس میں سے پلاسٹک کی تھیلی نکل آئی تھی۔ اس تھیلی کو مزید کھولنے پر ایک سوتی کپڑے کی پوٹلی سی برآمد ہوئی تھی۔ دادا ہر دو سیکنڈ بعد ان دونوں کو ایسی فخریہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے اس ننھی پوٹلی میں کروڑوں کی جائیداد سمیٹ سمٹا کر مقید کر رکھی ہو۔ مومن اکتانے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ ایک بھرپور جمائی لیتا وہ دوبارہ سے آنکھیں موند کر کرسی سے ٹیک لیتا۔ دادا کی پوٹلی کھل گئی تھی۔ اندر سے خیرہ

کن چک لے تین چار بڑی بڑی سونے کی انگوٹھیاں، بڑی نفیس اور وزنی سونے کی چین ایک عمدہ لاکٹ کے ساتھ جلوہ نما تھیں۔ چھوٹے چھوٹے طلائی آویزے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مومن اور شاویز کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس بات پر نہیں کہ دادا کے پاس سے زیور برآمد ہوا تھا بلکہ اس بات پر کہ دادا نے کس مہارت سے گندی میلی جراب میں اسے اس طریقے سے محفوظ کر رکھا تھا کہ کوئی دیکھتا بھی تو شک نہیں کر سکتا تھا کہ اس میں اتنی قیمتی اشیاء بھی ہو سکتی ہیں۔ دادا نے ایک نسبتاً ہلکے ڈیزائن کی نفیس سی انگوٹھی اٹھائی اور مومن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"یہ لے۔ پکڑ اسے۔ یہ پہنا دے میری بہو کو۔ اور اس کے بعد میری بات کروا دینا۔ میں خود اس سے پوچھ لوں گا کہ تجھ جیسے گھامڑ کا باقاعدہ رشتہ لے کر اس کے گھر کب آؤں۔"

مومن اٹھ کر دادا کے گلے لگ گیا۔ وہ ہمیشہ سے اس کے دوست رہے تھے۔ ہمیشہ سے لڑتے جھگڑتے اور اس کے من کی بوجھتے آئے تھے۔ دادا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کی طبیعت واقعی بہتر نہیں تھی۔ سینے کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے مومن کی شادی کر دیں۔ مگر پہلے ماحور کی مجبوریاں آڑے تھیں تو اب خود بیمار پڑ گئے تھے۔ دونوں دادا پوتا جی جان سے گلے لگے ہوئے تھے جب شوں شوں کی آواز نے ان دونوں کا ارتکاز توڑا۔ شاویز ہاتھ میں وہی گندی جراب تھامے ناک پونچھ رہا تھا۔ آنکھیں مسل مسل کر آنسو نکالنے کی کوشش میں ہلکان ہوتا مزید بینگنی دکھائی دے رہا تھا۔ دادا نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"کیوں رو رہا ہے۔ دادا مر گیا کیا تیرا۔ اور چھوڑ میری جراب۔ غلیظ کر دی ناک سڑک سڑک کر۔"

"سوچ رہا ہوں کہ کل کو جب میں لڑکی پسند کروں گا۔ تو کیا کوئی مجھے بھی ایسی ہی انگوٹھی دے گا جو میں اس کو پہنا کر اپنے نام کر لوں۔"

"ڈائیلاگ ایسے مار رہا ہے جیسے لڑکی ... میں پڑی ہے تیرے۔ میں تجھے چابیوں کے ... سے چھلا اتار دوں گا، وہ تُو جا کر لڑکی کے ... ہاتھ میں پہنا دینا۔ تیری بات ایسے ہی پکی ... ہے۔ یہ میں تجھے بتائے دے رہا ہوں۔"

شاویز سر جھٹکتا انسان بن کر بیٹھ گیا۔ دادا ... اس کا کوئی جذباتی وار اثر نہیں کرتا تھا۔ مومن ... شرارت سے دیکھتا وہ اس کے تاثرات نوٹ کر رہا ... جو انگوٹھی تھامے ہولے سے مسکراتا بڑا پیارا لگ ... تھا۔ دادا نے سائڈ ٹیبل پر دھری تھرماس میں سے ایک کپ چائے نکال کر شاویز کو تھمائی اور دوسری پیالی میں خود پینے لگے۔ اب دونوں فرصت سے چائے کی چسکیاں لیتے مومن کو تک رہے تھے جو سب سے بے خبر ماحور کے ردعمل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ لمحہ کس قدر قیمتی ہو گا جب وہ یہ انگوٹھی پہنا کر اسے پابند کر لے گا۔

☆☆☆

ماحور کے کمرے کے چھوٹے سے سنگل بیڈ پر پھیلے خوب صورت ڈیزائنر ڈریس بہار دکھا رہے تھے۔ آخری جوڑا ابرش نے اپنے ساتھ لگایا اور اٹھلا اٹھلا کر حاضرین سے داد لینے کے بعد کورنش بجا لائی۔ حاضرین میں بیٹھیں ماحور اور رائنہ میں سے ایک کا منہ حیرت شوق سے بند تھا تو دوسری کا اکتاہٹ سے۔ ماحور کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ابرش کا یہ سب کچھ یہاں لانے کا مقصد کیا ہے۔ اور رائنہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابرش سے کہہ سن کر ایک آدھ سوٹ تو اٹھا ہی لے۔ اوپر سے دونوں کے تبصروں نے ماحور کے سر میں درد کر دیا تھا۔ درمیان میں رکھی ٹرے سے چائے کا مگ اٹھا کر لبوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

"اگر تمہاری ماڈلنگ ختم ہو گئی ہو ابرش تو مجھے بتاؤ گی کہ یہ سب کیا ہے۔ کیوں ہے اور کس لیے ہے۔"



"ویسے تو میں بتانے کی پابند نہیں ہوں مگر یہ سب تم دونوں کے لیے ہے۔ اس ماہ تمہاری سالگرہ ہے ماہی۔ تمہیں یاد ہو یا نہ ہو مگر میں اپنی دوستوں کے اسپیشل ڈیز کبھی نہیں بھولتی اور رہ گئی رائنہ۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ہم نوالہ اور ہم پیالہ کے لیے کچھ نہ لاتی۔" ابرش نے ٹھک سے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے فخریہ کہا تو رائنہ کا دل چاہا ابھی اٹھے اور اس کی ساری بلائیں جھاڑ کر اپنے سر لے لے۔

"ابرش۔ میں صدقے جاؤں۔ مجھے ہمیشہ سے یقین تھا کہ تمہارے اندر کوئی بڑی ہی نیک روح تڑپ رہی ہے۔ جو تم سے ایسے عظیم کام کرواتی ہے۔ ورنہ میری تو سالگرہ آنے میں ابھی تین ماہ باقی تھے یار۔"

"تب کی تب دیکھی جائے گی۔ ابھی تو میں تم دونوں کے لیے بہت شوق سے یہ سب لائی ہوں۔ ویسے بھی میں اس ماہی کی بچی کو ان بور رنگوں میں دیکھ دیکھ کر بور ہونے لگی ہوں۔" ابرش کمال بے نیازی سے بیڈ پر کہنی ٹکاتے ہوئے نیم دراز ہو گئی۔

"ہرگز نہیں۔ مجھے یہ بور کلرز ہی مبارک۔ تم ان سب کو اٹھاؤ اور خود استعمال کرو۔ سمجھیں۔ مجھے اتنا زیر بار مت کرو ابرش۔ میں بدلے میں تمہیں ایسے تحفے نہیں دے سکتی۔"

"زہر لگتے ہیں مجھے تمہارے جیسے سنیاسی قسم کے لوگ۔ خبردار جو مجھ سے بحث کرنے کی کوشش کی تو۔ میں یہ ڈریسز تمہارے لیے لائی ہوں تو بس لائی ہوں۔ رائنہ! تم سمجھالو اسے۔ مجھے تحفے دینا پسند ہے اور دے کر واپس لے جانا ہرگز بھی نہیں پسند۔" ابرش نے رائنہ کو اسے سمجھانے کا اشارہ کیا تو رائنہ نے فوراً تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ماہی۔ کسی کے لائے تحفے کی ناقدری نہیں کرتے۔ دوست قسمت سے ملتے ہیں۔ اور اچھے دوستوں کو ناراض کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ سمجھیں۔"

"مگر رائنہ۔"

"اگر مگر چھوڑو۔" ابرش فوراً ماحور کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "نیکسٹ ویک آفیشل گیدرنگ ارینج کی ہے پاپا نے۔ جن جن کمپنیز کے ساتھ پاپا کے بزنس ٹرمز ہیں وہ سب انوائٹڈ ہیں۔ یو نو۔ وہ بھی آئے گا۔ سالک پاشا۔ دا جیم آف دا ایونٹ۔"

"اووووووووو!" ہر بار کی طرح اس کے شرمانے کی ناکام ایکٹنگ کو نظرانداز کرتے ماحور اور رائنہ نے مشترکہ نعرہ بلند کیا تھا۔ ابرش نے نیچے جھکتے ہوئے بیڈ شیٹ کا کونا مروڑ مروڑ کر اسے برباد کرنا شروع کیا تو رائنہ نے فی الفور اسے سہاتے ہوئے کہا۔

"مت کر۔ مت کر یار۔ اگر ماہی کی دادی نے تجھے یہ ستم کرتے دیکھ لیا لڑکی تو مت پوچھ کیا بنے گا تیرا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں وہ لنگڑی بکری کے نام سے پکارنا پسند کریں گی۔" رائنہ کو دادی کے اسے مینڈکی کہنے کا بے حد قلق تھا۔ ابرش کے لیے نام تجویز کرتے اسے دلی تسکین حاصل ہوئی تھی۔

"میں تو ملی ہی نہیں دادی سے۔ مجھے بہت شوق تھا ان سے ملاقات کا۔" وہ بڑے اشتیاق سے آنکھیں گھماتے ہوئے بولی تو رائنہ نے چڑ کر جواب دیا۔

"سب شوق مٹی ہو جائے گا جب وہ سامنے آئیں گی۔ ایک سو ایک طریقوں سے مٹی پلید کرتی ہیں وہ۔"

"بکواس نہ کرو یار۔" ماحور کو ہنسی آ گئی۔ رائنہ کی درگت بھی تو بہت بناتی تھیں وہ۔ "دادی اپنے گھر گئی ہیں سیف کے ساتھ۔ اپنا ضروری سامان لانا تھا انہوں نے۔ اگر کچھ دیر میں آ گئیں تو ملاقات ہو جائے گی۔ یقین مانو بہت مزا آتا ہے ان کی باتیں سن کر۔" ماحور کے لیے آج کل زلیخا دادی نہ صرف جذباتی سہارا تھیں بلکہ بہت سے رشتوں کا مرقع بھی۔

"ہائے مجھے تو اب بس ایک ہی شخص کی باتیں مزا دیتی ہیں۔ کیا ذوق ہے۔ کیا انتخاب ہے۔ واللہ

سب لاجواب ہے۔"

ابرش کے کھوئے کھوئے لہجے سے وہ دونوں سمجھ گئی تھیں کہ وہ آج کل سالک پاشا کے ساتھ رابطے میں ہے۔ وہ اس کے لیے واقعی بے حد خوش تھیں۔ آخر کار اس کا محبوب رام ہو ہی گیا تھا۔

"تو کیا تم دونوں ابھی تک کیمیجز پر ہی اکتفا کیے ہوئے ہو؟ یقینی کہ حد ہی ہوگئی۔" ماحور کو سچ میں حیرت ہوئی تھی۔ وہ سالک پاشا کو بہت اسٹریٹ فارورڈ اور بلنٹ قسم کا مرد سمجھتی تھی۔ یہ شعر و شاعری اور جگنو ستاروں کی باتیں اسے ورطۂ حیرت میں ڈال گئی تھیں۔

"تمہیں کیا پتا ماہی ڈارلنگ۔ جب اس کا میسج آتا ہے تو دل کیسے دھڑک دھڑک جاتا ہے۔ اس کی بھیجی گئی ایک نظم میں دن میں کئی بار پڑھتی ہوں اور سیر ہو جاتی ہوں۔ مجھے کبھی اس کے تکلم کی طلب ہی نہیں جاگی۔ وہ لفظوں سے ہی اس مہارت سے بولتا ہے کہ جی چاہتا ہے بس یہ سلسلہ کبھی نہ رکے۔"

"او تیری۔ ابرش تم تو غرق ہوئی پڑی ہو اس کی محبت میں۔ مجھے لگتا ہے کہ عنقریب تمہارا ذہنی توازن بگڑنے کا خدشہ ہے میری جان۔ اس سے کہو کہ جلدی ماں باپ کو بھیج کر شادی کی بات کرے۔ ورنہ کچھ عرصے بعد اسے ابنارمل سے بیاہ کرنا پڑے گا۔" رائنہ نے کمال نقشہ کھینچا تھا۔ ابرش نے پاس پڑا تکیہ اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا۔ رائنہ نے جوابی کاروائی کے طور پر دوسرے تکیے سے وار کیا۔ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑیں۔ ماحور نے جھٹ چائے کی ٹرے درمیان سے ہٹائی اور اسے فاصلے پر رکھ کر پائنتی پڑا کمبل اٹھایا اور ایک دوسرے پر تابڑ توڑ تکیوں کے وار کرتیں رائنہ اور ابرش پر ڈال دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتیں، ماحور نے تکیہ سنبھالا اور ہلا بول دیا۔ لگاتار تکیہ برساتے ہوئے وہ انہیں کمبل ہٹانے کا موقع بھی نہیں دے رہی تھی۔ پورے کمرے میں تینوں کے قہقہوں اور چیخوں کی ملی جلی آوازیں چکرا رہی تھیں۔ ماحور اب سے پہلے اتنا کبھی نہیں ہنسی تھی۔ مومن نے اسے خوش رہنا سکھایا تھا۔ محبت سب سے پہلے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتی ہے پھر زندگی مہک اٹھتی ہے۔

☆☆☆

وہ سب رات کا کھانا بہت خوش گوار ماحول میں کھا رہے تھے۔ زلیخا دادی نے آج ان کے لیے بڑے اہتمام کے ساتھ اچاری چکن بنایا تھا۔ وہ پیکٹ کا مسالا استعمال نہیں کرتی تھیں۔ اصل اور خالص اچاری مسالوں کی مہک اب تک سارے میں پھیلی تھی۔ ماحور سیدھے سادے چاول بنانے آتے تھے یا ہر قسم کی بریانی کو ایک ہی طریقے سے پکاتی تھی۔ یہ بھی عاقب بھائی کی امی کی مہربانی سے سیکھ گئی تھی۔ اب جو زلیخا دادی کے ہاتھ کے مزے مزے کے کھانے ملنے لگے تھے عقیل مغل بھی گھر میں کھانا کھانے لگے تھے ورنہ ماحور نہیں یاد پڑتا تھا کہ اس نے اپنے بابا کو کبھی گھر پر کھانا دیکھا ہو۔ باہر ہی سے پیٹ بھر کر آتے تھے۔ خوراک سے بھی اور نشے سے بھی۔

"جب تم لوگوں کا باپ چھوٹا تھا نا تو اسے مرغیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ سارا دن ان ہی کے سرہانے بیٹھا رہتا تھا۔ دانے پانی کا خیال رکھتا تھا بہت۔ ایک بار نہ جانے کس دوست کے منہ سے اچار چکن کا ذکر سن آیا۔ گھر آتے ہی مرغی نکالی اور چھری پھیر کر مجھے پکڑا گیا۔ کہنے لگا۔ "چاچی۔ اسے اچار کے مرتبان میں ڈال دیں۔ جب یہ اس کے مسالوں سے گل جائے گی تو اچاری ہو جائے گی۔ پھر میں کھاؤں گا۔" میں اور اس کے چچا بہت ہنسے۔ تب میں نے اس کے لیے پہلی بار اچاری چکن بنایا تھا۔ بڑا اچھا ہوتا تھا اپنا عقیل۔ بس قسمت کے پھیر ہیں۔ ورنہ تو۔"

وہ بڑے شوق سے بتا رہی تھیں۔ آخری جملے پر خود ہی بات بدل دی۔ وہ سب بہن بھائی انہماک سے مسکراتے ہوئے سن رہے تھے۔ انہوں نے کہاں اپنے باپ کے بچپن کے قصے سنے تھے۔ اب بھی زلیخا دادی بتاتیں تو یقین نہیں آتا تھا کہ عقیل مغل ایسے بھی کبھی رہے ہوں گے۔



"دادی۔ چپ کیوں کر گئیں آپ؟ کہیں نا۔ ابی کے بارے میں بات کرنے لگی تھیں نا؟" جنت نے انہیں اکسایا۔ ماحور نے آنکھیں دکھائیں اور فوراً بات کا رخ بدلا۔

"سیف۔ ریان ابھی تک گھر نہیں آیا۔ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند ہوں۔ خود سر ہوتا جا رہا ہے بہت۔ اس دن کے بعد سے بالکل گم صم سا ہو گیا ہے۔ پلیز تم معلوم کرو کہ اسے کیا پریشانی ہے۔ پلیز۔" ماحور کے ہر انداز میں ریان کے لیے فکر مندی تھی۔ زلیخا دادی نے تاسف سے اسے دیکھا جو اس دن کی ریان کی بدتمیزی بھلائے بالکل کسی ماں کی طرح اب بھی اس کی پروا کر رہی تھی۔

"اپیا۔ وہ مجھے کچھ نہیں بتائے گا۔ جب سے اس نے ٹیوشنز کرنی شروع کی ہیں تب سے ہی وہ خاصا ریزرو ہو گیا ہے۔ خیر آپ فکر نہ کریں میں پتا کرتا ہوں۔"

سیف کی بات ابھی منہ میں تھی کہ دھاڑ سے دروازہ کھلا اور عقیل مغل بے تحاشہ بیل کی طرح ڈکراتے اندر داخل ہوئے۔ نشے سے ڈولتے قدم اور لڑکھڑاتی زبان لیے وہ چھوٹی سی کھانے کی ٹیبل کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ ناک سے پورا زور لگا کر انہوں نے خوشبو سونگھی اور شہادت کی انگلی زلیخا دادی کی طرف لہرا لہرا کر بولے۔

"اچار والا گوشت بنایا ہے نا تم نے چاچی۔ ہے نا۔ تمہیں ابھی بھی یاد ہے کہ میں شوق سے کھاتا ہوں۔ لیکن چاچی تمہارے بعد مجھے کسی نے بنا کر ہی نہیں دیا۔ مجھے بھی کھلا دو چاچی۔ تھوڑا سا کھلا دو۔" وہ اتنے ترسے ہوئے لہجے میں بولے کہ زلیخا دادی کا دل بھر آیا۔ وہ بڑی دلگیری کے ساتھ ان سے مخاطب ہوئیں۔

"میرا بچہ۔ چاچی قربان۔ آ نا بیٹھ ادھر۔ میں خود اپنے بیٹے کو نوالے بنا کر کھلاؤں گی۔ تجھے اگر یاد ہے تو میں بھی کب کچھ بھولی ہوں لگے۔ آ بیٹھ۔"

زلیخا دادی جذباتی ہوتی فوراً اٹھیں اور عقیل مغل کو بازو سے تھام کر کرسی پر بٹھایا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ نشے کے زیر اثر بڑبڑاتے ہوئے کرسی سے لڑھک کر نیچے فرش پر آ رہے۔ زلیخا دادی ہائے وائے کرتی رہ گئیں مگر باقی سب کے لیے یہ منظر ہرگز عجیب نہیں تھا۔ عقیل مغل نشے میں بے سدھ ہو کر خراٹے لینے لگے تھے۔ سیف اپنی جگہ سے اٹھا اور صوفے سے کشن اٹھا کر ان کے سر کے نیچے رکھا۔ اندر سے کمبل لے کر آیا اور انہیں اوڑھا کر خود واپس کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ دادی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ کیسی زندگی گزری تھی ان بچوں کی بھی۔ باپ ہوتے ہوئے بھی مُردوں سے بدتر۔ اور ماں؟

اسی اثنا میں ماحور نے ریان کو اندر آتے دیکھا تو وہ یک دم غصے سے کھڑی ہو گئی۔ معمول کی طرح اس سے باز پرس کرنا چاہی مگر فوراً یاد آ گیا کہ ریان کے تیور اب وہ نہیں رہے۔ وہ سنبھل گئی۔ ریان کا چہرہ ستا ہوا اور پریشان تھا۔ وہ کچھ غائب دماغ سا بھی محسوس ہوا۔ چلتا ہوا سیدھا سیف کے برابر کی کرسی میں آ بیٹھا۔ زلیخا دادی نے جلدی سے اس کے آگے پلیٹ میں سالن نکال کر رکھا۔ ماحور ہاٹ پاٹ سے روٹی نکال ہی رہی تھی کہ ریان ایک جھٹکے سے اٹھا اور جوں کا توں کھانا چھوڑ کر کمرے میں چلا گیا۔ بس اس بار اس نے ٹھوکروں سے راستے میں آنے والی کسی چیز کو نہیں اڑایا تھا۔ سیف اور ماحور نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کوئی تو پریشانی تھی جو ریان کو اس نہج پر لے آئی تھی۔ ماحور کا جی کھانے سے اچاٹ سا ہو گیا۔ اس نے گلاس بھر کر پانی پیا اور گلے میں پھندا بن کر اٹکے آنسوؤں کو حلق سے نیچے اتارا۔ اس کے بہن بھائی اس کی کل کائنات تھے۔ ان کی تکلیف وہ بالکل ماں کی طرح محسوس کرتی تھی۔

زندگی میں جب بھی کچھ آسانی آنے لگتی تھی، مشکلیں حاسد بن کر اسے ہڑپ کیے جاتی تھیں۔ اس نے ہمیشہ زندگی میں ملنے والی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے پھول دکھ کے دھاگے میں پروئے تھے۔

☆☆☆

عادل پاشا اپنے آفس کی چیئر پر پورے کروفر سے براجمان تھے۔ اسٹیل گرے فریم والا نظر کا چشمہ

لگائے اپنے سامنے پڑے صفحات کو بغور دیکھ رہے تھے جو کچھ دیر پہلے ان کے خاص کارندے ایاز نے ان کے سامنے رکھے تھے۔ ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ لیے وہ ان کاغذوں پر درج تفصیل پڑھتے جاتے تھے اور ان کی آنکھوں کی خشونت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ گو کہ ان کی عمر پچاس کا ہندسہ عبور کر چکی تھی مگر ان کی وجاہت کو مات نہیں دے سکی تھی۔ وہ اب بھی بے حد ہینڈسم تھے۔ ان کے بالکل سامنے بیٹھا ایاز مرعوب سا خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ عادل پاشا نے اوپر والا کاغذ ہاتھ میں تھاما اور کرسی سے کمر ٹکتے ہوئے اسے آنکھوں کے قریب لا کر پڑھا۔ انہیں ہنسی آ گئی۔ ایاز کے آنے سے ذرا پہلے سالک کو انہوں نے بلایا تھا۔ وہ اس سے دوٹوک بات کرنا چاہتے تھے۔

''ابی۔ آپ نے بلایا تھا؟'' وہ آ کر ان کے سامنے بے حد ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں۔ مجھے تم سے پوچھنا تھا کہ پھر کب چلیں منصور راٹھور کی طرف۔ اس کی بیٹی سے تمہاری بات طے کرنے؟'' وہ بے حد سرسری لہجے میں اس سے دریافت کر رہے تھے۔ سالک کی بھنویں تن گئیں۔ گو وہ تیار تھا کہ عادل پاشا اس سے کسی بھی وقت اس بارے میں بات کرنے والے ہیں مگر پھر بھی وہ جی بھر کر بےزار ہوا تھا۔

''آپ کو جانا ہے۔ آپ سو بار جائیں ابی۔ مگر میری کسی سے بات طے کرنے نہیں۔ اس کام کے لیے آپ کو بس ایک ہی لڑکی کے گھر جانا ہے اور وہ ہے ماحور مغل۔''

''اس لڑکی کے باپ کی کوئی کمپنی ہے یا مل اونر ہے؟''

''جی نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ راٹھور اینڈ کو میں جاب کرتی ہے۔ آپ کو بتایا تھا۔''

''ہمم۔ بھول گیا تھا۔ اچھا تو کتنی بار ملے ہو اس لڑکی سے۔ آئی مین کتنا جانتے ہو اسے؟''

''جاننے کی ضرورت نہیں ابی! کیونکہ میں اسے اپنانا چاہتا ہوں۔ جانا انہیں جاتا ہے جنہیں پرکھنے کی حاجت ہو اور مجھے نہ اسے جاننا ہے نہ پ... ہے۔ بس اپنانا ہے۔''

اس کی بات پر وہ ہنسے۔ ایسی ہنسی جس نے سالک کو کھولا کر رکھ دیا۔ مگر برداشت کرنا بھی اس کی عادت تھی۔

''آہاں۔ کیا اس کا گھر اور رہن سہن ہم ... میل کھاتا ہے؟''

ان کے سادے لہجے میں چھپے طنز کو بخو... سالک نے سہا تھا اور جو جواب اس نے دیا، وہ عاد... پاشا سہہ نہیں پائے۔

''کیا ناعمہ پاشا کا گھر اور رہن سہن ہم ... میل کھاتا تھا؟''

''شٹ اپ۔ ایک دو ٹکے کی لڑکی ... تمہارے منہ میں اتنی زبان ڈال دی کہ آج تم ا... باپ کو طعنے دے رہے ہو۔ میری نرمی کو میری کمزور... سمجھ رہے ہو؟''

''میں نے آپ کو طعنہ نہیں دیا ابی! محض ب... ہے کہ ان باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب دل ... جائیں تو بھلا گھر اور رہن سہن کی کیا حیثیت رہ جا... ہے۔ ماحور مجھے پسند ہے۔ میں اسے اپنے سا... ایڈجسٹ کر لوں گا۔'' وہ اب بھی بے حد نارمل ا... پرسکون تھا۔ وہ عادل پاشا کے غصے سے بظاہر ... مرعوب نہیں ہوا تھا۔ کچھ پل دونوں باپ بیٹا آنکھو... میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کے عزائم پرک... رہے اور پھر سالک پاشا اٹھ کر چلا گیا تھا۔ تب سے ... جیسے انگاروں پر لوٹ رہے تھے اور اس جلن پر ایا... نے آ کر پانی ڈالا تھا۔ اس کے پاس ماحور کا مکمل با... ڈیٹا موجود تھا۔ الف سے لے کر یے تک ہر تفصیل ... ایاز لے کر حاضر ہوا تھا۔ جوں جوں عادل پاشا، ماحو... کے متعلق جانتے جا رہے تھے ان کے ہونٹوں ... کنارے پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ ان کا شک ٹھیک ... نکلا تھا۔ ماحور کی بدقسمتی کہ اس کا پالا عادل پاشا سے ... چکا تھا۔ وہ چیونٹی کو پر نکلنے سے پہلے مسل دینا جا... تھے۔ انہوں نے ہنکارا بھر کر ایاز کی طرف وہ کا... بڑھایا اور بولے۔

''اس مختار انصاری کا پتا کرواؤ۔ اسے ملواؤ مجھ سے۔ بہت کام کا آدمی لگ رہا ہے۔''

''جی سر۔ میں آپ کو جلد انفارم کرتا ہوں۔ خدا حافظ!'' ایاز اتنا کہہ کر جا چکا تھا۔ اس کے جاتے ہی عادل پاشا نے ایک زوردار سفاکانہ قہقہہ لگایا تھا۔ وہ اپنے سامنے ماحور کی بےبسی کو ناچتا دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

سالک پاشا کھولتے دماغ کے ساتھ اپنے آفس میں چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی عادل پاشا کے پاس سے آیا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ماحور سے محض اس کے اسٹیٹس کی وجہ سے خار کھا رہے تھے۔ اسے ان کی آنکھوں میں سفاکیت دکھائی دی تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ عادل پاشا اپنے مفاد کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتے تھے اور ماحور کو راستے سے ہٹانا ان کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ ایک غلط فہمی جو دل میں تھی کہ اس کی خوشی کی خاطر وہ ماحور کو بہو کے طور پر قبول کر لیں گے، آج کافور ہو گئی تھی۔ محبت انسان کو جس قدر بہادر بناتی ہے، اسی قدر بزدل بھی بنا دیتی ہے۔ محبت کرنے والا خود سے زیادہ اپنے محبوب کے لیے فکرمند رہتا ہے۔

وہ چکر کاٹ کاٹ کر اکتا گیا تو اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ انٹرکام پر کافی کا کہہ کر اس نے زرش سے مومن کو اندر بھیجنے کے لیے کہا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ آج لیو پر تھا۔ اس کی مومن سے بہت اچھی دوستی ہو چکی تھی اور اکثر جب وہ بےزاریت کی انتہا پر ہوتا تھا تو اس سے گپ شپ لگا کر ہشاش بشاش ہو جاتا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے آنکھوں کو مسلا اور یونہی انہیں موند کر سیٹ کے ساتھ سر ٹیک لیا۔ اسی اثنا میں اسے اپنے سیل پر میسج ٹون سنائی دی۔ وہ تیزی سے سیدھا ہوا اور فوراً میسج اوپن کیا۔ روم روم جیسے ستاروں کی بارش میں نہا گیا۔ اس کی چاہت کی خوشبو خوش رنگ تتلی کے پروں پر سوار ماحور کے گرد ہالا بنا چکی تھی۔ جس میں وہ کسی چودھویں کے چاند سے زیادہ تابناک دکھائی دیتی تھی۔ اس نے نگاہوں میں عقیدت و محبت کی روشنی بھر کے ماحور کی بھیجی گئی غزل کو پڑھنا شروع کیا۔

''ایسی ہمت نہ اب عطا کیجیے
جو کہے، جائیے خطا کیجیے
گر نباہیں گے تو، ملا کیجیے
راہ ورنہ یہیں جدا کیجیے
اس کو منزل نہیں کہا کرتے
روز جس کو بدل لیا کیجیے
موسمی شے نہیں محبت یہ
کیجیے گر تو پھر سدا کیجیے
بے وفا لاکھ ہو زمانہ اب
آپ کا کام ہے وفا کیجیے
سر پٹختا ہے لفظ لفظ مرا
اب نہ سمجھے کوئی تو کیا کیجیے
لوگ کرتے ہیں دل لگی ابرک
آپ یوں ہی نہ مر مٹا کیجیے

(اتباف ابرک)

اس کے وجیہہ چہرے پر خماری سی چھا گئی تھی۔ وہ تصور میں ماحور کا حسین چہرہ دیکھ رہا تھا جس پر وہ جی جان سے فریفتہ ہو چکا تھا۔ اور جسے اب ہر لمحہ، ہر پل وہ اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ اب اس کے بغیر جینا محال تھا۔ اسے جلد از جلد فائنل اسٹیپ لینا ہو گا۔ یہ سوچ آتے ہی اس نے فوراً ناعمہ پاشا کے سیل فون پر انہیں کال کی۔ دو تین بیلوں کے بعد دوسری طرف وہ موجود تھیں۔ ایک طویل سانس چھوڑ کر وہ ان سے کہہ رہا تھا۔

''ابی بہت غصہ ہیں مجھ پر۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ آج کل میں ہی ماحور کے گھر جا کر رشتے کی بات کر دیجیے۔ میں مزید انتظار نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے پہلے کہ ابی کچھ ایسا کر گزریں جو ہم دونوں ہی کی توقعات سے الٹ ہو، آپ جا کر ماحور کو میرے نام

کر آئیں۔ میں اب اس سے کسی صورت دستبردار نہیں ہوسکتا۔ خدا حافظ۔"

دوسری طرف سے ناعمہ پاشا کا جواب سنے بغیر اس نے کال کاٹ دی تھی۔ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح دوٹوک تھا بس اب اس میں کچھ نرمی آچکی تھی۔ اسے احساس تھا کہ ناعمہ پاشا ہی وہ پُل ہیں جس کی مدد سے وہ ماحور تک پہنچ سکتا تھا۔

☆☆☆

مومن، دادا کو ناشتا کروا کے ان کی دوائیں لینے نکلا تھا۔ شکر۔ کہ اتوار تھا اور آفس سے چھٹی تھی کیونکہ دادا کی وجہ سے ساری رات پریشانی کے عالم میں وہ سوئی جاگی کیفیت میں رہا تھا۔ وہ کل دادا کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ تفصیلی چیک اپ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے بائی پاس کا مشورہ دیا تھا۔ مومن یک دم پریشان ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق دادا کے دل کی دو شریانیں بند ہیں۔ زیادہ دیر ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی۔ اس لیے جتنی جلدی ہو سکے آپریٹ کروانے کے لیے کہا تھا۔ مسئلہ دادا کا آپریشن کروانا نہیں تھا۔ مسئلہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا تھا۔ ابھی اس کی جاب نئی نئی تھی۔ تنخواہ بھلے اچھی تھی مگر وہ کچھ خاص سیونگ نہیں کر پایا تھا۔ جب امی بیمار تھیں تو دادا نے ان کے علاج کے لیے ایک دکان بیچ دی تھی۔ پیچھے ایک ہی دکان مزید بچی تھی جس کے کرائے پر اسے جاب ملنے سے پہلے تک گھر کا خرچ چلتا رہا تھا۔ اگر اسے بیچ دیا جائے تو پیسے تو اچھے مل سکتے تھے مگر یہ دکان بکنے میں کتنا وقت لگتا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا اور دادا تو اس بات کے لیے رضامند بھی نہ ہوں۔ وہ بنا آپریشن کے رہ سکتے تھے مگر یہ آخری دکان کبھی نہ بیچتے۔

جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالے وہ روڈ کراس کر رہا تھا جب اسے آفس سے لون لینے کا خیال آیا۔ ہاں۔ یہ ممکن ہے۔ اسے کچھ تسلی ہوئی۔ وہ جیب میں رکھے پرسکرپشن کو تھپتھپاتا ہوا میڈیکل اسٹور میں داخل ہوا ہی تھا کہ اپنے پیچھے لڑکوں کا شور سن کر ٹھٹک کر رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر لڑکوں کا ایک گروپ آپس میں بھڑ پڑا تھا۔ مومن نے ذرا اچک کر دیکھا تو تین چار لڑکے ایک اکیلے لڑکے کو گھیرے میں لیے پیٹ رہے تھے۔ ارد گرد لوگ اکٹھے ہونا شروع ہوگئے تھے مگر چھڑا کوئی نہیں رہا تھا۔ وہ تاسف سے اس منظر کو دیکھتا نگاہ پھیرنے ہی والا تھا کہ یک دم اسے پٹنے والے لڑکے پر ریان کا گمان گزرا۔ وہ فوراً اسٹور سے باہر نکلا اور ان کے قریب آ کر شک کی تصدیق کی۔ وہ سو فیصدی ریان ہی تھا جسے وہ چاروں مار رہے تھے۔ کوئی اور پٹ رہا ہوتا تو مومن ترآب ناک پر سے مکھی اڑاتا نکل جاتا مگر یہ ماحور کا بھائی تھا، اسے وہ یہاں اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر زیر لب اسے "سالا" کہا اور کود گیا ان سب کے بیچ۔ چار کے یہاں سے مارے، چار لاتیں وہاں سے دھریں۔ مریل سے سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے تھے۔ کسرتی بازوؤں کی دھلائی کے آگے زیادہ دیر نہیں ٹک سکتے تھے۔ ریان بھی مومن کو دیکھ کر شیر ہوگیا۔ اندھا دھند مارتا چلا گیا۔ ذرا سی دیر میں لوگوں کے ٹکٹ کے پیسے پورے ہوگئی ہے تو بیچ بچاؤ کرنے درمیان میں آگئے۔ وہ لڑکے مومن سے مرعوب سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے ایک لڑکا بولا۔

"دیکھیں۔ آپ جو بھی ہیں، میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں۔ ریان نے میرے پیسے دینے ہیں۔ مجھے میری رقم دلوائیں۔"

"کیسے پیسے اور ریان نے کیوں لیے تھے بھلا؟" وہ اچنبھے سے پوچھ رہا تھا۔ ریان تیزی سے اس کے قریب آیا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے لگا تھا مگر مومن نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ لڑکا خاصا تپا ہوا تھا۔ اچھل اچھل کر منہ کو آتا ہوا بولا۔

"اس کا کسی لڑکی سے چکر وکر ہے۔ اسے ٹیوشن پڑھانے کے بہانے دل لگی کرتا رہا ہے۔ وہ



اسے الو بناتی رہی اور یہ مجھ سے رقمیں لے لے کر اس کا گھر بھرتا رہا ہے۔ اس سب میں اس لڑکی کی ماں بھی شامل تھی۔ اس فقیر کی اولاد کے پاس پیسے کہاں، اس لیے مجھ سے ادھار لیتا رہا۔ پونے دو لاکھ دیا ہے اسے میں نے پونے دو لاکھ۔"

"تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟" مومن نے اس کے چھچھورے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال پوچھا تو وہ مزید گردن اکڑاتا ہوا بولا۔

"دو بھائی میرے قطر میں ہوتے ہیں۔ میرے باپ کا تین منزلہ الیکٹرانکس کے سامان کا اسٹور ہے۔ میرے لیے اتنی رقم ادھار دینا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں خود بھی اسی اسٹور پر بیٹھتا ہوں۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ تین ماہ کے اندر اندر رقم واپس کردے گا مگر اب چوتھا مہینہ بھی گزر گیا ہے۔ آخر۔ مجھے بھی جواب دینا ہے۔"

مومن کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ لڑکا نو دولتیا ہے۔ لیکن اصل سوچ جو اس کے دماغ میں ادھم مچا رہی تھی وہ یہ کہ ریان کو اس مصیبت سے کیسے نکالا جائے۔ فی الوقت اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور اس لڑکے کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

"یہ پکڑو میرا کارڈ۔ کل مجھ سے مل لو۔ نکالتے ہیں تمہارے مسئلے کا حل۔"

"حل نہیں۔ مجھے میری رقم چاہیے۔" اس لڑکے کی سوئی رقم پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"حل سے مراد، تمہاری رقم ہی ہے۔ جاہل انسان۔" آخری لفظ زیر لب کہتے ہوئے مومن نے بظاہر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ وہ لڑکا ریان کو کینہ توز نظروں سے دیکھتا اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ مومن نے سینے پر بازو لپیٹتے ہوئے پلٹ کر برہمی سے ریان کو دیکھا تو وہ سر جھکائے اپنے جوتے کی نوک سے سڑک پر ہلکی ہلکی ٹھوکریں لگا رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے نظر ملانے سے کترا رہا ہے مگر ملانی تو تھی۔

"وہ..... مومن بھائی۔ اصل میں مجھے پھنسایا گیا ہے۔"

"ہمم....." اس نے اسی انداز میں ریان کو دیکھتے ہنکارا بھرا۔

"وہ لڑکی میری اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کی امی نے ادھار مانگا تھا مجھ سے۔ میں نے دانش سے لے کر دے دیے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ واپس نہیں کریں گی۔ دانش بالکل بکواس کر رہا ہے۔ میں نے کوئی سامان شامان نہیں ڈلوایا ان کے گھر۔" وہ ہکلاتا ہوا اپنے دوست کا حوالہ دیتے ہوئے بودی دلیلیں دے رہا تھا۔

"تم ابھی بھی جھوٹ بول سکتے ہو ریان! حیرت ہے۔ جبکہ کسی کے گھر فرنیچر انلوڈ کرواتے ہوئے تو خود میں اپنی آنکھوں سے کہیں دیکھا ہے۔ جس کے بعد اس گھر کا گیٹ خاصی بے مروتی کے ساتھ تمہارے منہ پر بند ہوا تھا۔"

ریان ہکا بکا رہ گیا۔ اس کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اب بات بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ پکڑا جائے گا۔ لہٰذا اسے سب کچھ سچ سچ بتانا پڑا۔ اس کی سچ بیانی کا لب لباب یہ تھا کہ چند ماہ پہلے اسے کسی دوست کے توسط سے یہ ٹیوشن ملی تھی۔ لڑکی خاصی کند ذہن مگر جاذب نظر تھی۔ سارا دھیان پڑھائی کے بجائے بننے سنورنے اور باتیں بنانے پر تھا۔ ناز و انداز کا استعمال بخوبی کر لیتی تھی اور اسی کے ذریعے ریان کو قابو کیا۔ پیچھے ماں کی مکمل شہ تھی جس کی اپنی شہرت بھی محلے میں کچھ اچھی نہیں تھی۔ شوہر ملک سے باہر اور بیٹے دست نگر۔ اس لیے اپنے ڈھب پر چلائے جا رہی تھی اولاد کو۔ ریان کو بے وقوف بنا کر کبھی رقم نکلوائی گئی تو کبھی فرمائشیں کر کر کے گھر کا کتنا ہی سامان بنا ڈالا۔ یہ آخری کھیپ تھی جو ریان کے طفیل فرنیچر کی صورت گھر میں گھسا کر اس پر گھر کے دروازے بند کر ڈالے گئے۔ کیونکہ گھاگ عورت تھی، اندازہ ہوگیا تھا کہ مزید اس سے کسی قسم کا فائدہ ملنے کی توقع عبث ہے۔ اس کے بعد کی کہانی یہ تھی کہ جس دوست سے ریان نے قرض لے کر اس لڑکی کا گھر بھرا تھا، وہی دوست اب جان کو آگیا تھا۔ اسے کسی طرح بھی اپنی رقم واپس چاہیے تھی اور ریان صاحب

مسلسل ہال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ دوست نے دوستی کا چولا اتارا اور چارا پنے جیسے لفنگے اکٹھے کر کے آج ریان کی دھلائی کے لیے لے آیا تھا۔

ساری بات سن کر مومن سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں اس وقت قریب ہی ایک پارک میں باڑھ کی آڑ میں بیٹھے تھے۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا اور وہ تھا رقم کی واپسی۔ مگر کیسے؟ مومن آنکھیں پٹپٹا پٹپٹا کر سامنے جھولا جھولتے اور سلائیڈز لیتے بچوں کو انتہائی انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ ذہن میں ایک ہی جملہ ٹکریں مار رہا تھا۔

"بھگت بیٹا سالے کا کارنامہ۔ بہن رشتہ لانے کے لیے دن نہیں بتا رہی اور یہاں سالا صرف ٹائم پاس کے چکر میں پورا جہیز "سہیلی" کو گھر پر ہی بنا بنا کر دیتا رہا۔ کیا "پیس" ہیں یہ سب کے سب۔"

"مومن بھائی۔" ریان کی سہمی سہمی سی آواز کانوں میں پڑی تو وہ چونکا۔ "وہ۔ اپیا کو مت بتایئے گا۔ مجھ سے پہلے ہی خفا ہیں وہ۔ پلیز اگر آپ نے یہ سب بتا دیا تو وہ نہ جانے کیا کر ڈالیں۔"

"دیکھو ریان! ماحور کو تو بتانا پڑے گا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ بس مصلحتاً یہ کہنا پڑے گا کہ تمہارا قرض اتر چکا ہے۔ تاکہ وہ اس بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہ ہو۔ مگر اتنی بڑی بات چھپانی مناسب نہیں۔ وہ لڑکا دانش، سیف کو بھی بتا سکتا ہے۔ اس صورت میں نتائج سنگین ہوں گے۔"

"لیکن مومن بھائی۔ قرض اترے گا کیسے؟ میں تو ایک ہی ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ میرے پاس پیسے آئیں گے کہاں سے؟"

"وہ تم فکر مت کرو۔ ہو جائے گا بندوبست۔ چلو گھر چھوڑ کر آتا ہوں تمہیں اور سنو۔ ماحور سے اپنے سابقہ رویے کی معافی مانگنی ہو گی تمہیں۔ سمجھے؟" اس کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ریان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ریان آج کل ماحور کے ساتھ بے حد اکھڑا اکھڑا رہتا ہے۔ وہاں سے اٹھ کر مومن نے میڈیکل اسٹور سے دادا کی میڈیسن لی اور پہلے ریان کے ساتھ اپنے گھر گیا۔ دروازہ شاویز نے کھولا تھا۔ اسے دوائیں پکڑا کر اور دادا کو کھلانے کے بارے میں ہدایت دے کر وہ ریان کے ساتھ اس کے گھر پہنچا۔ گیٹ نیم وا تھا اور اندر سے کسی خاتون کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مومن نے باہر کھڑے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا

"کون؟" ریان نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"دادی۔"

مومن کی آنکھیں حیرت سے وا ہوئیں۔ ریان اس کا کندھا تھپتھپاتا ہوا بولا۔

"آپ اندر تو چلیں۔ بڑی مزے کی چیز ہیں۔ ایک دم ہی پیدا ہوئی ہیں۔ میرا مطلب آئی ہیں۔"

مومن اس کی بات پر ہنسی دباتا اندر داخل ہوا۔ سامنے کا منظر بڑا عجیب تھا۔ ماحور اور رائنہ صحن کے بیچوں بیچ دالوں اور مسالوں کے دھلے ہوئے خالی ڈبے صافی سے خشک کر رہی تھیں۔

"آے ہائے۔ ماحور تم تو بچوں کو کیڑے ہی کھلاتی رہیں ساری عمر۔ لو بتاؤ۔ کبھی ڈبوں کو نہ ہوا لگوائی نہ صاف کیا۔ کیسی بساند کر رکھی ہے ان میں۔ نہ جانے کیا کھاتے رہے غریب۔" آخری فقرہ انہوں نے خود کلامی کے انداز میں بولا تھا۔

"بس زہر نہیں کھلا سکی دادی۔ ورنہ کئی بار ایسے حالات بھی دیکھے جب کھانے کے لیے سب سے سستی شے یہی دستیاب تھی۔"

"ماحور بچی۔ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ بھول جا بیٹا۔" اس کے لہجے کی تلخی پر زلیخا دادی نے اسے ٹوکا تھا، جب بھی وہ اس لہجے میں گفتگو شروع کرتی، وہ اس کی بات کا رخ بدل دیتی تھیں۔ "چلو اب اٹھاؤ انہیں اور اندر لے کر جاؤ سارے ڈبے اور مینڈکی۔ تم چائے بنا کر لاؤ ذرا۔ ایک تو ساس تمہاری گھر میں نہ ہو تو تم سارا دن یہیں ٹنگی رہتی ہو۔" دادی نے لگے ہاتھوں ڈبے سمیٹتی رائنہ کو بھی لتاڑا۔ جواب میں وہ چمک کر بولی۔

"آپ کی غلط فہمی ہے دادی۔ وہ گھر میں بھی ہوں تب بھی میں اکثر یہاں ٹنگنے کے لیے آ جاتی ہوں۔ کیونکہ وہ مجھ سے اتنی عاجز آئی رہتی ہیں کہ مجھے فارغ دیکھتے ہی ماہی کی خیر خبر لینے بھیج دیتی ہیں۔" اس بات پر ماحور اور وہ خود کھلکھلا کر ہنس دیں۔ جواب میں زلیخا دادی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن نظر گیٹ سے گردنیں اندر گھسائے ریان اور مومن پر پڑیں۔ دونوں ابھی تک مکمل اندر داخل نہیں ہوئے تھے۔

"اے ریان! بے شرم۔ یہ کون مشٹنڈا تیرے پیچھے کھڑا ہے۔ دیکھ تو کیسے اونٹ جیسی لمبی گردن اندر گھسا کر جائزہ لے رہا ہے۔"

مومن سٹپٹا کر فوراً پورا اندر داخل ہوا اور سلام داغا۔ ماحور اور رائنہ فوراً پلٹیں۔ سیف بھی آوازیں سن کر اندر سے برآمد ہو گیا۔ مومن کو دیکھ کر وہ بڑے تپاک سے اس کی جانب بڑھا۔ ماحور کی آنکھوں میں خوشی روشنی بن کر پھیل گئی۔ دل بہت شدت سے یاد کر رہا تھا اسے۔ وہ زلیخا دادی کو مومن کے بارے میں بتا چکی تھی اور اس کا تعارف کروانے کے لیے آگے بڑھی۔ مگر پہلے ہی سیف نے یہ کام انجام دے دیا۔

"اچھا اچھا۔ میں صدقے جاؤں۔ تم مومن ہو۔ آ جا میرا بچہ۔ آ بیٹھ ادھر۔ برا نہ منانا۔ بڈھی ہو گئی ہوں نا تو بس جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہوں۔"

زلیخا دادی اتنی محبت سے اس کی جانب بڑھیں کہ ایک پل کو وہ حیران ہی رہ گیا۔ ماحور کو دادی کا التفات دیکھ کر بہت اچھا لگا تھا۔ رائنہ اس کے پہلو میں خواہ مخواہ کہنیاں چبھو چبھو کر نا جانے اس سے کیا کروانا چاہ رہی تھی۔ شاید وہ چاہتی ہو کہ ماحور دوپٹا انگلی پر لپیٹ کر شرمانا شروع کرے۔ ماحور نے جوابی کہنی اس زور سے اس کی پسلی میں چبھوئی کہ رائنہ کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"ماہی! ان دونوں کے منہ سوجے سوجے سے نہیں لگ رہے تمہیں۔ دیکھو تو۔ ایسے جیسے کہیں سے پٹ کر آئے ہیں۔"

ماحور نے بھی دھیان دیا تو ریان کے چہرے پر تو ابھی خاصی خراشیں تھیں مگر مومن کا بالائی ہونٹ کا کنارہ سوجا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی، دادی نے جھٹ اپنے قریب ہی کرسی ڈلوا کر مومن کو بٹھایا اور بڑی چاہت سے اس سے سوال جواب کرنے لگیں۔ وہ اس سے دادا کی صحت کے بارے میں بھی استفسار کر رہی تھیں۔ ماحور کی زبانی انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔ مومن بے حد سجاؤ سے انہیں جواب دے رہا تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ ماحور کے گھر بھی کوئی معقول شخص نظر آیا۔ ان کی اس قدر آؤ بھگت دیکھ کر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ رشتے کی بات وہ خود ہی کر لے۔

"دیکھو بیٹا۔ تمہارے دادا جب چاہیں، یہاں آ سکتے ہیں۔ عقیل مغل کی جرات نہیں کہ میرے آگے دم مار سکے۔ ان بچوں کی ذمہ داری اب میری ہے۔ ماحور کو بیاہنا میرا مسئلہ ہے۔ اس لیے دادا سے کہنا کہ وہ جب مناسب سمجھیں، آ جائیں۔ بات پکی کرنے۔"

یک دم زلیخا دادی ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مومن نے تشویش سے انہیں دیکھا۔ باقی سب پر ایک نظر ڈالی تو سبھی کو سکتے کے عالم میں پایا۔ سب کے سب اس کی پشت پر۔ گیٹ کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کوئی صور تھا جو یک دم سارے میں پھونک دیا گیا تھا۔ مومن نے حیرت زدہ پلٹ کر گیٹ کی جانب دیکھا۔ ایک انتہائی دلکش اور جامہ زیب خاتون وہاں نم آنکھیں لیے کھڑی تھیں۔

"تم تو..... تُو..... یہاں؟" دادی کے منہ سے تین لفظ سرسراتے ہوئے نکلے۔

"امی۔" سیف، ریان اور ماحور کے منہ سے آگے پیچھے نکلا یہ لفظ بڑا نامانوس سا لگا۔ ماحور کے ہاتھ سے خالی ڈبے چھوٹ کر صحن میں لڑھکتے چلے گئے۔ رائنہ نے اس کے کانپتے جسم کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ ریان کا تنفس تیز ہوا تھا اور وہ آخری حد تک ضبط کرتے ہوئے تیزی سے اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ جبکہ سیف بے جان سا یک ٹک انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ ان کی ماں چودہ سال بعد ان کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ آخر کار نائمہ پاشا نے ایک بار پھر اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

## فرح بخاری

# اس برس

قدرت کے ان گنت حسین نظاروں میں سے ایک ہے، نیلے بیکراں سمندر کے دور تک دکھائی دیتے کنارے کا نیلے آسمان سے ملاپ۔ سمندر کی شوریدہ سر لہروں کو دیکھتے انسانی دماغ میں نجانے کیا کچھ آتا ہوگا، لیکن کویت کی مغربی کارنش پر بنی اس پانچ منزلہ بلڈنگ کے تھرڈ فلور کی کھڑکی سے جھاگ اڑاتے سمندر کو دیکھتے وہ صرف ایک ہی بات سوچا کرتی کہ دل کا حال کسی کاغذ پر لکھ کر روز کے روز اس سمندر کے حوالے کر دیا کرے۔ قلم سے پانیوں کی سپردگی کے بیچ جو بوجھ بھرا دل پڑتا ہے کم از کم وہ تو ہلکا ہو جائے گا۔ لیکن پھر ایک سوچ...... کہ الفاظ کی سیاہی نیلے پانیوں میں مل کر جب بے مول و بے مایہ ہو جائے گی، ایسے کہ نہ کوئی انہیں دیکھنے والا نہ سمجھنے والا تو دل کا بوجھ گھٹنے کے بجائے شاید کچھ اور بڑھ جائے اور وہ گھٹن بھری سرد آہ بھرتے پردے برابر کر کے واپس پلٹ آتی۔

تب دوسرا خیال دل میں یہ پیدا ہوتا کہ دل کی ایک ایک بات خوب کھول کر ایک خط میں لکھ دے اور اس خط کو کسی نامعلوم پتے پر روانہ کر دے۔ دل میں موہوم سی ایک اُمید سکون بن کر ضرور اُترے گی کہ کسی انسان نے تو اس کا خط پڑھا ہی ہوگا۔ باتیں رائگاں نہیں جائیں گی۔ لیکن نہیں یہ سب بس سوچنے کی باتیں تھیں۔ سب رائگاں چلا گیا اور بالآخر اس کی کہانی کو ایک دردناک انجام سے دوچار کرتے، چھ سال بھی بیت ہی گئے۔

کویت سے خالی دل، خاموش لب اور برف سی آنکھیں لیے سمن رُباب ہمیشہ کے لیے واپس آ گئی۔ کسی سے کہنے کو کچھ باقی نہ رہا کیونکہ اُسامہ جمیل نے خاکی لفافے میں جواب تھما کر اسے کچھ بھی بولنے کی زحمت سے بچا لیا تھا۔ گھر سے ایئرپورٹ کا سفر عجیب بے یقینی کی کیفیت میں گزرا، جو وہ چاہتی تھی آخر کار ہو گیا تھا۔

اب بظاہر وہ آزاد تھی، اپنے وطن میں، اپنوں کے بیچ۔ لیکن چند ہی گھنٹوں کے اندر لوگوں کی نظروں اور باتوں نے احساس دلا دیا کہ یہ آزادی اس حقیقی خوشی سے اب بھی خالی ہے جو اس موقع پر محسوس کی جانی چاہیے تھی۔ اُسامہ کا تحفہ ”احسان“ نہیں ملامت تھا جو سمن کے ناکردہ گناہوں پر سزا کے طور پر مسلط کیا گیا تھا۔ اس کی فلائٹ کے اڑان بھرتے ہی اُسامہ نے پاکستان میں مطلع کر دیا کہ وہ کس قصور کی سزا پاتے طلاق لے کر واپس آ رہی ہے۔ میکے اور سسرال میں آگ جیسی پھیلتی اُس خبر نے تین ہی گھنٹوں کے سفر میں اسے اذیت کے ایک سمندر سے دوسرے میں لا دھکیلا تھا۔

لاہور ایئرپورٹ پر اسے آپا کے دیور عظمت ریسیو کرنے آئے کیونکہ وہ لاہور میں رہتے تھے اور





آپا نے ان کے ذمے لگایا تھا کہ ان کی بہن کو بس میں باحفاظت بٹھا آئیں۔

اور اب وہ اپنے گھر میں تھی آپا کے سامنے۔ آنکھوں میں عجیب خالی خالی سی وحشت لیے ان کے سینے سے لگ جانے کو بے تاب۔ بیگ پھینک کر بازو کھولتے وہ ان کی طرف بے تابانہ بھاگی۔ لیکن آپا کا سردپاٹ چہرا کسی بھی قسم کے جذبات سے بالکل عاری، ایک دم صاف سلیٹ تھا۔ وہ دیر تک سختی سے انہیں بھینچے ان کے بازوؤں کی گرمی پانے کی منتظر رہی لیکن وہ تو اسے ایک جھوٹا دلاسا تک دینے میں ناکام رہی تھیں۔

”جاؤ۔ کمرے میں آرام کرو، بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔“ وہ بس اسے ہلکا سا تھپک کر کچن کی طرف چلی گئیں اور سمن بس حیرت سے ان کی پشت کو دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

”ہائے سیرت! مجھے آپ سے اپنا ایک مسئلہ ڈسکس کرنا ہے۔“

”جی جی بتایئے۔ بے جھجک ہو کر لکھتی جایئے میں آرام سے پڑھ کر آپ سے بات کرتی ہوں۔“

سیرت نے جلدی سے ثمرہ کے ان باکس میں ٹائپ کیا۔ تین لوگ اور بھی آن لائن تھے۔ وہ سب

کی پیٹ آرام سے پڑھ کر ساتھ ساتھ ریپلائی کرتی جارہی تھی۔

"مجھے لوگوں کو دوست بنانا نہیں آتا۔ کسی کا دل کیسے جیتا جاتا ہے، محفل میں نمایاں کیسے ہوا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اعتماد سے بات کیسے کی جاتی ہے، میں ان معاملات میں بہت پیچھے ہوں، میں اسکول اور کالج میں کبھی کسی گروپ کا حصہ نہیں بن سکی، میرے چپ چاپ بیٹھے رہنے کی وجہ سے لوگ جلد مجھے چھوڑ جاتے ہیں۔" ثمرہ نے تفصیل سے اپنی پرابلم لکھ دی۔ سیرت نے توجہ سے ثمرہ کا مسئلہ پڑھتے اسے کال ملادی.....

"کیسی ہیں ثمرہ؟"

"بالکل ٹھیک، سیرت جی! مجھے یقین نہیں ہورہا میری آپ سے بات ہورہی ہے۔" ایک پتلی آواز والی لڑکی نے شرمیلے انداز میں آغاز لیا۔

"میری دوست لیلیٰ نے کچھ دن پہلے اپنا ایک مسئلہ آپ سے ڈسکس کیا تھا۔ اس نے آپ کی بہت تعریف کی اس لیے مجھے بھی ہمت ہوئی۔"

"اور پتا ہے ثمرہ! آپ کا مسئلہ سن کر مجھے پندرہ سال پرانی سیرت یاد آگئی۔" سیرت نے اپنی میٹھی ،نرم آواز میں نہایت دوستانہ آغاز لیا۔ ثمرہ کو پہلے جملے پر ہی ہنسی آگئی

"اچھا واقعی؟"

"جی۔ تیرہ سال کی عمر میں، میں آپ سے کہیں زیادہ ڈری، سہمی، گھبرائی ہوئی سی ہوتی تھی۔ لوگوں کو فیس نہ کرسکنا، اعتماد کی کمی محسوس کرنا، آگے آنے کی خواہش تو رکھنا لیکن پھر عجیب عجیب وہموں میں گرفتار ہوتے ہمیشہ بیک پر رہنا۔"

"تو آپ نے خود کو کیسے تبدیل کیا؟"

"پہلے پہل تو دوسروں کو فالو کرنے کی بھونڈی کوشش کی کہ شاید ان جیسا بن کر آگے آیا جاسکتا ہے۔"

"جی بالکل، میں بھی ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔" ثمرہ اسے پورے دھیان سے سن رہی تھی۔

"لیکن یہ ایک غلط طریقہ ہے۔ ایک انسان کے پروان چڑھنے میں جن تین چیزوں کا گہرا اثر آتا ہے وہ اس کا خون، اس کی تربیت اور اس کا ماحول ہے۔ آپ جس انسان کو فالو کرنے کی کوشش کررہے ہوتے ہیں وہ کسی اور ماحول اور کچھ الگ حالات کا پروردہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر کوا چلا ہنس کی چال والا محاورہ صادق آتا ہے اور ایک بات یاد رکھیں ثمرہ! کہ اعتماد سے بولنا، ٹھہرنا، چلنا، محفل کی جان ہونا، گفتگو کے کمال دکھانا کوئی کامیابی کی دلیل نہیں ہے۔ ہے تو یہ بھی ایک ٹیلنٹ، لوگوں کی توجہ محض اپنی گفتگو، ہنسی مذاق یا چٹکلوں سے حاصل کرنا بھی ایک بڑا آرٹ ہے لیکن یہ سب خداداد ہوتا ہے۔ جن میں ہے انہوں نے اس کے لیے کوشش شامل نہیں کی اور جن میں نہیں ہے وہ کوشش کرکے بھی اسے حاصل نہیں کرسکتے اور ہاں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک عدم اعتماد کا شکار آدمی بااعتماد نہیں بن سکتا، بالکل بن سکتا ہے لیکن بس کوشش اتنی کریں جو متوازن لگے، مصنوعی پن سے اجتناب کرنا چاہیے۔ باقی جہاں تک آپ کی شخصیت کی بات ہے، مجھے لگتا ہے آپ نے ابھی تک اپنے ٹیلنٹ کو نہیں پہچانا۔ آپ کو جو خوبی اللہ پاک نے عطا کی ہوگی یا تو آپ کو اس کا علم نہیں ہے یا اس کی قدر نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے ٹیلنٹ کو پہچان کر اسے پالش کرنے کی کوشش کریں تو یقین مانیں آپ بنا ایک بھی لفظ بولے توجہ حاصل کرلیں گی۔

ہوسکتا ہے آپ ایک بہت اچھی آرٹسٹ ہوں، شاعرہ، لکھاری، بیوٹیشن، ڈیزائنر، سنگر، یا ایک بہت ہی ذہین اور لائق طالبہ ہوں۔ آپ کا ہنر آپ کے ہاتھوں میں بھی ہوسکتا ہے، آپ کی آواز میں بھی یا آپ کے دماغ سے متعلق۔ دوسروں کے پاس کیا ہے اس سے حسد یا رشک محسوس کرکے ان جیسا بننے میں وقت ضائع مت کریں۔ اپنے آپ کو پہچانیں اور اس میں، میں آپ کی مدد کروں گی۔ لیکن میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ آپ میری کہی



باتوں پر آرام سے سوچیں، خود کو تبدیل کرنے اور بہتر کرنے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے اُس پر غور کریں پھر کل ہم دوبارہ بات کرتے ہیں۔"

"تھینکس سیرت! مجھے واقعی بہت کچھ سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ میں کل پھر آپ سے بات کروں گی۔"

"جی۔ ان شاء اللہ ثمرہ! اپنا خیال رکھیے۔" سیرت نے ثمرہ سے اجازت لے کر باقی آن لائن افراد کو چیک کیا۔ کوئی مسز شمع اس سے فون پر بات کرنے کی ریکوئسٹ کررہی تھیں۔ سیرت نے ہیڈ فون دوبارہ لگالیا۔

☆☆☆

مارچ کی روشن، صاف صبح میں دھوپ اگرچہ تیز تھی لیکن چبھتی ہوئی بہرحال نہ تھی۔ دور تک دکھائی دیتی اس پکی کشادہ گلی کے آخری سرے پر ایک ہائی اسکول کا بورڈ آویزاں تھا۔ سفید گاڑی کو ایک نسبتاً زیادہ کھلے کنارے پر پارک کرتے وہ باہر نکلا تو گلی میں دور دور تک کوئی دکھائی نہ دیا۔ بہار کی صحت بخش ہوا کو نتھنوں کے راستے اندر کھینچتے اس نے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے اور دیر تک رک کر اس بورڈ کو بارہا دیکھا۔ ذہن میں کچھ سوچے سمجھے جملے ترتیب دیتے بے ساختہ اپنی امید بر آنے کی دعا مانگی۔

"کاش آج وہ اسے مل جائے۔" وہ گمشدہ دوست جس نے اس کی ذات پر آدھا ادھورا بھروسا کرتے، اپنی چند آدھی ادھوری نشانیاں بتا کر نجانے کیوں منہ ہی موڑ لیا تھا۔

"جی فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" خوش اخلاق پرنسپل نے مصافحہ کرتے اس سنجیدہ صورت، متاثر کن پرسنالٹی کے مالک مرد کو بغور دیکھا۔

"مجھے اس ایریا میں ایک آدمی کی تلاش ہے۔ زیادہ معلومات نہیں رکھتا اس لیے بلاوجہ مشکوک تصور کرلیا جاتا ہوں۔ ایکچوئلی مشکل میں ایک حضرت نے کچھ مدد کی تھی ان کا قرض لوٹانا چاہتا ہوں۔"

"جی جی کیا نام ہے ان کا۔ شاید میں کسی کام آسکوں۔"

"ارسلان نام ہے ان کا اور پیشے سے استاد ہیں۔ میں نے سوچا شاید اس اسکول....."

"کیا وہ اسی ایریے میں رہتے ہیں؟"

"معذرت خواہ ہوں لیکن نہیں جانتا۔" وہ بس یہی کہہ پایا

"جی، میرے پاس اس نام کا کوئی ٹیچر کام نہیں کرتا، البتہ قریب ایک دو پرائیویٹ اسکول اور ہیں وہاں معلوم کرلیں۔" خوش اخلاق پرنسپل بس یہی کہہ پائے۔ اب بھلا اس سے زیادہ وہ کیا مدد کرتے۔

☆☆☆

"میرا یقین کریں آپا! بات وہ نہیں ہے جو آپ کو اسامہ نے بتائی ہے۔ آپ ایک بار مجھے شروع سے سب کچھ بتانے دیں۔ مجھے یقین ہے آپ پر سب واضح ہوجائے گا۔"

"تمہاری سب وضاحتیں اپنی جگہ سمن! لیکن گزرے چھ سالوں میں ہم نے صرف ایک بات دیکھی ہے کہ تم اسامہ کے ساتھ خوش نہیں تھیں۔ تمہیں اس سے طلاق چاہیے تھی اور وہ تم حاصل کرکے رہیں۔"

"ہاں آپا! یہ سچ ہے۔ یہی سچ ہے لیکن آپ وہ سب باتیں نہیں جانتیں جو....."

"اب تو جان چکے۔ ہونہہ!" انہوں نے طنزیہ ہنس کر اس آخری بات کا حوالہ دیا جو اسامہ کی زبانی سنے بیٹھی تھیں۔ سمن نے تھکی تھکی سانس لی۔

"اوکے، پہلے آپ بتائیں۔ کیا کہا اسامہ نے؟" جتنا وہ اُس کم ظرف آدمی کے متعلق جانتی تھی، اسے ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا کہ سفر کے تین گھنٹوں سے اس نے کتنا فائدہ اٹھایا ہوگا۔ وہ شخص کسی بھی حد تک گر سکتا تھا۔

"حمزہ کون ہے؟"

"حمزہ.....!" سمن نے شدید حیرت سے زیرلب دہرایا۔ "کویت میں ہمارے پڑوسی تھے ساتھ والی بلڈنگ میں ان کا فلیٹ تھا اور.....

"شرم آنی چاہیے سمن! کیسی دیدہ دلیری سے اقرار کر رہی ہو۔ تمہارے کرتوتوں پر کیسے اس غریب نے سالوں تک پردہ ڈالے رکھا، لیکن ایک مرد بھلا کب تک خاموشی اور صبر کے گھونٹ پیے۔ افسوس تو مجھے اس بات پر ہے سمن کہ طلاق دے کر اس نے تمہاری خواہش پوری کر دی اور اپنے آپ کو کیسے اس بے چارے نے تنہائیوں کے حوالے کر دیا۔"

"خدا کے لیے آپا!" سمن نے باقاعدہ بہن کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "یہ بتائیں، حمزہ کے حوالے سے اسامہ نے آپ سے کہا کیا۔"

"اور تم تو جیسے جانتی ہی نہیں۔" وہ ایک دم تنک کر بولی تھیں۔ "ایک بات کان کھول کر سن لو سمن اتمہاری تو میں کسی کہانی پہ یقین کروں گی نہیں۔ سفر کے ان چند گھنٹوں میں جتنی بھی کہانیاں تم نے گھڑی ہوں، میں کسی ایک کے دام میں آنے والی نہیں۔"

"اور وہ کہانی آپا جو اسامہ نے آپ کو بتائی، اس پر آپ کس بنیاد پہ یقین کر رہی ہیں۔ حمزہ بھائی سے متعلق اس نے آپ سے کیا کہا میں نہیں جانتی لیکن وہ کہہ سکتا ہے۔ یہ ضرور سمجھ سکتی ہوں اور بس اتنا کہوں گی، حمزہ بھائی اور ان کی مسز سے ہمارے بہت اچھے مراسم رہے ہیں۔ حمزہ بھائی سے انتہائی ریسپکٹ کا رشتہ ہے اور مجھے شدید دکھ ہو رہا ہے یہ سوچ کر کہ اسامہ نے ان کا نام استعمال کیا۔"

"اسامہ کو اب تک ہم سب نے نہایت سلجھا ہوا اور سمجھ دار پایا ہے سمن! وہ محض ایک مفروضے کی بنیاد پر ہرگز اتنا بڑا اسٹیپ نہیں لے سکتا۔" آپا نے گویا بات ہی ختم کر دی۔ ساتھ ہی اسے مزید نہ سننے کا ارادہ کرتے کمرے سے چلی بھی گئیں۔

سمن نے بے بسی کا آنسو پلکوں سے گال پہ لڑھکتے محسوس کیا اور انگلی سے صاف کرتے تاسف سے مسکرا دی۔

یہی تو اس کی زندگی کا المیہ رہا تھا، کبھی کسی نے اسے سنا ہی نہیں تھا، وہ چپ چاپ چھت پر آ گئی۔

یہاں کے واحد کمرے میں چارپائی پر نیلو آپی بازو آنکھوں پہ رکھے لیٹی تھیں۔ معلوم نہیں سو رہی تھیں یا جاگ رہی تھیں۔ وہ فرش پہ بچھی چٹائی پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگاتے بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر اسی خاموشی سے بہن کو دیکھنے لگی۔

نیلو آپی تو بچپن سے ایسی تھیں، اللہ لوک، بھلی جئی۔ خاموش اور ہمیشہ سے گم صم اور سمن کو شاید "حالات" اس رخ پر لے جا رہے تھے۔

اندر کی گھٹن جب ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو ہم کسی نہ کسی طور اسے باہر نکال دیتے ہیں، لیکن جو نہ نکال پائیں تو وہ ایک دن ہمارے اندر کو کھا جاتی ہے اور بظاہر دکھائی دیتی یہ بیرونی عمارت کھوکھلی ہوتے بالآخر زمین بوس ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

"میم! مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی ایک پرابلم ڈسکس کرنی ہے۔"

"جی ضرور، میں سن رہی ہوں، لیکن آپ میم مت کہیے۔ میرا نام سیرت ہے۔ آپ نام سے بلا سکتے ہیں۔"

"بہت شکریہ سیرت جی۔ مجھے جنید کہتے ہیں۔"

"جی جنید! میں سن رہی ہوں۔ کیا مسئلہ ہے آپ کے بھائی کا؟" سیرت نے ہیڈ فون ٹھیک سے سر پر ایڈجسٹ کیا۔ "آپ کو میری آواز صحیح سنائی دے رہی ہے ناں؟"

"جی بالکل سیرت۔"

"اوکے۔ آپ آرام اور تفصیل سے بتانے جائیں۔ میں اینڈ پر جواب دوں گی۔"

"میرا بھائی حذیفہ، تیرھویں جماعت کا اسٹوڈنٹ ہے۔ اسے ایک لڑکی سے محبت ہوئی، ہماری اپنی کالونی میں قریب ڈیڑھ سال پہلے وہ لوگ نئے آئے ہیں۔ لڑکی ذرا ہوشیار سی تھی۔ رابطوں کی پہل بھی اسی کی طرف سے ہوئی۔ حذیفہ نے پہلے پہل جب اپنی دوستی کا معاملہ مجھ سے ڈسکس کیا، تب بھی میں نے اسے منع کیا تھا لیکن وہ باز نہیں آیا۔ اے کنول کے خلوص پر بہت بھروسا تھا اور وجہ صرف اتنی کہ پہل چونکہ کنول نے کی ہے تو اس کی سچائی پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ سوا سال تک یہ دوستی خوب دھواں دھار اور دو طرفہ رہی لیکن پچھلے کچھ عرصے سے کنول کا رویہ حذیفہ سے تبدیل ہونے لگا۔ رابطوں کی کمی، وقت نہ دینا، کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دینا۔ حذیفہ دن بہ دن جتنا اس تعلق کے حوالے سے سنجیدہ ہو رہا تھا کنول اتنی دور اور بیزار۔ حذیفہ نے بہت عرصہ ہوا مجھ سے افیئرز شیئر کرنا چھوڑ رکھے تھے لیکن اب کچھ ٹائم سے، جب سے وہ پریشان رہنے لگا تھا میرے پوچھنے پر مجھ سے دل کا حال کہتا رہا، اس نے مجھ سے نہ صرف کنول کے بدلے رویے پر بات کی بلکہ یہ بھی بتایا کہ کنول نے اسے اپنی کچھ اور نئی دوستیوں کے متعلق خود اپنے منہ سے بتایا ہے۔ مجھے سن کر بے حد حیرت ہوئی کہ بھلا کوئی لڑکی ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ یعنی کسی اور سے دوستی کر لینا اور پھر صاف الفاظ میں اقرار بھی کرنا۔ جبکہ حذیفہ اس سے شادی کرنے میں سنجیدہ ہے۔ میں نے اپنی سمجھ اور اندازے سے حذیفہ کو سمجھایا کہ ضرور لڑکی تم سے جان چھڑوانا چاہتی ہے، ورنہ ایسی ذاتی باتیں شیئر نہ کرتی۔"

"بالکل صحیح جنید! آپ کا اندازہ یقیناً درست رہا ہوگا۔" سیرت نے تجزیہ کیا۔

"جی سیرت! بعد کے واقعات نے یہی ثابت کیا کہ لڑکی اب حذیفہ سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ یہ اس کا پہلا حربہ تھا کہ حذیفہ بدظن ہو کر اسے چھوڑ جائے گا۔"

"تو حذیفہ کا کیا ردعمل رہا؟"

"بالکل الٹ، سیرت!" جنید کی آواز میں مایوسی تھی۔ "باوجود میرے لاکھ سمجھانے کے وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ کہتا ہے، کنول جیسی بھی ہے، صرف اور صرف میری ہے اور یہی بات ہم سب کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ کنول نے اب اس سے ہر قسم کا رابطہ توڑ لیا ہے۔ حتیٰ کہ دوسری دوستیوں کے باقاعدہ ثبوت بھی میرے پاس موجود ہیں لیکن حذیفہ کی ضد نے ہمارا چین آرام غارت کر رکھا ہے۔ اوپر سے روتا چلاتا بھی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے ہر حد کراس کر لینا چاہتا ہے۔ کبھی اس پر شدید غصہ آتا ہے تو کبھی بہت ترس۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا اس کے دل سے اس کنول نامی لڑکی کو کیسے نکالا جائے کیونکہ وہ ایک لاحاصل کی تمنا کر رہا ہے۔"

"پریشان نہ ہوں جنید! آپ کی بھائی کے لیے محبت یقیناً قابل تعریف ہے اور بھروسا رکھیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہر مسئلے کا ایک حل ہوتا ہے اور حذیفہ کے مسئلے کا حل میں آپ کو بتاتی ہوں۔ لیکن پہلے آپ میرے کچھ سوالوں کے جواب دیں۔"

"جی ضرور، آپ پوچھیں۔" جنید کے دل کی دھڑکن بڑھی۔ آن لائن مشورے طلب کرنے کو بھلے اس نے سنجیدہ نہیں لیا تھا لیکن امید کی ایک لو ضرور پیدا ہوئی تھی کہ شاید یہاں اس کا کام بن جائے۔

"آپ نے حذیفہ کو اس راہ سے باز رکھنے کے لیے کیا دلائل دیے، جو کچھ یاد ہے مجھے بتاتے جائیں۔" سیرت نے آغاز لیا۔

"جی۔" جنید نے گلا کھنکار کر کچھ سوچا۔ "اب تک کے وقت میں تو کنول جیسی لڑکیوں سے باز رہنے کی نصیحت کی ہے۔ یہ کہا کہ شادی جیسے معاملے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے، کل کو اس کی پوری لائف ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔ دوسرے لڑکوں سے اس کی دوستی کے ثبوت سامنے لاتے عقل سمجھ سے کام لینے کی ترغیب دی ہے۔ لیکن اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا سیرت۔ حتیٰ کہ میں نے اسے کچھ اور لڑکیوں کی جانب مائل کرنے کی کوشش بھی کی تاکہ اس کا دھیان ادھر سے ہٹے لیکن وہ تو قسم تک کھانے کو تیار ہو گیا کہ کنول نہ ملی تو زندگی بھر شادی ہی نہیں کرے گا۔ دوسری لڑکیوں کا نام لینے سے تو بالکل بھڑک جاتا ہے۔"

"تصویر بھیجیں گے حذیفہ کی؟"

"اوہ سوری سیرت!" جنید شرمندہ سا ہنس دیا۔ "جو کام پہلے کرنے کا تھا وہ تو بھول ہی گیا۔"

"ارے کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات اس کی اتنی ضرورت بھی نہیں ہوتی، کچھ حل صرف مسئلہ سن کر بھی ذہن میں آجاتے ہیں۔" جنید نے اسی دوران بھائی کی تصویر اسے سینڈ کردی تھی۔ سیرت نے خوب دھیان لگا کر حذیفہ کی تصویر کو کچھ دیر دیکھتی رہی۔

"اُلٹے دماغ کا لگتا ہے۔"

"جی؟" جنید کچھ اخذ نہیں کر پایا۔

"ہوں۔" سیرت تھوڑی ہی دیر میں نتیجے تک پہنچی۔ "جنید! یہ سمجھانے اور نصیحت کرنے سے کبھی نہیں مانے گا۔ اس کے ساتھ ایک گیم کھیلنی پڑے گی۔ بولیں کہنا مانیں گے؟"

"جی جی ضرور۔ میرے پاس اس وقت اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔"

"آج آپ حذیفہ سے کہیں کہ ٹھیک ہے تمہاری خوشی کی خاطر میں کنول کو تمہاری زندگی میں واپس لانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن اس کے لیے تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہتا جاؤں۔ ہوسکتا ہے جواباً وہ کسی شے کا اظہار کرے کہ تم تو کنول کی اتنی برائیاں کرتے تھے تم اچانک مان کیسے گئے تو۔"

"اس کی فکر نہ کریں سیرت! اس معاملے میں تو میں با آسانی اسے قائل کرلوں گا۔ وہ جانتا ہے میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں، اس کی خاطر اب تک میں کیا کچھ کرچکا ہوں۔ وہ ابھی پچھلی شام ہی رو رو کر میری منتیں کررہا تھا کہ کچھ بھی کرو میری کنول مجھے واپس لادو۔ تو آپ سمجھ سکتی ہیں ایسے میں میرا یہ بات کرنا....."

"اوکے۔ ڈن۔" سیرت بھی ایک دم پرجوش ہوئی۔ "تو آگے بڑھتے ہیں جنید! اب آپ دھیان سے میری بات سنیں۔ آپ اس سے کہیں کہ میں نے کنول کی شخصیت پر بہت غور کیا ہے اور مجھے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ ان لڑکیوں میں سے ہے جنہیں چیلنج قبول کرنے کا شوق ہوتا ہے، راہیں اچھی نہیں لگتیں۔ کسی چیز کا حصول ہوتا ہے لیے دلچسپی اور توجہ کا باعث ہوتا ہے، حاصل کے بعد اتنا جلدی وہ اس سے اکتا بھی جاتی جب تک تم اس ریلیشن میں لاپروا رہے وہ تمہارے پیچھے بھاگتی رہی، جونہی تم سنجیدہ ہوئے اسے مقصد پورا ہوگیا اور بس پھر وہی ضدی، چیلنجنگ کچھ اور نیا کرنے کی چاہ اور وہ چلی گئی۔ اب اسے اپنی طرف دوبارہ متوجہ کرنا چاہتے ہو تو مت پڑو بلکہ تم بھی کچھ ایسا کرو کہ کنول سوچنے پر ہوجائے۔ تمہارے بارے میں وہ کانفیڈنٹ یہ تو میرا دیوانہ ہے، اس نے کہاں جانا ہے، چوٹی بھی اسی لیے ہے کیونکہ اسے پیچھے پڑ والے مجنوں دیوانے اچھے نہیں لگتے۔ وہ تمہیں ایزی بھی لے رہی ہے اور وہ تمہیں کسی قابل نہیں سمجھتی، تو کیا تم کچھ ایسا کرسکتے ہو کہ وہ چونک جائے اور دوبارہ تمہاری طرف متوجہ ہوجائے۔"

"ہوں۔ صحیح۔" جنید تائید میں سر ہلاتا جا تھا۔ "مجھے لگتا ہے سیرت کہ وہ یہ کام کرے گا میرے ذہن میں ایک آئیڈیا بھی ہے۔"

"جی جی بتائیں۔"

"آپ کی بات بالکل درست ہے، کنول واقعی حذیفہ کو ایزی لیتی رہی ہے۔ نہ وہ اسے سیریس لیتی سمجھتی ہے نہ ذمہ دار۔ اس کے نزدیک حذیفہ اپنے فیوچر سے لاپروا ایک جذباتی، رومانٹک سا لڑکا ہے اور کچھ نہیں۔ جی تو آئیڈیا یہ ہے کہ حذیفہ کا ابھی کچھ دن پہلے ہی فارماڈی میں نام بھیجا تھا، اس کی سیلیکشن بھی ہوگئی تھی لیکن وہ بس اپنی محبت اجڑنے کا سوگ منا رہا ہے۔ کہتا ہے آگے نہیں پڑھنا۔ ضد اور ہٹ دھرمی کی انتہا ہے اس لڑکے میں۔ لیکن اب اگر میں کنول کو واپس لانے کے لیے یہ بات کروں گا تو وہ ضرور مان جائے گا۔"

"جی۔ آپ اس سے کہیں کہ اگر تم کنول کو واپس بلانا چاہتے ہو تو اس کے لیے ہاتھ پہ ہاتھ



رکھے بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسے زندگی کا مقصد بنایا ہے تو اس کے لیے جدوجہد بھی خود تمہیں کرنی ہوگی اور اس کی واپسی پیار کے دو بول، بولنے سے نہیں، کچھ کر دکھانے سے ہوگی۔ آپ نے اسے کسی بھی طرح فارماڈی کے لیے تیار کرنا ہے بلکہ ایک کوشش اور بھی کریں۔" سیرت نے رک کر کچھ سوچا۔ "کیا حذیفہ کا ماحول اور جگہ تبدیل ہوسکتی ہے، آئی مین....."

"میں سمجھ گیا۔" جنید ایک دم پرجوش ہوا۔ "فارماڈی میں ایڈمیشن کی صورت میں اسے ہاسٹل میں رہنا پڑے گا۔ پہلے میں خود بھی اسے دور بھیجنے سے ڈر رہا تھا۔ لیکن آپ صحیح سوچ رہی ہیں سیرت! اس کا ماحول تبدیل کرنا بہت ضروری ہے۔ یونی کا نیا ماحول، نئی دوستیاں، گپ شپ۔ وہ تو واقعی بہت حد تک اس فیز سے نکل جائے گا۔"

"بہت حد تک نہیں۔ مکمل طور پر نکل آئے گا۔" سیرت مسکرائی۔ "بس ایک بات یاد رکھیں کہ ہم یہ سب کچھ اسے کنول کے پاس واپس لانے کے لیے نہیں کررہے، بلکہ ہمیشہ کے لیے اس کا خیال اس کے دل سے نکالنے کے لیے کررہے ہیں۔"

"جی؟" جنید واقعی نہیں سمجھا۔

"یہ بات ہر موڑ پہ دھیان میں رکھنا کہ حذیفہ بہت الٹے دماغ کا ہے۔ بار بار اسے یاد دلاتے رہیں کہ کنول کے علاوہ کسی کا خیال دل میں مت لانا، وہ ملے تو شادی کرنا، وہ نہ ملے تو عمر بھر کنوارے رہنا۔ وہ بے وفا ہے، دھوکے باز ہے جیسی بھی ہے، بس میں تمہارے لیے، اسے واپس لاکر رہوں گا اور تم یونی میں کسی اور سے دوستی نہیں کرو گے۔ کہیں دل نہیں لگاؤ گے۔"

"ہاہاہا۔" جنید کی سمجھ میں بات آئی تو اس نے قہقہہ لگا کر انجوائے کیا۔ سیرت بھی ہنس پڑی۔

"آپ واقعی کمال ہیں سیرت! مجھے یقین ہے میں بہت جلد اپنے مقصد کو پالوں گا۔"

"ان شاء اللہ۔ تو چلیں پھر آج سے شروع ہوجائیں اور ساتھ ساتھ مجھے بھی آگاہ کرتے رہیں۔ یاد رکھیں کہ منصوبے ترتیب دینا بہت آسان ہوتا ہے لیکن انہیں اپلائی کرنے کی راہ میں چھوٹے چھوٹے کچھ اور معاملات یا مسائل شامل ہونے لگتے ہیں۔ ہمت نہیں ہارنی، صرف ذرا سی عقل اور سمجھ سے بگڑی بات کو بنایا جاسکتا ہے۔"

"بے شک۔ میں دھیان رکھوں گا۔ اینڈ تھینک یو ویری مچ سیرت! میں آج بہت عرصے بعد ذہنی طور پر خود کو بہت ہلکا محسوس کررہا ہوں۔ آپ کی ویب سائٹ بہت دنوں سے میری نظر میں تھی لیکن میں نے ہر بار اسے ایک دھوکا تصور کرتے خود کو رابطے سے باز رکھا اور اب مجھے اپنی سوچ پر افسوس ہورہا ہے کہ میں....."

"ارے کوئی بات نہیں جنید! آپ کا سوچنا بالکل نیچرل سی بات تھی۔ باقی مجھے خوشی ہے کہ آپ مایوس نہیں ہوئے۔ میرے لیے افسوس کی بات یہ ہوگی کہ کوئی مجھ سے رابطہ کرے لیکن اپنے مسئلے کا حل نہ پاسکے۔"

"آپ اپنے کام کے ساتھ ایمان دار ہیں، اس لیے مجھے یقین ہے وہ دن کبھی نہیں آئے گا بلکہ کام نہیں خدمت۔ وہ بھی ایسی بے غرض۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔"

"آمین۔" سیرت نے جذب سے کہا اور ہیڈ فون اتار کر سائیڈ پہ رکھتے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے نہیں یاد تھا کہ کب سے اور کیسے۔ لوگوں کے رویوں کو اس نے چہروں، گفتگو، چال ڈھال، ہاتھوں کی حرکات وغیرہ سے جانچنا شروع کیا۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ جب بھی کسی اجنبی چہرے کو دیکھ کر کوئی اندازہ لگایا وہ بعد میں بالکل درست ثابت ہوا۔ دوستوں اور فیملی میں تو اس سے باقاعدہ رائے بھی لی جانے لگی۔ وہ پہلے پہل تو شرما جاتی لیکن رفتہ رفتہ خود اپنی ذات پر اعتماد بحال ہونے لگا۔ وہ کسی کو محض ایک نظر دیکھ کر کیوں اور کیسے اس کی شخصیت کے متعلق ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا لیتی تھی، خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ سب

اللہ پاک کی دین تھا۔
اور اب لائف کی اس اسٹیج پر جب اُس نے خود کو بہت تنہا اور بے یارومددگار پایا تو اپنی خالی بے کار زندگی کو کسی مقصد کی طرف لگانے کا جذبہ بھی جیسے کسی طاقت نے اس کے اندر ڈالا تھا۔ دن بھر کی مصروفیت میں سے چند گھنٹے دکھی دلوں کی دوا بنتے وہ بالکل ہی اپنے غموں کو فراموش کر بیٹھتی تھی۔ خوشی اور سکون حاصل کرنے والے دعاؤں کے تحفے سے نواز جاتے اور وہ دیر تک گم صم بیٹھے بس یہی سوچے جاتی، کیا یہ دعائیں کبھی پوری ہوں گی؟ اگر ہاں تو کب اور بھلا کیسے؟ اور سر جھٹک کر وہ مسکراتے ہوئے پھر اپنے محبوب مشغلے کی جانب متوجہ ہو جاتی۔ مختلف چہرے، نت نئی کہانیاں اور ان کے لاتعداد حل۔ جو کبھی تو قابل عمل ثابت ہوتے کبھی شاید یونہی بے کار چلے جاتے لیکن وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہ تھی۔

☆☆☆

پارک کے سایہ دار کونے میں بنچ پر تھک کر بیٹھتے اس نے آسمان پہ ایک نظر ڈالی، مارچ کے بھرے بھرے بادل دل کھول کر برسنے کو بے تاب دکھائی دیتے تھے۔ کبھی جذبوں پر سات رنگوں کی قوس قزح جیسا چھاتی تھیں بہار کی یہ بارشیں۔ اس نے گہری آہ کھینچ کر نظریں آسمان سے ہٹالیں۔ جیب سے چشمہ نکال کر موبائل سامنے کھولا۔ کسی اور شے میں دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ گزرے دو ہفتوں میں بس وہ ایک میل۔ وہ آخری میل۔ وہ آدھا خط اور شاید یہ نہ ختم ہونے والی تلاش۔ وہ کئی بار کی پڑھی اس میل کو ایک بار پھر پڑھنے لگا۔

"سانسوں کی ڈور کا زندگی سے ناتا تو معلوم نہیں کب ٹوٹے۔ لیکن آج دشمن کی چھت کا وہ کمزور آسرا ضرور ٹوٹ گیا۔ میں جا رہی ہوں صاحب! آگے کے متعلق کچھ واضح نہیں۔ صرف کچھ امیدیں، جن کے برلانے میں تقدیر کی مہربانی کی منتظر ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔"

☆☆☆

سیرت نے معمول کے کام نمٹا کر حسب عادت اپنے لیے کافی کا کپ تیار کیا اور کمپیوٹر آن کر کے ویب سائٹ اوپن کی۔ ویب سائٹ بنانے میں اللہ بھلا کرے اس کی دوست سبیکا نے خوب مدد کی تھی۔ اس کا شوہر ایک پرائیویٹ کمپنی میں آئی ٹی منیجر تھا۔ انہوں نے سیرت کے لیے ویب سائٹ تیار کی اور بس تھوڑے دنوں کی جھجک کے بعد اب وہ خود بھی اپنے کام میں خوب ماہر ہو گئی تھی۔ لوگوں کی کونسلنگ (رہنمائی) کرنا اس کی ہابی سے بڑھ کر اب اس کا پیشن (جذبہ) بن چکا تھا۔ لوگ اس سے مشورہ طلب کریں، رہنمائی چاہیں اور وہ پوری ایمان داری سے اپنی سچی لگن اور اچھی نیت کے تحت انہیں بہتری کی راہ سجھائے۔ وقت گزاری کا اس سے بہتر مشغلہ اور بھلا کیا ہو سکتا تھا۔

قیافہ شناسی کا تحفہ جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا شاید اس سے کام لینے کی راہیں قدرت نے اسی طرح ہموار کرنی تھیں۔ اب تو قریب ڈھائی برس ہو گئے تھے اسے اس خدمت کا بیڑا اٹھائے اور اس گزرے وقت میں اس نے اتنے لوگوں کی کہانیاں اُن کے مسائل سن لیے تھے کہ ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ شروع شروع میں اگرچہ اسے بالکل سنجیدگی سے نہیں لیا گیا تھا۔ اکثر لڑکے اس کا مذاق اڑانے اور اسے غلط ثابت کرنے کے لیے نجانے کیسی کیسی باتیں نکال لاتے تھے لیکن سیرت میں حوصلے اور صبر کی ہرگز کمی نہ تھی۔

اس نے جلدی جلدی میں تمام میلز، آف لائن میسجز اور آن لائن اسٹیٹس چیک کیا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس وقت تین لوگ آن لائن مشاورت چاہ رہے تھے تینوں فی میل تھیں۔ زیادہ تر سیرت کو نوجوان نسل کے مسائل سے واسطہ پڑتا تھا، شاید ایک وجہ یہ تھی کہ کمپیوٹر اور موبائل کا زیادہ استعمال یہی طبقہ کرتا تھا۔ اکثر مسائل بھی دل ٹوٹنے، محبوب کی بے رخی، اس کی توجہ حاصل کرنے کے طریقوں سے متعلق ہوتے، دوسرے نمبر پر وہ خواتین تھیں جو دن کے وقت گھر پہ رہتی تھیں اور ان کی ازدواجی زندگی کسی نہ کسی مسئلے کا شکار تھی۔ سیرت کا مزاج بھی اب تو ان ہی کے رنگوں کے زیر اثر رہنے لگا تھا۔ جس دن اسے لڑکے لڑکیوں کے بچگانہ، الٹے سیدھے مسائل سننے پڑتے وہ سارا دن مسکراتی رہتی، اور جس دن کسی شادی شدہ حالات کی ماری کسی عورت کا دکھڑا ہوتا جو کبھی شوہر کی ستم ظریفیوں کا شکار ہوتی تو کبھی ساس، نندوں اور بھرے پرے سسرال کے بکھیڑوں سے نمٹنے میں کوشاں تو دن اور دل دونوں بھاری بھاری سے رہتے۔

ثنا، ندرت اور مسز ابرار کی کہانیاں سنتے اور ان کو ساتھ ساتھ رہنمائی کرتے دس سے بارہ کا پورا ٹائم نکل گیا۔ اور اب بیچ کے تین گھنٹوں میں اسے گھر کا باقی ماندہ کام نمٹا کر تین بجے دوبارہ لوٹنا تھا۔ یہ چارٹ بھی سیرت کا اپنا تشکیل دیا تھا۔ وہ کاموں کو ہمیشہ ایک ترتیب اور توازن سے انجام دینے کی عادی تھی۔ زندگی کی بے ترتیبی اپنی جگہ پر، اپنے معمولات کو ایک ڈھب اور سلیقے کے اندر رکھنا اس کے اختیار میں تھا۔

تین بجے لنچ کر لینے کے بعد وہ چائے کا کپ بنا کر پھر کمپیوٹر کے سامنے تھی۔ مسز ابرار اور ثنا کے مزید کچھ سوالات تھے۔ انہیں دھیان سے پڑھ کر جواب لکھتے اب وہ ایک اور لڑکی ندا کی بات سن رہی تھی۔ ندا اس سے میسنجر کال پہ بات کر رہی تھی۔ ہیڈ فون کانوں پہ لگائے وہ ندا کے منگیتر کی بے رخی کا واقعہ سن رہی تھی جب سامنے ایک نیا میسج کھلا۔

"میں سوسائڈ کرنا چاہتا ہوں۔"

چائے کا کپ سیرت کے ہاتھوں میں لرز گیا۔ کوئی جذباتی ٹین ایجر تھا شاید۔ اسے فوری طور پر اس لڑکے کے جنون کو نارمل سطح پہ لانا تھا۔

"ندا ڈیر! میں بس ابھی تھوڑی دیر میں دوبارہ آپ کو کال کرتی ہوں۔ سوری لیکن ابھی کے لیے مجھے اجازت دیں۔"

"جی جی کوئی بات نہیں۔ میں فی الحال ایک ڈیڑھ گھنٹہ بالکل فری ہوں۔"

"اوکے، میں رابطہ کروں گی آپ سے۔"

سیرت نے عجلت میں کال کٹ کرتے میسج کو اوپن کیا۔ کسی کاظم علی کی طرف سے میسج تھا۔ سیرت نے چند سیکنڈز رُک کر سوچا اور پھر لکھا۔

"اچھا؟ اور کوئی آپشن نہیں؟"

"نہیں۔" ٹکا سا جواب آیا۔ سیرت نے لب چباتے پھر کچھ سوچا۔

"اوکے، تو آخری بار ذرا کھل کر بات کر لیتے ہیں، کیا خیال ہے؟"

"جی، میں نے اسی لیے میسج لکھا، ورنہ اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔"

"گڈ۔ میں بھی کافی دیر سے بالکل فارغ بیٹھی تھی اور ایک دم بور ہو رہی تھی۔"

"ہوں۔" فقط اتنا کہا گیا اور اب سیرت کو کچھ ایسا سوچنا تھا جس سے کاظم کی ذہنی رو کو زیادہ دیر کے لیے کسی اور سمت میں پلٹا جا سکے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ لڑکا اس سے جھوٹ بول رہا ہو اور کچھ ہی دیر میں اس کا مذاق اُڑانے والا ہو۔ سیرت کو ہمیشہ ہی ایسے موقعوں پر پہلے اپنے دل کو سمجھانا پڑتا تھا کہ نتیجہ کچھ بھی ہو اس نے صبر کا دامن نہیں چھوڑنا۔

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں کاظم! کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں اور اس وقت اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"میرا بلڈ پریشر اس وقت شدید ہائی ہے اور اس حالت میں، میں اکثر کنٹرول کھو دیتا ہوں۔"

"کوئی دوا وغیرہ لی؟"

"دوا سامنے رکھی ہے۔ گولیوں کی پوری شیشی ہے اور پانی کا ایک گلاس۔ دل چاہ رہا ہے ہاتھ بڑھاؤں اور سب پھانک جاؤں۔"

"اُف۔" سیرت نے خوف سے جھرجھری لی۔ بڑی عجیب صورت حال تھی اور اگر واقعی وہ لڑکا سچ کہہ رہا تھا تو اسے ہر حال میں اس اقدام سے

روکنا تھا۔

"بھئی ہماری بات تو پوری ہونے دیں، آپ تو مجھے بوریت سے بچانے والے تھے۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" پھر ایک اوندھا جواب آیا اور سیرت کے لبوں پر بے بسی کی مسکراہٹ آکر معدوم ہوئی۔ بڑا ہی کوئی ضدی لڑکا تھا۔

"میں کال ملا رہی ہوں۔" اس نے ہیڈ فون جلدی سے کانوں پہ چڑھایا۔

"ہوں ملاؤ۔" بجھا بجھا سا آرڈر آیا اور سیرت نے اسی کو غنیمت جانتے جلدی سے کال ملائی۔

"ہیلو!" مہین سی نرم آواز نکالتے وہ اس وقت حقیقتاً ڈری ہوئی تھی۔

"جی۔ السلام علیکم۔" ایک بھاری مردانہ آواز جواباً سنائی دی جسے سن کر سیرت لحظے کو ایک دم چُپ ہوئی۔

"ہیلو؟" بھاری آواز نے متوجہ کیا تو وہ چونکی۔

"ہ..... ہاں۔ جی جی۔ وعلیکم السلام۔ کیسے ہیں کاظم۔" اس نے بڑی مشکل سے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا تھا۔

"آپ ڈر رہی ہیں مجھ سے؟" بڑی تسلی سے پوچھا گیا اور سیرت نے شرمندگی سے آنکھیں میچیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی کونسلنگ کر رہا ہو۔

"ارے بالکل نہیں۔ میں بس یہ ہیڈ فون کو ایڈجسٹ کر رہی تھی۔ جی تو کہاں سے ہیں کاظم؟" سیرت نے خود کو مکمل سنبھالا دل کی تیز دھڑکن البتہ ابھی تک قابو میں نہیں تھی۔

"ساہیوال سے۔"

"ارے واہ، بہت قریب ہیں ہم، میں سیالکوٹ سے ہوں۔" اس نے بلاوجہ ہی لمبا جواب دیا حالانکہ وہ کبھی اپنی پرسنل لائف کسی سے شیئر نہیں کرتی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کے متعلق جاننے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی لیکن وہ ہمیشہ صاف سیدھے الفاظ میں کچھ بھی بتانے سے معذرت کر لیتی۔ لیکن کاظم کا معاملہ ذرا ٹیڑھا جا رہا تھا۔ اسے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیسے اس سامنے والے کو نارمل کرے۔

"کیا کرتے ہیں کاظم؟ اسٹوڈنٹ!" وہ کہتے ہوئے خود بھی کچھ کنفیوژ ہوگئی۔ کاظم کی آواز سے کمی ٹین ایجر لڑکے کا تاثر تو پہلے ہی ہٹ گیا تھا۔ اب اسٹوڈنٹ ہونا بھی شبہے کا باعث تھا۔

"جی نہیں۔" قدرے بے زاری سے جواب دیا گیا۔ جیسے وہ سیرت سے اکتاہٹ محسوس کرتے کال بند کر دینا چاہتا تھا۔

"کاظم! کیا آپ مجھ سے اپنی پریشانی شیئر کریں گے؟ ایکچوئلی میں خود بھی کسی وجہ سے بہت پریشان ہوں اور اپنے دل کا حال کسی سے کہنا چاہتی ہوں۔ آپ پہل کریں گے تو میری جھجک بھی ختم ہوگی۔" اس نے جلدی سے وضاحت بھی کر دی۔

"بول دینے سے پریشانی کم تو نہیں ہوگی لیکن آپ اس وقت جو اسٹریس خود پر محسوس کر رہے ہیں۔ اس میں کمی ضرور آئے گی۔"

"میں اس وقت اپنے آپ کو حد سے زیادہ تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ شاید اس بھری دنیا میں اس وقت کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔" بالآخر کاظم نے پہلا طویل جملہ منہ سے نکالا۔ اس کی آواز میں انتہا کا درد اور بے چارگی تھی۔

سیرت کی پلکیں نم ہوئیں، ایسے کہ وہ خود حیران تھی۔

"اور میں روز یہی محسوس کرتی ہوں۔" وہ بنا سوچے کہہ گئی۔

"آ..... آپ واقعی پریشان ہیں؟" کاظم نے تعجب سے سوال کیا، جیسے یقین نہ کر پا رہا ہو۔ سیرت جواباً چپ رہی۔ "ایکچوئلی، مجھے ایسا لگا تھا جیسے آپ بات بڑھانے کو ایسا کہہ رہی ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہیں سیرت؟" وہ اس کی خاموشی سے الجھا۔

"میں بتاؤں گی آپ کو۔ لیکن بعد میں، پہلے آپ بتائیں۔ اکیلا محسوس کرنے کی وجہ کیا ہے؟ آپ کے گھر میں کون کون ہے۔ زندگی میں بہت سے رشتے ہوتے ہیں ناں، والدین، بھائی بہن، دوست، رشتے دار....." وہ رُکی۔

"جو رشتے آپ نے گنوائے، ان میں سے کوئی نہیں ہے۔" کاظم نے ایک تھکی تھکی آہ بھری۔ "والدین فوت ہو چکے ہیں اور میں ان کی اکلوتی اولاد تھا۔"

"اوہ۔ کب ڈیتھ ہوئی والدین کی؟" سیرت نے سوچا پریشانی کی وجہ شاید یہی ہو۔

"عرصہ ہوا۔"

"آپ کی پریشانی کی وجہ کیا ہے؟"

"دھوکے اور سازشوں کا شکار ہونا۔" کاظم نے رسان سے مطلع کیا۔ سیرت نے ایک پہلا سکون کا سانس بھرا۔ کاظم اب اس سے بات کرنے میں سہولت محسوس کر رہا تھا۔ دباؤ کی کیفیت میں اندر کے غبار کو باہر نکالنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

"میں ایک بہت بڑی پراپرٹی کا مالک ہوں، کافی کچھ والد صاحب کا کمایا ہوا ہے اور باقی کچھ ذاتی کوشش کا نتیجہ اور اب اسی دولت کے حصول کے لیے میرے گرد سازشوں کے جال بنے جا رہے ہیں۔"

"کوئی رشتے دار وغیرہ؟" سیرت نے اندازہ لگایا

"جی، بہت قریبی۔" کاظم کی بھاری آہ میں شدت کا کرب تھا۔

"لگتا ہے آپ کو بہت بھروسا تھا ان پر جو....."

"میرے بیوی اور بچے۔" کاظم نے بے ساختہ کہا اور سیرت کا تعجب سے منہ کھلا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں۔ بس ایک پہلے جملے کی وجہ سے جب اسے کوئی ٹین ایجر سمجھا، وہ اس سے ایک لڑکے جیسا ٹریٹ کر رہی تھی۔ بعد میں آواز سن کر جب لگا کہ وہ کوئی ٹین ایجر نہیں ہے، تب بھی اسے چوبیس پچیس برس کا نوجوان تصور کیا۔ کاظم کی شخصیت حقیقتاً اسے حیرت میں مبتلا کر رہی تھی۔

"جی جی کاظم! بتاتے جائیں۔ میں پوری توجہ سے صرف آپ کو سن رہی ہوں۔"

"میری بیوی سعدیہ شادی کے صرف چار سال بعد فوت ہوگئی تھی۔ میری دو بیٹیاں اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔ بڑی بہن نے ان کے پالنے میں بھی مدد دی اور دو سال بعد میری دوسری شادی کر دی۔ دوسری بیوی ابیلہ ایک مطلقہ عورت تھی اور پہلے گھر سے اس کے بھی دو بچے تھے جنہیں وہ ساتھ لائی۔ ہمارا ایک بیٹا ہوا فرہاد۔ ابیلہ کو میں نے شروع دن سے ایک لالچی عورت ہی پایا۔ اسے میری دو بیٹیاں بہت کھٹکتی تھیں۔ وہ آغاز سے اس جائداد کے پیچھے پڑی ہوئی تھی، ہر وقت بس ایک ہی رٹ کہ سب کو ان کا حصہ جلد از جلد دے کر نمٹا دوں۔ میں نے گھر کے حالات دیکھتے ہوئے بیٹیوں کی کم عمری میں ہی شادیاں کر دیں اور اللہ کا شکر ہے وہ دونوں بہت سکھی ہیں۔"

"ماشاء اللہ۔" سیرت نے اپنی حیرت دباتے صرف اتنا کہا۔ اسے شدید حیرت ہو رہی تھی یہ سوچ کر کہ وہ تو اتنی دیر سے ایک بوڑھے آدمی سے بات کر رہی تھی، اپنے اندازوں کی غلطی پر آج وہ جتنا حیران ہوتی کم تھا۔

"ابیلہ کے سر پر میری جائداد جنون بن کر سوار ہو چکی تھی۔ اس کے بچے بھی کسی طور عادات میں اس سے کم نہ تھے۔ پھر ایک دن مجھے کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی گئی۔"

"اوہ۔" سیرت کا دل دھڑکا۔

"بروقت معدہ واش ہونے سے میری جان تو بچ گئی لیکن ابیلہ اور اس کے بچوں پر میں اب مزید بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے طلاق دے دی اور بیٹے کو اپنے پاس رکھ لیا۔ فرہاد اس وقت آٹھ سال کا تھا۔ ابیلہ خود بھی اسے ساتھ لے جانے پر راضی نہیں تھی اور اس کی نیچر دیکھتے میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ ایسا جان بوجھ کے کر رہی ہے۔ اب صرف فرہاد ہی تھا جس کی بدولت وہ واپس اس گھر میں داخل ہو سکتی تھی۔ فرہاد ماں سے ملتا رہتا تھا، ظاہر ہے وہ اس کی

ماں ہے، میں منع بھی کیوں کرتا لیکن ابیلہ اور اس کے بیٹے بیٹی نے فرہاد کو مجھ سے بدظن کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فرہاد اس وقت صرف اپنی ماں کی زبان بولتا ہے۔ اسے میرا وجود اس گھر میں کھٹکتا ہے۔ ابیلہ آج بھی میری جان کی دشمن ہے، اس کی شدید خواہش ہے کہ میں جلد از جلد اس دنیا سے دفع ہو جاؤں تاکہ وہ اپنے دو بچوں سمیت فرہاد کے پاس آ کر ہر چیز پر قابض ہو جائے۔"

"بہت افسوس ہوا یہ سب سن کر۔ دولت کی ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ لیکن کاظم صاحب! آپ اتنے مایوس کیوں ہو گئے کہ خودکشی....."

"فرہاد غصے سے گھر چھوڑ گیا ہے، اسے دو دنوں میں پیپرز چاہئیں جائداد کے۔"

"اور آپ کو لگا اب اور کوئی راستہ نہیں؟"

"میرا بلڈ پریشر بہت ہائی تھا، ٹینشن میں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کاظم صاحب! کیا مجھے اپنی تصویر سینڈ کریں گے۔" سیرت کے ذہن میں ان کے مسئلے کے کچھ حل آئے لیکن وہ ان کی شخصیت کے متعلق ان کو دیکھ کر ہی کچھ اندازہ لگا سکتی تھی۔ کاظم نے بنا کچھ کہے فوراً ہی اپنی تصویر بھیج دی اور تصویر دیکھنا سیرت کے لیے ایک اور جھٹکا ثابت ہوا۔

"کاظم صاحب! کوئی ابھی کی تصویر ہے؟" سیرت ان سے کھل کر کہہ نہیں پائی کہ اپنی جوانی کی نہیں، ابھی بڑھاپے کی تصویر بھیجیں۔ کاظم صاحب نے جو تصویر بھیجی تھی وہ مشکل سے ایک پینتالیس چھیالیس سالہ مرد کی تھی اور سیرت کو ان کی اب کی تصویر سے کچھ جانچنا تھا۔

"جی یہ پچھلے ہفتے کی ہے۔" کاظم نے تدبر سے بتایا اور سیرت بری طرح الجھ گئی۔ عجیب گھن چکر آدمی تھا یعنی.....

"آپ کی عمر کیا ہے؟" اس نے تنگ آ کر پوچھ ہی لیا۔

"فورٹی فائیو۔" وہ جیسے سیرت کی شٹاہٹ سے مزا لیتے مسکرا رہے تھے۔ "میری پہلی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں ہوئی تھی کیونکہ والد صاحب کینسر کی انتہائی اسٹیج پر تھے اور میں اکلوتا تھا۔ وہ میرا گھر بسا کر جانا چاہتے تھے۔ دوسری شادی کے وقت میری عمر چوبیس تھی۔ فرہاد اس وقت بیس سال کا ہے اور ماں کے کہنے پر ابھی سے ہر چیز کا مالک بن جانا چاہتا ہے۔ ابیلہ سے اب صبر نہیں ہوتا مزید اس دولت اور عیش سے دور رہنے کو۔"

"صحیح۔" سیرت ان کی بات سننے کے دوران ان کی تصویر کو بغور دیکھے جا رہی تھی۔

"جی تو کیا اندازہ لگایا آپ نے میرے متعلق؟" کاظم علی دل کا بوجھ ہلکا کر کے واقعی اب سکون محسوس کر رہے تھے۔

کاظم علی ایک مضبوط جسم اور اونچے قد کے آدمی تھے۔ روشن آنکھیں، قدرے لمبا چہرا، اونچی ناک، اٹھا ہوا دہانہ، سرخی مائل گندمی رنگت، وہ ایک متوازن ناک نقشے کے ساتھ اچھی شکل وصورت والے مرد تھے۔

"بہت ذہین، دور اندیش اور ذمہ دار ہیں آپ۔ حد سے زیادہ محتاط، رسک نہ لینے والے، کم گو، لوگوں کو محض ان کی گفتگو سے اندر تک پہچان لینے والے، اگلے کو خوب برداشت کے ساتھ مکمل سننے والے، انہیں وقت اور مہلت دینے والے، بس ایک بات کو چھوڑ کر۔" وہ ذرا سا رکی۔

"ہوں؟" کاظم اس کا تسلسل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"دل کے معاملات میں اول تو آپ بہت محتاط ہیں۔ کم ہی آپ کی تسلی ہوتی ہے لیکن اگر جو کہیں اٹک گئے تو الامان۔ پھر آپ بچوں جیسے ضدی ہیں، آپ کی جذباتیت ہی آپ کی شخصیت کی واحد کمزوری ہے۔"

"اچھا اور یہ کیسے جان لیتی ہیں آپ؟" کاظم کے لہجے میں دلچسپی سی در آئی۔ سیرت مسکرانے لگی۔

"نہیں پتا، بس خود بخود بولتی چلی جاتی ہوں۔

"آپ کے خیال سے کتنا صحیح بتایا؟" وہ بھی جاننے کو مشتاق ہوئی۔

"بالکل صحیح۔ مجھے حیران کیا ہے آپ نے۔" وہ دل سے قائل ہوا، تب ہی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا۔ "کسی کو مشورہ دینا کچھ اور بات ہے، لوگ اپنی زبان کی تیزی دکھاتے وقتی طور پر امپریس کر جاتے ہیں۔ لیکن آپ بنا اگلے کو جانے اس کی عادات کے متعلق بتانے کا رسک لیتی ہیں۔ اگلا آپ کو اسی لمحے میں غلط بھی ثابت کر سکتا ہے لیکن یہی آپ کی سچائی ہے، آپ کا ٹیلنٹ سچا ہے، یہ لفظوں کی ہیرا پھیری نہیں جو وقتی طور پر بہلا دیتی ہے۔ آئی ایم ریئلی امپریسڈ۔"

"آپ کی تعریف میرے لیے اعزاز ہے۔" وہ مسکرائی۔ "کیونکہ آپ کم ہی مطمئن ہوتے ہیں۔ آپ کو امپریس کرنا ایک جوکھم ہے۔"

"ہاہاہا۔ یہ ایک اور سچ ہے جو آپ آخر میں بتا رہی ہیں۔"

"آخر میں نہیں۔" سیرت نے قطع کیا۔ "ابھی بہت کچھ بتانا باقی ہے۔ لیکن فی الحال ہم فرہاد کے معاملے کو ڈسکس نہ کریں۔"

"جی بالکل۔ میں واقعی کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ یوں لگتا ہے ہر راہ مجھ پر آہستہ آہستہ بند کی جا رہی ہے۔"

"ایسا نہیں ہوتا سر!" سیرت نے رسان سے کہنا شروع کیا۔ "اس وقت کو اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تصور کریں اور اس سے نکلنے کے لیے سب سے پہلے پاک پروردگار کی مدد طلب کریں۔ جب ہر راہ بند لگنے لگے تب اسباب وہاں سے پیدا ہوتے ہیں، صرف مانگنے کی دیر ہے۔" اُس نے انگلی سے اوپر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ "اچھا یہ بتائیں اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ بی پی کچھ کنٹرول ہوا؟"

"جی طبیعت بھی کافی بہتر ہے اور آپ سے بات کر کے بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔"

"سوسائڈ جیسی فضول باتیں تو نہیں سوچ رہے؟"

"نہیں۔" وہ ہنس پڑا۔ "اب نہیں سوچ رہا، لیکن اگر آپ نے مجھے کوئی حل نہ بتایا تو سوچ بھی سکتا ہوں۔"

"نوبت نہیں آئے گی۔ ان شاء اللہ۔ اچھا ویسے فرہاد کے حوالے سے ایسے کیا خدشات ہیں آپ کے ذہن میں، کسی راستے کا نہ ہونا، کسی مناسب حل کا نہ سوجھنا، آخر کس لیے؟" سیرت پر ابھی بھی بہت کچھ واضح نہیں ہو پایا تھا۔ سوچا پہلے کاظم صاحب کو مکمل سن لے۔

"دیکھیں سیرت! فرہاد میرا اکلوتا بیٹا ہے اور میرے بعد اس دولت کا وارث بھی۔ مجھے سب کچھ اس کے نام کرنے نہ کرنے کی بظاہر کوئی ضرورت بھی نہیں۔ لیکن جن لوگوں سے وہ وابستہ ہے، ان کا مجھے ایک لمحے کا بھی بھروسا نہیں، ٹھیک ہے کہ ابیلہ فرہاد کی سگی ماں ہے، وہ اس کی زندگی کی دشمن نہیں، لیکن کل کو وہ نہ رہی تو فرہاد کے سوتیلے بہن بھائی وہ ہیں جنہوں نے ماں کے ساتھ مل کر مجھے زہر دینے کی کوشش کی تھی، اگر نعمان اور سعیدہ نے ابیلہ سے چوری فرہاد کے ساتھ ایسا کچھ کرنا چاہا تب کیا ہوگا۔ وہ لوگ تھوڑے پر گزارا کرنے والے نہیں ہیں۔ فرہاد کا اس پوری جائداد کا اصل وارث ہونا انہیں کانٹے کی طرح چبھتا ہے، اور وہ یہ کانٹا ہر صورت اپنی زندگی سے نکال دیں گے۔ اور کچھ نہیں تو زور زبردستی کر کے فرہاد سے یہ کارخانے اور مل وغیرہ اپنے نام کروا سکتے ہیں۔ لیکن میں یہ بات فرہاد کو سمجھا نہیں پا رہا، ماں نے اس کی آنکھوں پر اپنی محبت کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ وہ تو مجھے صرف سکینہ اور معصومہ کا باپ سمجھتا ہے۔"

"آپ کی پہلی بیوی سے جو بیٹیاں ہیں؟" سیرت نے تصدیق چاہی۔

"ہوں۔ بس ہر وقت یہی سوچیں کھائے جاتی ہیں کہ میرے بعد فرہاد کا کیا ہوگا اور میرے بعد ہی کیا۔ وہ تو میری زندگی میں میرے بیٹے کو مجھ سے میری دولت سمیت الگ کر کے لے جانا چاہتی

ہے۔ فرہاد کو ناراض ہو کر گھر چھوڑنے کا آئیڈیا بھی اسی نے دیا ہے۔ دو دن کی مہلت بھی جذباتی بلیک میلنگ ہے۔ مجھے بس شدت کا بلڈ پریشر ہوا اور سامنے رکھی گولیوں کی شیشی کو دیکھتے ایک ہی بات ذہن میں آرہی تھی کہ کم از کم اپنے ہاتھوں سے تو میں کچھ بھی ان کے نام نہیں کروں گا، خود کو مار کر اس سارے جھنجٹ سے ہی نجات پالیتا ہوں۔"

"بس آئندہ آپ کو ایسا کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آرہا ہے، وہ سن لیں۔"

"جی جی بتائیں۔" وہ مکمل متوجہ ہوئے۔

"ویسے تو قانون کی باریکیاں میں زیادہ نہیں جانتی لیکن خیر آپ اس آئیڈیے کو قابلِ عمل سمجھیں تو خود ہی پالش کرتے جائیں اور آئیڈیا یہ ہے کہ....." وہ رکی۔ "آپ مجھے اپنی جائداد کی کچھ تفصیل بتا سکتے ہیں، آئی مین....."

"جی۔ کافی ساری زرعی اراضی ہے، ایک شوگر مل اور تین کھاد کے کارخانے۔ باقی بس کچھ گھر اور پلاٹس۔"

"ہونہہ۔ ماشاء اللہ۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ایک کارخانہ فرہاد کے نام کر کے اس سے کہیں کہ ابھی چونکہ تم کم عمر ہو، میں تمہاری قابلیت چیک کرنے کے لیے فی الحال یہی تمہارے نام کر رہا ہوں، تم دو سالوں میں مجھ پر اپنی اہلیت ثابت کرو، پھر رفتہ رفتہ سب کچھ تمہارے نام کرتا جاؤں گا اور دوسری جانب آپ فرہاد کے علم میں لائے بغیر اپنی ایک وصیت تیار کروائیں جس میں نام لے کر باقاعدہ وضاحت سے لکھوا دیں کہ اپنی سابقہ بیوی ابیلہ اور اس کے دو بچوں نعمان اور سنیعہ کا میری جائیداد میں نہ کوئی حصہ ہے اور نہ ہی فرہاد مالک و مختار بننے کے بعد کوئی چیز ان کے نام کر سکتا ہے۔ آپ کی جائداد کے حقیقی وارث صرف آپ کے اپنے بچے یعنی دو بیٹیاں اور فرہاد ہوں گے۔"

"ہوں۔" کاظم نے پرسوچ ہنکارا بھرا۔ "یہ واقعی قابلِ عمل ہے۔ میں کسی وکیل سے مشورہ کرتا ہوں اور پہلے پہل ایک کارخانہ دینے والا آئیڈیا بہت ہی عمدہ ہے۔ فرہاد کے دل و دماغ سے بدگمانی کے پردے بھی ہٹ جائیں گے کہ میں اسے کچھ دینا نہیں چاہتا۔ وہ کم عمر ہے اور تجربہ بھی نہیں رکھتا، پھر ابیلہ اور نعمان وغیرہ کی بدحواسیوں کے ساتھ مل کر دو ہی سالوں میں انہوں نے کارخانے کا حلیہ ہی بگاڑ دینا ہے۔ فرہاد بھی ٹھوکر کھا کر بہت کچھ سمجھنے کے قابل ہو جائے گا اور ایک فیکٹری کے گھاٹے سے میرے حالات پر بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑے گا۔ ٹھیک ہے سیرت میں اس سب پر کسی سے غور کرتا ہوں۔ پھر مل کر آگے کا لائحہ عمل بناتے ہیں۔ تھینک یو سو مچ، میری بہت بڑی الجھن سلجھائی ہے آپ نے۔"

"تھینکس کہنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس تھینکس کو فی الحال سنبھال کر رکھ لیں۔ جب آپ کا مسئلہ پوری طرح حل ہو جائے پھر کہیے گا۔"

"سوری میں نے آپ کا کافی سارا وقت لے لیا۔"

"جی نہیں۔ میری روز کی روٹین ہے۔ مجھے اچھا لگا آپ سے بات کر کے۔"

"کیا میں روزانہ آپ سے بات کر سکتا ہوں؟ آئی ایم سوری، لیکن میری تنہائی مجھے عجیب عجیب وہموں میں گھیرنے لگتی ہے۔"

"اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے کاظم صاحب! ہم روز بات کریں گے ان شاء اللہ۔" سیرت نے مسکرا کر انہیں تسلی دی۔

☆☆☆

"آپا! میں جاب کے لیے کہیں اپلائی کرنا چاہتی ہوں۔" سمن نے سامنے صوفے پر بیٹھتے جھجک کر آغاز لیا۔

"اچھا۔" ٹی وی دیکھتی آپا نے لاپروائی سے اس کی بات سنی۔ "ٹیچنگ وغیرہ؟"

"جی۔" سمن کا حوصلہ ذرا بلند ہوا۔ "میں نے سی وی تیار کر لی ہے۔ اب کل سے کسی اچھے



اسکول....."

"ہاں ٹھیک ہے۔" انہوں نے زیادہ اہمیت نہ دیتے بات وہیں سمیٹ دی اور سمن خاموشی سے واپس کمرے میں آگئی۔

آپا کا رویہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس سے خراب تر ہو رہا تھا۔ وجہ بھی سمن اچھی طرح جانتی تھی۔ پندرہ مرلے کا یہ مکان ان کی والدہ کا تھا۔ وہ تین بہنیں تھیں، بھائی کوئی نہیں تھا۔ اس لیے ابا کی وفات کے بعد جب اماں، وہ اور نیلو آپی اکیلی رہ گئیں تو آسیہ آپا اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سسرال کے جھنجٹ سے جان چھڑوا کر یہاں آن بسیں۔ پھر سمن کی شادی اسامہ سے ہوگئی تو اماں نے جوشِ جذبات میں آپا سے یہ کہہ دیا تھا کہ ان کے بعد وہ چاہے تو اس پندرہ مرلے پر اپنی مرضی کا گھر بنوا لے، نیلو آپی بے چاری تو ویسے ہی ملنگ بندی تھیں۔ انہوں نے تو زندگی کے دن آپا کے رحم و کرم گزارنے تھے انہوں نے ان سے پانچ مرلے لے کر بھلا کیا کرنا تھا۔ لیکن اب سمن کی واپسی کے بعد آپا کو پانچ مرلوں کا غم ستانے لگا۔ بیٹھے بٹھائے پندرہ میں سے پانچ مرلے نفی ہو رہے تھے۔

سمن کے والد صاحب کا ٹرانسفیبل تھے۔ بچپن ان سب کا ایک کرائے کے مکان میں گزرا۔ باوجود بہت کوشش کے ابا اپنا ذاتی مکان نہیں بنوا پائے۔ اماں بھی کسی بڑے گھر کی بیٹی نہ تھیں۔ لیکن یہ پندرہ مرلے کا مکان سوائے ان کی خوش بختی کے اور کچھ نہ تھا۔

سمن کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اسکول سے واپس گھر آنے پر اس نے گھر میں ایک جشن کا سا سماں دیکھا۔ اماں ایک کاغذ کے ٹکڑے کو ہنستی روتی کیفیت میں بار بار چومے جا رہی تھیں اور ابا سب کے منہ میں مٹھائی ڈال کر مبارک باد دے رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اماں کے ماموں نے اپنا ایک مکان ان کے نام کر دیا تھا اور وجہ اس کی یہ تھی کہ ماما جی کے بڑے بیٹے کو برین ٹیومر ہوا، علاج کے لیے جب اسے باہر لے جایا جا رہا تھا تب ماما جی نے منت مانی کہ بلال اگر زندہ سلامت واپس لوٹ آئے تو وہ اپنا ایک مکان کسی غریب مستحق رشتے دار کے نام کر دیں گے۔ بلال بھی اپنی بیماری سے نجات پا کر صحیح سلامت واپس آگیا اور فرحہ فال بھی ان کی اماں کے نام نکلا، جس کا کوئی بیٹا نہ تھا اور گھریلو حالات بھی کچھ ایسے اچھے نہ تھے۔ بیٹھے بٹھائے مکان مل جانا ایک ایسی خوشی تھی جو سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔ سمن اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔

وقت گزرنے لگا، پہلے آپا کی شادی ہوئی، پھر ابا فوت ہوئے۔ وہ گریجویشن کر کے اب گھر پر ایم اے کی تیاری کر رہی تھی جب اسامہ کا رشتہ آگیا۔ اسامہ اس کی امی کا ماموں زاد تھا، یعنی انہی ماما جی کا بیٹا جنہوں نے یہ مکان ان کی امی کے نام کیا تھا۔ بلال ان کا بڑا بیٹا تھا اور اسامہ سب سے چھوٹا۔ چند سال پہلے ماما جی بھی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اور ٹیومر سے نجات حاصل کر کے واپس آنے والے بلال بھائی بھی آپریشن کی کامیابی کے بعد بس سات برس اور جی سکے۔ اسامہ کے رشتے کو آسیہ آپا نے بہت پسند کیا اور اس کی امی بھی مان گئیں اس کی منگنی کر دی گئی۔ اور ایم اے مکمل کر لینے کے بعد بائیس برس کی عمر میں اس کی اسامہ سے شادی ہو گئی۔ شادی کے دو سال بعد وہ کویت چلی گئی۔۔ اور اب چار سال بعد اسامہ سے طلاق ہو جانے پر وہ واپس آئی تو شاید یہاں بھی بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اماں بھی چند سال ہوئے دنیا چھوڑ کر جا چکی تھیں۔

☆☆☆

"ہائے سیرت! بات ہو سکتی ہے؟" کاظم صاحب کی طرف سے میسج کھلا تو سیرت کی فوراً توجہ ادھر ہوئی۔ وہ اس وقت تقریباً فارغ بیٹھی تھی۔ آن لائن تو کافی دیر سے کوئی تھا ہی نہیں، اس نے کچھ آف لائن میسجز کے تفصیلی جواب لکھے تھے۔ کاظم صاحب کی ایسے وقت آمد پر اس نے بھی شکر پڑھا۔ وہ خود بھی

باقی کا وقت زیادہ تر ان ہی کے متعلق سوچتی رہی تھی۔

"فرہاد کو میں نے رات ہی گھر بلا لیا تھا معاملات طے کرنے کے لیے۔ اس کی طبیعت کو دیکھتے میں نے آغاز انکار سے ہی لیا۔ آپ تو سمجھتی ہیں بچوں کا مزاج تھوڑے پر قانع نہیں ہوتا۔ میں اگر وہیں سے بات شروع کرتا جو طے کیے بیٹھا تھا تو اسے وہ کم ہی لگتا۔"

"بالکل صحیح کیا کاظم صاحب! مجھے اندازہ تھا کہ آپ اچھے ڈھنگ سے بات کرلیں گے۔"

سیرت کا زیادہ واسطہ بیک لڑکے لڑکیوں سے پڑتا تھا جنہیں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی سمجھانی پڑتی تھی، کاظم صاحب ایک میچور مرد تھے۔ اس نے باریکیوں پر دھیان نہیں دیا تھا کیونکہ تجربے کی بنیاد پر بہت کچھ وقت خود ہی سمجھا دیتا ہے۔

"تو پھر کیا نتیجہ رہا؟"

"جی، خوش ہوا تھا وہ۔ اب بس یہی فکر ہے کہ گھر جا کر جب ماں اور سوتیلے بھائی بہن کو بتائے گا تو وہ اسے کس انداز میں لیتے ہیں۔"

"وہ بھی خوش ہوں گے، آپ نے جس طرح مجبوری کے انداز میں اقرار کیا ہے، وہ اس ہاتھ آئے موقع کو مس نہیں کریں گے اور فرض کریں صورت حال مختلف رہی تب بھی آپ ہار نہیں مانیں گے۔ آپ فرہاد سے کہنا کہ ٹھیک ہے اپنی ماں کے پاس جا کر رہو۔ میں تو اتنا ہی کر سکتا تھا۔ لامحالہ اسے آپ کی بات ماننی پڑے گی۔"

"ہاں، امکان بھی یہی ہے۔ چلیں خیر آج شام تک ہی معلوم ہو جائے گا۔ آپ سنائیں، کیا ہو رہا تھا۔"

"بس، کچھ میلو کے جواب لکھے، اب فری تھی۔"

"کب سے اسٹارٹ کیا یہ کام۔ کیسا تجربہ رہا؟"

"جی ڈھائی سال ہو گئے اور تجربہ۔" وہ ہنسی۔ "شروع شروع میں بہت مشکل رہا، کیونکہ زیادہ لوگ بس اُلو بنانے اور مذاق اڑانے والے ملے، لیکن میں بھی کچھ اونچے طبقے کی ڈھیٹ تھی۔"

"اس کا خیال کیسے آیا؟ سوری سیرت! مس کچھ پرسنل تو نہیں ہو رہا۔"

"ارے نہیں نہیں۔ مجھے تو بلکہ اچھا لگ رہا ہے۔ یہاں تو سب اپنی کہنے آتے ہیں، ہماری نہ کسی نے سننی ہوتی ہے نہ ہم ایسی شکایت کا حق رکھتے ہیں۔"

"ہاں اور ویلا زمین دار بھی کہاں ملا ہوگا کبھی۔"

"ہاہاہا۔ یہ بھی صحیح ہے۔ ویسے آپ نے مجھے بری طرح چکرا دیا تھا کل۔ میں تو پہلے جملے سے آپ کو ٹین ایجر ہی سمجھی تھی۔"

"جی ہاں، میں سمجھ رہا تھا اور آپ پریشان کیوں تھیں کل؟" کاظم کو یاد آیا۔

"یوں ہی کہہ دیا تھا اور کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔"

"نہیں سیرت! لفظوں کی سچائی لہجوں سے جانچی جاتی ہے اور آپ کے لہجے کا درد کسی حقیقی پریشانی کا غماز تھا۔"

"اردو بڑی اچھی بولتے ہیں، زمین دار صاحب!" سیرت نے مسکرا کر تعریف کی لیکن کاظم جواباً کچھ دیر بالکل خاموش ہو گئے۔

"معافی چاہتا ہوں، ذاتی سوال کرنا واقعی نامناسب ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے سر!" سیرت سخت پشیمان ہوئی۔ کاظم ایک بالکل تنہا شخص تھا۔ اس کی زندگی میں مخلص دوستوں کی بہت کمی رہی تھی۔ کسی کی دل شکنی کر کے اپنے عہد پر قائم رہنا، اسے منظور نہ تھا۔ پھر لوگوں کی رہنمائی کرنا اس کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ صرف ایک جذبے کے تحت ایسا کر رہی تھی۔ ایسے میں مقابل کا دوستی کے خیالات رکھنا فطری اور جائز تھا۔

"کسی معاملے نے مجھے بہت دنوں سے الجھا رکھا ہے۔ میری زندگی کی ایسی الجھی گرہ، بنا قدرت



کی مدد کے جس کا سلجھنا ناممکن ہے۔"

"کیا میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں؟"

"شاید نہیں۔ سمجھیں تو شیئر کر لیں اور کچھ نہیں تو بوجھ اور دباؤ کچھ کم ہو جائے گا۔ جیسا کل میرا ہوا۔ کبھی کبھی اجنبیوں سے کہہ لینا زیادہ اچھا رہتا ہے بہ نسبت کسی بہت قریبی کے۔"

"بہت قریبی ایک ہی ہے اور ساری شکایتیں اسی سے ہیں۔" وہ بڑے درد سے خود اپنے آپ پہ ہنسی۔ پلکیں اس بے درد کے ذکر پر اپنے آپ ہی نم ہو جاتیں۔ کاظم خاموشی سے بیٹھے اسے سنتے رہے، وہ بولتی رہی، روتی رہی اور دل کا سارا بوجھ باہر نکال دیا۔

☆☆☆

سمن کو شہر کے ایک بڑے اور اچھے پرائیویٹ اسکول میں جاب مل گئی تھی۔ تنخواہ اتنی تھی کہ نہ صرف وہ اپنے خرچے نکال سکتی تھی بلکہ گھر کے اخراجات میں بھی اپنا حصہ ڈال سکتی تھی۔ آپا کے تین بچے تھے، تینوں اسکول جانے والے تھے، اور بھائی جان سرکاری ملازمت کرتے تھے۔ گھر ان کی انکم سے ہی چلتا تھا۔ آپا دن بہ دن چڑچڑی ہو رہی تھیں۔ انہیں احسان لگا کر جتانے کی بہت عادت تھی۔ نیلو آپا کا بے ضرر وجود جو بھی کسی کو نہ کھٹکتا تھا، وہ آئے گئے پر ان کو سنبھالے رکھنے پر بھی داد وصول کرتیں۔ اماں کے صرف ایک مرتبہ کے کہے پر وہ مکان کو اپنی ملکیت تصور کرنے لگی تھیں۔

سمن نے صاف دیکھا کہ وہ اسے اس گھر میں مہمان ہی سمجھتی تھیں، حالانکہ اب وہ مہمان کہاں تھی، اس کا تو اب اس چھت کے سوا اور کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ لیکن اسے تو حق مانگنا بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ سگے رشتوں میں دولت اور جائداد کے معاملات دراڑ ڈالنے کا باعث بنیں، ایسا وہ کبھی بھی نہیں چاہ سکتی تھی۔ جاب کرنے سے اتنی تسلی البتہ ہوئی کہ خود کو بوجھ سمجھنے کا احساس کچھ کم ہو گیا اور ہر مہینے کچھ رقم پس انداز بھی کرنی تھی۔ اسے اپنے لیے کچھ بہت ضروری چیزیں ترجیحی بنیادوں پر خریدنی تھی لیکن یہ تین، چار ماہ سے پہلے ممکن نہ تھا۔ ہاں اگر کہیں لمیٹی ڈال دیتی تو۔ وہ اپنی ان ہی سوچوں میں غلطاں گھر کے اندر داخل ہوئی، بچے اسکول سے لوٹ آئے تھے۔ مانی، رضا صحن میں کرکٹ کھیل رہے تھے اور نین برآمدے کی چارپائی پر بیٹھی سر میں تیل لگاتی نظر آئی۔ بھائی جان کچن کی بیرونی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

"السلام علیکم بھائی جان!" اس نے ہینڈ بیگ کندھے سے اتار کر میز کے دوسرے کنارے پر رکھا۔ ارادہ قریبی کولر سے پانی کا گلاس بھرنے کا تھا جب آپا کی بھاری بھرکم آواز کانوں میں بہت قریب سنائی دی۔

"آ گئیں تم۔ کر دیا ناں کلیجہ چھلنی، معلوم تھا میری بہن، رہی سہی کسریں بھی تمہارے کرتوت ہی پورے کریں گے۔" وہ کچن کے دروازے میں آ کر بری طرح پھٹ پڑی تھیں۔ سمن نے حیران ہو کر بھائی جان کو دیکھا۔ انہوں نے انجان بنتے سر کھانے پر جھکا لیا۔ وہ ایسے ہی تھے، کم گو شریف الطبع، بیوی کی سن کر بنا چوں چراں کیے اسی کی ماننے والے۔

"کیا ہوا آپا۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

"میں کیوں اپنی زبان کو زحمت دوں، خود ہی دیکھ لو کیا گڑھا کھودا ہے ہمارے لیے۔" انہوں نے پلٹ کر کچن کی سلیب سے کچھ اٹھایا اور لا کر سمن کے ہاتھ پر پٹخا۔ گلاس واپس میز پر رکھتے اس نے پیپر ہاتھ میں لیا۔ کورٹ کی طرف سے نوٹس تھا، سمن بغور پڑھنے لگی۔ اوہ، یہ تو گھر خالی کرنے کا نوٹس تھا اسامہ کی طرف سے۔ سمن نے لب چباتے بمشکل ایک نگاہ بھائی جان پر ڈالی، آپا کو دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

"اپنا گھر تو تباہ کیا سو کیا ہماری چھت بھی رہنے نہیں دی۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ ماما جی کی طرف سے گھر جہیز کیے جانے کے کاغذات موجود ہیں۔ اسامہ یہ گھر ہم سے نہیں لے سکتا۔" اس نے آہستگی سے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"جو کرنا ہے کرو۔ میں یہاں سے جانے والی نہیں۔" وہ غصے سے واپس اندر چلی گئیں اور سمن پیپر لیے اپنے کمرے میں آگئی۔ اسامہ نے شاید گھر کے پرانے کاغذات کی بنیاد پر جھوٹا کیس کر ڈالا تھا۔ اس نے اماں کا صندوق کھول کر دوسرے کاغذات ڈھونڈنا شروع کر دیے۔

☆☆☆

"کیا حال ہیں سیرت ابڑی تو نہیں؟"

"ارے نہیں کاظم صاحب! کیسے مزاج ہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں، ابھی آپ کو ہی یاد کر رہی تھی۔"

"اچھا واہ، ایسے ہمارے نصیب۔ ویسے کیا سوچا جا رہا تھا۔" کاظم کا موڈ بھی آج کافی خوش گوار لگتا تھا۔ سیرت اور وہ اب روزانہ بات کرتے تھے۔ سیرت کی زبانی اس کا مسئلہ سن کر انہوں نے بھی سیرت کو کچھ حل بتائے تھے۔ اگرچہ سیرت کی پرابلم واقعی کافی ٹیڑھی تھی لیکن وہ اسے مطمئن رہنے کے لیے روحانی حل بتاتے تھے۔ اور سیرت بھی کاظم صاحب کی بے حد مشکور ہوئی کیونکہ روٹین کی عبادت کے علاوہ اسے اپنے لیے زیادہ وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ کاظم صاحب کے بتانے پر اس نے کچھ ایسے وظائف کا آغاز کیا جو اس کی ذاتی زندگی میں سدھار لا سکتے تھے اور وہ روزانہ باقاعدگی سے آن لائن آتے، سیرت سے اس کا حال احوال پوچھتے، کچھ اپنی کہتے اور اگلے دن کے وعدے پر پھر اجازت لے لیتے۔

"جی بس یونہی خیال آیا کہ اب تک میں نے فرہاد کی تصویر نہیں دیکھی۔ شاید تصویر دیکھ کر اس کے مزاج کو سمجھنا میرے لیے زیادہ آسان ہو جائے۔"

"بالکل، مجھے بھی یہ خیال نہیں آیا۔ میں ابھی آپ کو اس کی تصویر بھیج دیتا ہوں۔ ویسے یاد آیا، بہت دن پہلے آپ نے کہا تھا ابھی آپ اور بھی بہت کچھ مجھے میرے مزاج کے متعلق بتائیں گی۔"

"جی اور جیسے آپ نہیں جانتے اپنے مزاج کے بارے میں۔ ہاں؟" سیرت مسکرائی۔

"بھئی دوسرے کے منہ سننا کچھ اور بات ہوتی ہے اور مجھے کبھی کسی نے میرے متعلق ایسے نہیں بتایا، آپ میری خامیوں کے متعلق زیادہ کھل کر بتائیے۔"

"ٹھیک ہے، میں ایک بار پھر تصویر دیکھ کر آرام سے لکھ کر بھیجوں گی۔"

"بہت شکریہ اور خامیوں کے ساتھ اگر ان کے سدھار کی صلاح بھی ہو تو کیا بات ہے۔"

"اوہو۔ پھر تو لگتا ہے خط کافی طویل ہو جائے گا۔" سیرت شرارت سے ہنسی۔

"تب تو احسان ہوگا مجھ پر۔ ایسی فراغت میں طویل خط و کتابت ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہے۔"

"ویسے میری مانیں تو اپنی فراغت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ کتب بینی میں اضافہ کریں اس سے پریشانی بھی حملہ آور نہیں ہوتی۔"

"پھر تو فی الحال واقعی مشکل ہے۔" کاظم نے بے ساختہ کہا۔

"اچھا، وہ کیوں؟" سیرت بھی متعجب ہوئی

"وہ اس لیے کہ آج کل کوئی پریشانی ہی نہیں۔" کاظم صاحب مبہم سا مسکرائے تھے۔

"ماشاء اللہ۔ یہ تو بہت اچھی خبر ہے، اللہ آپ کے دل کو یونہی پرسکون رکھے۔"

"آمین۔ اللہ آپ کی مشکلیں بھی آسان فرمائے۔ دعاؤں میں یاد رکھا کریں۔"

"جی ضرور۔"

"اوکے، آپ اپنا کام کیجیے، ان شاء اللہ پھر بات ہوگی۔"

"اللہ حافظ۔" سیرت نے بھی مسکراتے ہوئے کال آف کر دی۔

☆☆☆

"جی فرمائیے؟" آسیہ نے دروازے میں کھڑے بلند قامت، سنجیدہ، قدرے مغرور سے شخص کو ازلی روکھے پن سے دیکھا۔

"جی مجھے سمن رباب سے ملنا ہے۔"

"وہ اسکول گئی ہے۔ ڈیڑھ بجے آئے گی۔"

آسیہ اب اچنبھے میں تھی کہ بھلا سمن کو جاننے والا یہ اجنبی کون ہو سکتا ہے۔

"ڈیڑھ بجنے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی ہے، اور مجھے آپ سے بھی کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ کیا آپ مجھے اندر آنے دے سکتی ہیں۔"

"سوری، میں ایک انجان....."

"میں ابھی کچھ دیر پہلے آپ کے شوہر ارسلان سے مل کر آرہا ہوں۔ آپ چاہیں تو ان سے بات کر کے تسلی کر لیں۔ گھر کا ایڈریس مجھے انہوں ہی نے دیا ہے۔" باوقار شخص نے اسی سکون سے بات مکمل کرتے آسیہ کے چہرے کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر مخمصے میں پڑنے کے بعد سر ہلاتے ایک سائڈ پر ہو گئیں۔ اندر سے یہ جاننے کی خواہش بھی شدید تھی کہ آخر یہ آدمی سمن سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔ سمن سے پوچھا تو وہ کہیں اور کی اور کہانی نہ سنا دے، کیوں نہ اس کے آنے سے پہلے ان ہی حضرت سے سن لیا جائے، پھر وہ عدالت کا معاملہ بھی آپڑا تھا۔ ہو سکتا ہے سمن نے کسی وکیل کی خدمات لی ہوں۔ وہ اس آدمی کو لیے اندر بیٹھک والے کمرے میں آگئیں۔ ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بہت شکریہ۔"

"آپ وکیل ہیں پیشے سے؟" آسیہ نے بھونڈے پن سے اپنے مخصوص لاپروا انداز میں بنا سوچے آغاز لیا۔ آدمی کے لبوں پر دھیمی سی مسکان آئی۔

"جی نہیں۔"

"سمن کو کیسے جانتے ہیں، کیا کام ہے اس سے؟" وہ خود بھی دوپٹا ٹھیک سے اوڑھتے سامنے بیٹھ گئیں۔

"سمن ابھی کچھ عرصہ پہلے تک کویت میں ہوتی تھیں تو....."

"آپ کہیں حمزہ تو نہیں۔" آسیہ نے تعجب سے انگلی ناک پہ رکھی۔ سمن نے جو گل کھلایا تھا، ایسا نتیجہ تو جائز تھا بھی۔

"جی نہیں۔ کون حمزہ؟" وہ حیران ہوئے۔

"چلیں رہنے دیں۔" آسیہ جھنجلائی۔ "آپ ہی بتا دیں اپنے بارے میں۔"

"جی میں وہی بتا رہا تھا۔" اس نے جیسے آسیہ کی عقل پر دل ہی دل میں ماتم کیا۔

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے آپ.....؟" آسیہ نے کھسیا کر سوال کیا۔

"سمن جن دنوں کویت میں تھیں تو ہماری جان پہچان انٹرنیٹ کے ذریعے ہوئی، انہوں نے مجھے اپنے اور اسامہ کے حالات تفصیل سے بتائے تھے۔ پھر اچانک آخری میل میں صرف یہی بتا کر چلی آئیں کہ ان سے علیحدگی ہو گئی ہے۔ میں انہیں ڈھونڈتا ہوا آیا ہوں۔"

"آپ کویت سے اسے ڈھونڈتے ہوئے....." آسیہ کی آنکھیں باہر ابلیں۔

"جی نہیں، میں یہیں سے ہوں۔" انہوں نے مختصر جواب سے آسیہ کا خیال رد کیا۔

"تو آپ کو اس سے کیا کام ہے؟"

"جی....." وہ میری ایک مسئلے میں ہیلپ کر رہی تھیں، ان کی مدد درکار ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟ اور کیسی مدد؟" آسیہ کا دھیان فوری طور پر مالی امداد وغیرہ کی طرف گیا، حالانکہ حلیے سے تو دینے والوں میں سے لگتا تھا۔

"میں نے ان سے اپنی ایک ذاتی پرابلم پر رہنمائی چاہی تھی اور ان کے مشورے میرے بہت کام آرہے تھے لیکن پھر وہ خود کرائسس میں آگئیں۔ وہ میری بہت اچھی دوست بھی ہیں، ان سے ملنا اور تسلی دینا مجھے اپنا فرض لگا بحیثیت دوست کے اور....."

"کیسے کرائسس اور کیسی تسلی بھائی

صاحب۔" آسیہ کو اس دردمند پر افسوس ہوا۔ "اس کی اپنی یہی مرضی تھی اور اب مست گھوم رہی ہے، آزادی کے مزے لے رہی ہے، عذاب میں تو ہماری جان آگئی ہے۔"

"آپ بہن ہیں سمن کی؟" مقابل کو شبہ سا گزرا کیونکہ انداز تو کسی سڑیل نندوالے تھے۔

"سگی بہن ہوں۔" آسیہ نے گویا جل کر سگی پہ زور دیا۔ "یاد رکھیں بھیا! جو دکھایا جاتا ہے ناں وہ حقیقت سے بہت الگ ہوتا ہے۔ اس نے آپ سے دوستی کی، ہمدردی وصول کی، اس لیے آپ اس کے لیے دکھی ہو رہے ہیں، ہم جیسے قریبی لوگوں سے پوچھیں۔"

"اچھا تو بتائیں۔" انہوں نے جیسے آرام سے پشت ٹکائی۔ "شاید میں واقعی اندھیرے میں ہوں۔"

"اسامہ ہماری اماں کا ماموں زاد ہے، ان کے ابا نے یہ مکان جہاں ابھی ہم بیٹھے ہیں، بڑی محبت سے میری اماں کے نام کیا اور اسامہ کا رشتہ بھی اسی محبت کے رشتے کی بنا پر آیا۔ اچھا کھاتا کماتا لڑکا تھا، ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ خوشی خوشی اپنی بہن کو بیاہ دیا۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے سمن سدا کی ناشکری ہے، جو مل جائے اس کی کبھی قدر ہی نہیں کی۔ ہر سال چھٹی پہ پاکستان آتی اور اسامہ کی سخت مزاجی کے رونے روتی، بارہا تو بہن کی محبت میں، میں نے اسامہ کو کال کر کے پیار سے سمجھایا تاکہ گھر کے حالات یہ اپنی بچگانہ باتوں سے خراب نہ کرے اور پچھلی بار پاکستان آئی تو سمن نے مجھ سے کہا کہ وہ اسامہ سے طلاق چاہتی ہے تب مجھے کچھ کھٹکا لگا کہ عورت کے منہ سے ایسی بات بھلا کہاں نکلتی ہے۔ بہت سمجھایا بجھایا پر اس لڑکی نے ہمیشہ اپنی من مانی کی۔ سال بھر بھی نہیں گزرا اور طلاق لے کر آ گئی۔ وہ تو اسامہ نے مجھے روتے روتے سب کچھ بتایا۔ اب تک بے چارہ عزت کے ڈر سے چپ تھا۔ یہ کلموہی وہاں کسی سامنے فلیٹ والے حمزہ کے چکر میں تھی۔ اسامہ نے بہت چاہا کہ اس کا گھر بچ جائے لیکن جب یہ ہی نہیں چاہتی تھی وہ اکیلا کیا کرتا۔ اب دیکھیں کچھ روز گزریں گے وہ بھی ڈھونڈتا ہوا آ پہنچے گا۔ نہیں کہاں کہاں دوستیاں کر رکھی ہیں۔"

"آپ کو اسامہ کے کہے پر اتنا یقین کیوں ہے اور سمن نے جو کچھ بتایا۔"

"سمن کی تو مجھے ایک جھوٹی کہانی نہیں سنی، باتوں کے جال میں پھانستی ہے۔"

"آپ نے اب تک سمن کو سنا ہی نہیں؟" وہ از حد حیران ہوئے۔

"سننے کو بچا ہی کیا ہے۔" انہوں نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ "اب تو کاغذ آتے ہیں، ہمارا منہ چڑانے۔ اسامہ نے گھر خالی کرنے کا نوٹس بھیجا ہے اور بھلا کیوں نہ بھیجے، اس لڑکی نے ہمیں تباہ کرنے میں کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی۔" آسیہ تو اب رو دینے کو تھی۔ انہوں نے ایک نظر اس تیکھی جلد باز عورت کو دیکھا اور تاسف سے سر ہلایا۔

"آپ کو یہ پتا ہے کہ آپ کی بہن نے آن لائن ایک ویب سائٹ بنا رکھی تھی جس پر وہ لوگوں کی رہنمائی کرتی تھیں، بنا کسی فیس وغیرہ کے۔ صرف خدمت خلق کے جذبے کے تحت؟"

"سمن نے؟" انہوں نے دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے حیرت سے دیکھا۔ "نہیں تو۔"

"وہاں سب انہیں سیرت کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ بہت اچھی فیس ریڈر ہیں اور بلاشبہ بہت اچھی مشیر بھی۔ ان کے مشوروں اور رہنمائی نے بہت لوگوں کا بھلا کیا، لیکن انہوں نے صلے میں صرف دعائیں پائیں۔ میں بھی حالات کا ستایا ہوا ایسا ایک شخص تھا جسے قدرت نے سمن سے ملوایا۔ میرا نام کاظم علی ہے۔ سیرت اپنا سارا وقت لوگوں کی بھلائی میں صرف کرتے اپنے دکھ کو بھلانے میں کوشاں تھیں۔ وہ دکھ جو اس کی سگی بہن نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی، وہ دکھ جس کا واحد رازدار اس بھری دنیا میں صرف میں ہوں اور مجھے ان کی سچائی پر کوئی شبہ بھی نہیں کیونکہ میں سچ کو لہجوں سے پہچانتا ہوں، لفظوں



سے نہیں اور اب آپ مجھے خاموشی سے سنیں گی۔ بنا بات کاٹے۔" کاظم نے تنبیہہ بھی دھونس کے انداز میں کی، آسیہ بس خفگی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"اسامہ کے والد نے یہ گھر اپنے بڑے بیٹے کی زندگی بچ جانے کی منت کے طور پر آپ کی والدہ کو گفٹ کیا، ایسا ہی ہے ناں؟" کاظم نے جیسے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" آسیہ نے سر ہلایا۔

"اسامہ کا اس گھر میں بچپن گزرا تھا اور اس گھر سے محبت کی بنا پر وہ اسے دوسروں کے ہاتھوں میں جاتے ہرگز نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر بھائی کی بھی وفات ہو گئی تو اس کے سر پر اپنا مکان جنون بن کر سوار ہو گیا۔ اور چونکہ عدالت کے ذریعے وہ اسے واپس نہیں پا سکتا تھا تو اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اس نے سمن سے شادی کی۔ سمن کو بہت آغاز میں ہی اس کی نیت کا پتا چل گیا تھا۔ انہوں نے آپ دو بہنوں کی خاطر اسامہ کی بات ماننے سے انکار کیا۔ وہ آپ سے اس چھت کا سہارا چھیننا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے پہلے دن سے اسامہ کی ناجائز خواہش کے خلاف اسٹینڈ لیا۔

اسامہ بھی ضد کا بہت پکا تھا، پہلے پہل اس نے سمن پر یہ شرط رکھ دی کہ اگر وہ اس کی بات مان لے تبھی وہ انہیں اپنے ساتھ کویت لے جائے گا۔ سمن یہاں آپ لوگوں کے درمیان رہ کر بھی اس معاملے کو آپ سے چھپائے شوہر کو سمجھانے میں لگی رہیں۔ لیکن اسامہ نے جب دیکھا کہ دو سال گزر جانے پر بھی سمن نے ہتھیار نہیں ڈالے تو اس کو اپنے پاس بلا کر اگلے مرحلے میں یہ دھمکی دی کہ جب وہ گھر اسے واپس دلانے میں کامیاب ہو جائیں گی تبھی ماں بننے کی خوشی حاصل کر سکتی ہیں۔ میں نے سمن سے تب سوال کیا کہ آپ کا شوہر آخر اس مکان کو خرید کیوں نہیں لیتا، وہ تو باہر ملک میں کما رہا ہے، چاہے تو اپنی خواہش کو پیسے سے حاصل کر سکتا ہے۔ تب سمن نے بتایا کہ اسامہ کویت میں ٹیکسی ڈرائیور ہے اور......"

"ہائے۔ ٹیکسی، ڈرائیور۔" آسیہ کی آنکھیں باہر آئیں۔ "نہیں تو۔"

"جی ہاں۔ باقی تمام باتوں کی طرح یہ بات بھی اس نے چھپائی۔ انتہا کا لالچی اور کنجوس آدمی ہے، اسے یہ گھر بنا ایک بھی دھیلا خرچ کیے حاصل کرنا تھا۔ سمن کو اولاد کی خوشی سے محروم رکھ کر وہ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی ہار نہیں مانی۔ اسے لگتا تھا وہ اسامہ کو سمجھا لے گی۔ لیکن اب کچھ عرصے سے وہ سمن کو مسلسل طلاق کی دھمکی دے رہا تھا کہ اگر اس نے مکان واپس نہ دلایا تو وہ اسے طلاق دے دے گا اور بالآخر آپ کی بہن آپ کی خوشی کی خاطر طلاق لے کر واپس آ گئی، اسامہ کی بات اس نے اپنا گھر خراب کر کے بھی نہیں مانی، کیونکہ یہ گھر آپ کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے، وہ اچھی طرح جانتی ہے اور جہاں تک حمزہ کا تعلق ہے، مجھے سمن نے ایک بار بتایا تھا کہ اس کی انڈین دوست سبیکا کے شوہر حمزہ نے اسے ویب سائٹ بنا کر دینے میں ہیلپ کی تھی۔ سمن نے بڑی عزت سے اسے حمزہ بھائی کہہ کر بلایا تھا اور یہ واحد فیملی تھی کویت میں جن سے سمن کے اچھے مراسم تھے۔ اسامہ کو طلاق دینے کی اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تو یہی کہہ دیا۔"

"حیرت ہے سمن نے تو مجھے کبھی یہ سب نہیں بتایا۔"

"کیونکہ آپ نے کبھی مجھے سنا ہی نہیں، بلکہ کسی نے مجھے کبھی نہیں سنا۔" دروازے سے دھیمی نرم آواز سنائی دی تو کاظم کی دھڑکنیں ڈوب سی گئیں۔ آنکھیں بے ساختہ میچ کر وہ وہیں ساکت سے ہو گئے۔ سیرت سے آواز کا رشتہ تھا، بہت گہرا، بہت قریبی اور دلی۔ ایک محبوب آواز مجسم کہیں آس پاس موجود تھی اور ان میں سر اٹھا کر دیکھ لینے کی ہمت نہ تھی۔ وہ اسے کبھی بتا نہیں پائے تھے کہ اس کے لیے وہ کیا سوچتے ہیں۔

"تو اب سمن؟" آسیہ کی گھبرائی آواز میں عجیب سی یاسیت تھی۔ اسامہ کا یہ نیا ہتھکنڈا؟

"میں نے کہا ناں آپا! وہ یہ گھر ہم سے نہیں

لے سکتا۔"

"یہ گھر اُسے دے دیں سمن!" کاظم نے اٹھ کر کھڑے ہوتے بات قطع کی، سمن ابھی تک دروازے میں ہی کھڑی تھی اور کاظم کھڑے ہوجانے کے بعد بھی داہنے ہاتھ کو نہیں مڑے تھے۔ آنکھیں سامنے دیوار پر لگائے وہ ابھی تک سائیڈ پوز کیے کھڑے تھے۔

"لیکن سر! ہم فی الحال بالکل اس پوزیشن....."

"ان باتوں کی فکر آپ مت کریں۔" ان کا لہجہ قطعی تھا۔ بات وہ اب بھی بنا سمن کی طرف دیکھے ہی کررہے تھے۔ "یہ آپ کے نئے گھر کے کاغذات ہیں۔" انہوں نے سامنے میز پر رکھی ایک فائل کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں کاظم صاحب! میں یہ ہرگز نہیں....."

"یہ آپ کے لیے ہے بھی نہیں۔" وہ پہلی مرتبہ ہلکا سا مسکرائے تھے۔ اب بھی بنا دیکھے۔ "یہ آپ کی سسٹرز کے لیے ہے، میری طرف سے۔"

"لل..... لیکن..... ہم بنا کسی رشتے کے....."

سمن کے دھکا دینے پر آسیہ سٹپٹا کر اتنا ہی بول پائیں۔

"رشتہ جوڑنے کی راہ میں صرف ایک جواب حائل ہے، آپ سے درخواست ہے کہ میرا پروپوزل اپنی بہن کے سامنے رکھ کر اس پر غور کرنے کا کہیں۔ میں خلوص دل سے صرف سمن کا ساتھ....."

"مجھے قبول ہے۔" سمن نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً ہی کہا تو آسیہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ حیرت سے سمن کی طرف مڑیں۔

"آپا مہمان کو چائے نہیں پوچھیں گی؟" وہ اب ہلکا سا مسکراتے بہن کو دیکھ رہی تھی جو ہڑبڑاہٹ میں کبھی ان دونوں کو دیکھتیں کبھی اس فائل کو اور پھر سر کھجاتے باہر کی طرف لپکیں۔

"ہاں ہاں ابھی لاتی ہوں ناں۔" ان کے باہر نکلتے ہی سمن دروازے سے دو قدم اندر آ کر رُکی۔

"بہت شکریہ کاظم صاحب! آپ نے ہماری بہت بڑی مشکل حل کی ہے۔ اللہ پاک ہی آپ کو اس کا اجر دے سکتا ہے۔"

"شکریہ آپ کا سیرت۔" وہ روانی میں اس کا دوسرا نام لے گئے۔ "مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ آپ اتنی جلدی آ....."

"تو کیا لگتا ہے کیوں؟" وہ اب ہاتھ سامنے لپیٹے دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

"آں..... مکان کے لیے تو بالکل نہیں۔" انہوں نے جیسے رُک کر سوچا اور سر ایک یقین کے تحت نفی میں ہلایا۔

"وہ کیوں؟ جبکہ ہم واقعی مشکل میں ہیں تو۔"

"کیونکہ آپ لالچی اور مفاد پرست ہوتیں تو آن لائن کونسلنگ سے گھر بیٹھے ہزاروں کما سکتی تھیں۔ ایک مکان کا تنازعہ تو بہت معمولی چیز ہے آپ اُس کمائی سے بے شمار فائدے حاصل کرسکتی تھیں اور ایک معاملہ جس نے آپ کی ازدواجی زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی، آپ نے اس پر کمپرومائز نہیں کیا۔ ایمان کی مضبوطی کا اس بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آپ نے ذاتی مفاد کو پس پشت ڈالتے صرف انسانیت کی خدمت اور اللہ کی خوشنودی کو مدِنظر رکھا۔ یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ آپ مکان کے حصول کے لیے ہامی بھریں گی۔"

"تو پھر؟"

"آپ سے سننا چاہتا ہوں، کیونکہ میں بھی وجہ جاننے کا مشتاق ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے چارقل کی سادہ سی تصویر کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ نے میرے لہجے کی سچائی کو اپنے دل میں اترتے پایا اور وہ بھی کچھ ایسے کہ ظاہری خوب صورتی کو قطعی بے معنی سمجھا۔ بغیر میرا چہرا دیکھے صرف مجھے سمجھتے ہوئے آپ نے مجھے پروپوز کیا، میں سوچنے کا وقت مانگتی تو خود اپنی نظروں میں شرمندہ ہوجاتی۔"

"ویسے میں اتنی بھی خوف ناک نہیں کہ سات



منٹ کے فاصلے سے دیکھنے والا ڈر جائے۔" آخر میں اس نے ہلکے پھلکے کہہ دیا تو کاظم مسکراتے ہوئے مُڑے اور ان کے اپنی جانب مڑتے قدموں کے ساتھ سمن کی نظریں نیچے ہوتی گئیں۔ کاظم کے کالے بوٹوں کو دیکھتے وہ بری طرح نروس تھی۔

چہرے کے گرد حجاب کے انداز میں کالا رومال لپیٹے سفید رنگت، کتابی چہرے اور سادہ سے نقوش والی وہ لڑکی صورت سے بھی اتنی سچی اور نیک نیت دکھائی دیتی تھی جتنا اس کو سن کر جانا اور سمجھا تھا۔

"ہزار بار قبول ہے۔" وہ دل سے مسکرائے اور سمن نے ذرا سی نظر اٹھا کر پہلی مرتبہ ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آپ نے مجھے ڈھونڈا کیسے؟"

"ہوں۔" پلٹ کر دوبارہ صوفے پر بیٹھتے اسے بھی ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "بیٹھو۔"

"جی۔" سمن بھی سائیڈ کے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی

"تم نے اپنے متعلق جب اپنے حالات بتائے، ان میں تین باتیں ایسی تھیں جنہوں نے ڈھونڈنے میں مدد دی۔ سیالکوٹ، ارسلان بھائی اور ان کا ٹیچر ہونا۔ بس ان ہی تین نشانیوں کی بنیاد پر پچھلے تین ماہ سے مسلسل ڈھونڈ رہا ہوں۔ اس کوشش میں ایک ارسلان صاحب اور ملے، میں نے جب ان سے پوچھا کہ آپ کی کوئی سالی صاحبہ کو پت بیاہی ہوئی ہیں تو انہوں نے گارڈ سے پکڑوا کر پرنسپل کے سامنے پہنچا دیا۔"

"اوہ۔" سمن نے بے ساختہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ "سوری۔"

"جی۔ ہفتے میں دو دن سیالکوٹ آنے کے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔ سارا سارا دن اسکولز ڈھونڈتا اور اسی تلاش بسیار میں ہی ایک اچھی رہائشی کالونی میں یہ گھر تلاش کیا۔"

"یہ آپ نے واقعی تکلیف کی کاظم صاحب۔ مجھے اس کا بوجھ محسوس ہوتا رہے گا۔"

"تو میرا بوجھ ہلکا ہونے پر خوشی محسوس کرلو۔" انہوں نے سنجیدہ نہیں لیا۔

"فرہاد کیسا ہے؟ آپ کی پریشانی کچھ کم ہوئی؟"

"جی ہاں، میری پریشانی آج کل ان ماں بیٹوں کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہے۔" وہ رسان سے مسکرائے اور پھر خود ہی وضاحت دینے لگے۔

"کارخانہ تو تب ہی فرہاد کے نام کردیا تھا۔ اس کے سر پر بھی دھن سوار ہوگئی ہے، کچھ کر دکھانے کی۔ اس کو تھکا تھکا اور نڈھال دیکھتا ہوں تو ترس بھی آتا ہے لیکن جانتا ہوں ایسی بگڑی ہوئی اولاد بنا ہاتھ پیر ہلائے محنت کا مطلب نہیں سمجھ سکتی اور ابھی دوسرا جھٹکا تو باقی ہے۔" وہ کچھ سوچ کر مسکرائے، سمن نے چونک کر دیکھا تو اسی کو دیکھ رہے تھے۔

"میری تیسری شادی کی فکریں بھی انہیں کب سے لاحق تھیں۔ تمہارے آنے پر محنت کا گراف کچھ

## سانحہ ارتحال

ہماری مصنفہ حیا بخاری طویل علالت کے بعد قضائے الٰہی سے وفات پاگئیں۔

انا اللہ وانا الیہ راجعون

ہم حیا بخاری کے اہل خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) بہنوں سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اور بلند ہوگا۔"
"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" وہ شرمایا شرمایا سا مسکرائی۔
"ہاں بالکل، اگر دل لگا کر کام کرنا سیکھ جائے تو میرے لیے بھی ذہن بنانا آسان ہوگا۔ پھر مجھے بھی اس کا حق اس کے حوالے کرنے میں ذہنی پریشانی نہیں ہوگی۔"
"آپ نے اتنا بڑا فیصلہ ایسے اچانک کیسے کرلیا؟" ثمن کی سوچ ابھی بھی تیسری شادی کے ذکر پر اٹکی تھی۔
"تمہیں کوئی اعتراض ہے ثمن تو تم ابھی بھی وقت لے سکتی ہو۔ آرام سے سوچو، سمجھو پھر کسی فیصلے پر پہنچو۔"
"میں فیصلہ کرکے پچھتاتی نہیں۔" وہ اعتماد سے مسکرائی۔ "جب اسامہ کا رشتہ آیا تب میرے تین رشتے اور بھی تھے۔ آپا نے مجھ سے میری رائے مانگی تو میں نے ان سے کہا کہ اسامہ کو چھوڑ کر باقی تین میں سے کسی کو بھی ہاں بول دیں۔"
"ریئلی؟" کاظم حیران ہوئے۔
"جی۔ لیکن نصیب کے سامنے کہاں کسی کی چلتی ہے۔ باقی تین رشتوں میں کچھ نہ کچھ ایسا پیش آتا گیا کہ اسامہ کو ہی سب نے بیسٹ سمجھا۔"
"تو پھر اس بوڑھے خبطی میں ایسا کیا نظر آیا کہ ..." کاظم نے لطافت سے کہتے ثمن کو دیکھا تو وہ منہ کھولے حیرت سے پہلے تو انہیں دیکھتی رہی پھر زور سے ہنس پڑی۔
"جب آپ نے مجھے اپنی کہانی سنائی اور آپ کو مین ایجر سمجھنے والا میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تب میں نے بالکل اسی خطاب سے نوازا تھا آ...... کو۔ کیونکہ آپ نے تب تک تصویر نہیں بھیجی تھی۔"
"تو تصویر دیکھنے کے بعد؟" وہ جتاتے انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ثمن سے نظر نہیں ملائی گئی۔
"خوش ہو ثمن؟" وہ کچھ بے یقین سے تھے۔

"جی، بہت۔ مجھے ہماری یہ ملاقات پھر خواب جیسی لگ رہی ہے۔ مجھے خود نہیں پتا کہ جب اسامہ نے مجھے طلاق دے کر جہاز کا ٹکٹ میرے ہاتھ پر رکھا، میں نے آپ کو بتا کر آنا کیوں ضروری سمجھا۔ اپنی ویب سائٹ کو سوچتے پریشان ضرور تھی کہ مجھ سے رائے مانگنے والے میرے غائب ہوجانے پر کیا سوچیں گے اور یہاں آنے کے بعد مسلسل ایک اچھے موبائل اور لیپ ٹاپ کے حصول میں کوشاں بھی ہوں۔ لیکن حقیقت کا علم صرف آپ کو تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ میرے مسلسل آف لائن رہنے پر صرف آپ ہی پریشان ہوں گے۔"
"بندہ ویسے تھوڑا سا سیانا ہو تو کوئی رابطہ نمبر بھی چھوڑ دیتا ہے۔" انہوں نے لطیف سا طنز کیا۔
"کبھی کبھی اگلے کا کنسرن جاننے کے لیے جان بوجھ کر ایسا کیا جاتا ہے، کیونکہ بندی صرف سیانی نہیں ایکسٹرا سیانی ہے۔"
"تو پھر کیا جانا بندی نے۔"
"کسی نیک ساعت میں مانگی دعا کا ثمر ہے یہ روشن دن اور اس کے تعاقب میں آتے کئی اور خوب صورت دن۔" وہ آہستہ سے نظر اٹھا کر کاظم کو دیکھتے اب پوری طمانیت سے مسکرائی تھی۔
"جو لوگ نفع نقصان کے حساب میں نہ پڑتے صرف حق، سچ اور نیکی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں، وہ پروردگار بنا مانگے انہیں بہت نوازتا ہے۔ خوش رہو ثمن! تم نے مجھے زندگی بخشی ہے۔ میں اپنی زندگی کے ہر آنے والے پل میں تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔"
"ہم ساتھ رہیں گے کاظم! میں اس مہربان دوست کو کھونے کا اب تصور بھی نہیں کرسکتی۔" اس نے وہیں بیٹھے ہاتھ بڑھا کر کاظم کا اعتماد چاہا جس نے اپنا مضبوط ہاتھ مسکراتے ہوئے ثمن کے ہاتھ پہ رکھ کر نرمی اور خلوص سے دبایا۔
"ان شاء اللہ یہ ساتھ ہمیشہ رہے گا۔"

☆☆



## سالگرہ نمبر

ثمینہ یاسمین

# میاں میاؤں میاں چنوں




"میاؤں چنوں نہیں۔ میاں چنوں۔" میں پچھلے دس منٹ سے اپنی چینی بیوی کو میاں چنوں کہنا سکھا رہا تھا۔ لیکن ہر بار وہ میاؤں چنوں کہہ کر میرے صبر کا امتحان لے رہی تھی۔ تنگ آکر میں نے ہار مان لی۔ ٹھیک ہے میاؤں چنوں۔ اوہو میاں چنوں سکھانے کا مقصد تھا کہ میں میاں چنوں کا رہنے والا ہوں...... اور دو دن بعد ہم کو پاکستان جانا تھا۔
چین آیا تو میں اسپورٹس مقابلے میں شرکت کے لیے تھا۔ لیکن اب دو مہینے چین میں رہنے کے بعد ایک عدد چینی بیوی کا تحفہ گھر والوں کے لیے لے کر جا رہا تھا۔
آج ہی گھر پر میں نے شادی کی اطلاع دی تھی۔ جواب میں ماں جی کی ایسی ایسی باتیں سنیں کہ دوبارہ چین کا منہ نہ دیکھنے کی قسم کھالی۔ لیکن چینی بیوی کو تو لے کر پاکستان جانا تھا۔
مجھے بچپن ہی سے شوق تھا کہ میری فارنر بیوی ہو۔ بچپن میں ہمارے محلے میں شیخوں کے بیٹے انگلینڈ گئے تھے اور ان میں سے ایک میم لے کر واپس آیا تھا۔ ہر طرف میم کا شور مچ گیا تھا۔ ہم سب بچے بھی میم کو دیکھنے گئے تھے۔ میں کتنی دیر حیرت سے اس گوری چٹی موم کی گڑیا کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ میں بھی فارنر لڑکی سے شادی کروں گا۔ یہ اور بات کہ مجھے انگریز نہیں ملی۔ میں نے چینی ہی سے کام چلالیا۔

میں واپڈا میں انجینئر ہوں۔ اسپورٹس میں شروع ہی سے بہت زیادہ حصہ لیا کرتا تھا۔ ویٹ لفٹنگ میں ہی مجھے قومی ٹیم میں چنا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں چین بھیجا گیا تھا۔ گیا تو میں گیمز میں شرکت کے لیے ہی تھا لیکن وہاں میری ملاقات میلی سے ہوگئی۔ جو آہستہ آہستہ محبت میں بدل گئی۔ جس کا انجام ہم دونوں کی شادی پر ہوا۔ میں بہت خوش تھا۔ اور اسی خوشی میں، میں نے سوچا ہی نہیں کہ گھر والوں کا کیا ردعمل ہوگا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ فارنر بہو پا کر گھر والے خوشی سے نہال ہوجائیں گے۔ لیکن یہ کیا اماں نے تو

وہ دہائیاں فون پر دیں کہ میں اب تک حیران و پریشان تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید انہوں نے میلی کو دیکھا نہیں ہے اس لیے ایسا ردعمل دے رہے ہیں۔ جب اس سے ملیں گے۔ دیکھیں گے تو خود ہی راضی ہو جائیں گے۔

جیسے ہی میں نے گھر کا دروازہ پار کیا۔ اماں صحن میں ہی مل گئیں پھر اماں کا واویلا اور سارا محلہ صحن میں جمع۔ ابا اماں کو چپ کروا کروا کر تھک گیا تھا۔ لیکن اماں کو کون چپ کروائے۔ دونوں ہاتھ مل مل کر بین ڈال رہی تھی۔

"ہائے میرے ربا! یہ میرا بیٹا کس سے ویاہ کر آیا یہ پھینی۔ چوہے مینڈک کھانے والی ہائے ہائے میرے ربا۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ ایک ہی میرا بیٹا وہ بھی چینیوں نے پھنسالیا۔" میں رب نواز اور میری بیوی میلی حیران و پریشان پچھلے آدھے گھنٹے سے صحن میں کھڑے تھے۔

سارے محلے والے صحن میں آ کر سب سے پہلے میلی کو دیکھتے۔ پھر اماں کو تسلی دلاسا دیتے۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی فوت ہو گیا ہے۔ آخر گھنٹے پونے گھنٹے کے بعد اماں کا واویلا تھما لیکن بغیر آنسوؤں کے رونا ابھی بھی جاری تھا۔

ابا شرمندہ سا اٹھا اور سب محلے والوں سے معذرت کر کے ان کو رخصت کیا۔ پھر میلی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کو اندر میرے کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں اماں کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے میلی کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود اماں کے پاس چارپائی پر ہی بیٹھ گیا۔

"اماں معاف کر دے مجھے نہیں پتا تھا کہ تجھے اتنا دکھ ہو گا۔ میں تو سمجھا تھا کہ تو ولایتی بہو پا کر بہت خوش ہو گی۔ وہ شیخوں کی بہو جب بھی انگلینڈ سے آتی تھی تو اتنے شوق سے اسے دیکھنے جاتی تھی اور اتنی اس کی تعریفیں کرتی تھی، اب کیا ہوا۔"

"ہائے، ہائے کہاں وہ سوہنی میم؟ اور کہاں یہ چینی پھینی۔ چوہے مینڈک کھانے والی۔ مجھے تو اس کو دیکھ کر کراہیت ہو رہی ہے۔ سنا تو ایک بار ... کھیل کھیلنے گیا تھا۔ یا بیوی لینے اگر مجھے ... تو چین سے اس پھینی کو لے آنے کا ... جانے نہ دیتی۔"

بڑی مشکل سے اماں کو تھوڑا ... کمرے میں آیا۔ دیکھا تو میلی حیران پریشان ... تک کمرے میں کھڑی تھی، بڑی مشکل سے ... یہاں کے ماحول کے بارے میں سمجھایا کر ... طرح ذہنی طور پر تیار ہو جائے۔ آنے والے ... وقت کے لیے۔

"ربا نواز اب کیا ہو گا؟" ایک تو ... ہر لفظ کو بگاڑ کر بیڑا غرق کر دیتی تھی۔ اب اچھا بھلا ... نام رب نواز میرے ماں باپ نے رکھا تھا۔ ... درست تلفظ کروانے کے باوجود میلی اس کو ربا نواز ... کہتی تھی۔

"سب ٹھیک ... جائے گا، آہستہ آہستہ۔" ... سے زیادہ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

"بس تم میرے ماں باپ کا دل جیتنے کی کوشش کرتی رہو۔" میلی پریشان سی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

اگلے دن صبح سویرے ہی تائی، خالہ، پھپھو، چچی اور ان کے بچوں کے شور سے طلوع ہوئی۔ اماں کا واویلا اندر کمرے تک آ رہا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ میلی اردو نہ جانتی تھی۔ ورنہ اس کا تصور کر کے ہی میں کانپ گیا تھا۔ اماں میلی کو ایسے ایسے القاب دے رہی تھی کہ الامان الحفیظ۔ کافی دیر کے بعد ہمارے دروازے پر دستک ہوئی میری چھوٹی خالہ دروازے پر کھڑی اور تجسس سے اندر جھانکتے ہوئے میلی کو باہر بلا رہی تھی۔

"تھوڑی دیر میں آتی ہے۔" میں نے ان کو ٹالا۔ لیکن وہ خالہ ہی کیا جو مان جائے میلی کو باہر لے جا کر ہی دم لیا۔ میلی رات کے سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ میرے لاکھ چاہنے کے باوجود خالہ نے اس کو کپڑے بھی نہ بدلنے دیے۔ اب باہر ایک اور ہنگامہ جاگ گیا۔

"ہائے ہائے اس کے کپڑے دیکھو۔" اماں میلی کو دیکھتی تھیں اور ہاتھ مل مل کر شور مچا رہی تھیں۔ ابا نے



جلدی سے گھر کا دروازہ بند کیا اور میلی کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اب اماں کے ساتھ تائی۔ خالہ اور چچی پھپھو کے رونے کی آوازیں بھی شامل ہو چکی تھیں۔ خالہ کو فکر تھی کہ اس کے سسرال والے کیا کہیں گے کہ بھانجا خالہ کو بتائے بغیر چینی پھینی لے آیا ہے۔ کافی دیر بعد یہ ڈراما تھما۔ پھر جا کر اماں کو سب رشتے داروں کی تواضع کا خیال آیا۔ تو چائے ناشتے کی تیاری شروع ہوئی۔

یہ دیکھ کر میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا کہ آخر اماں کو چائے ناشتے کا خیال آیا۔ رات سے میں اور میلی ایسے ہی بھوکے تھے اور اب مجھے شدید بھوک لگی تھی۔ تو ظاہر ہے۔ میلی کو بھی بھوک لگی ہو گی۔ میں میلی کے سامنے اپنے گھر والوں کے ردعمل پر شدید شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ وہ بھی کیا سوچتی ہو گی۔ ایسے استقبال پر۔

کچھ دیر بعد اماں نے مجھے آواز دی رب نواز یہ ناشتا لے جا۔ میں ناشتا اٹھانے آیا۔ تو اماں نے سختی سے تاکید کی کہ پھینی میرے کسی برتن کو ہاتھ نہ لگائے۔ میں نے اس کے برتن الگ کر دیے ہیں۔ صرف ان میں کھانا کھائے۔

میں نے اس ناانصافی پر شدید احتجاج کیا لیکن اماں کی ایک ہی رٹ "یہ چوہے مینڈک کھانے والی میرے برتنوں کو ہاتھ نہ لگائے۔" آخر مجبوراً میں نے اماں کی یہ شرط مان لی اور میلی کو بھی سمجھا دیا۔ میلی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن میں مجبور تھا۔ شام تک گھر میں رشتے داروں اور پڑوسیوں کا شور شرابا رہا۔ میلی اس سارے ماحول سے سخت پریشان تھی اور میں اماں کے آگے بے بس۔

☆☆☆

کچھ دن تو ایسے ہی ہنگامہ خیز گزرے پھر زندگی کی روٹین شروع ہو گئی۔ میں واپڈا میں ملازم تھا، روز صبح آفس جانا اور شام کو واپس آنا۔ اماں کا منہ اسی طرح سوجا ہوا تھا۔ اور میلی اپنے کمرے تک محدود تھی۔ ایک دن میں گھر آیا۔ تو دیکھا اماں غیر متوقع طور پر ہنسے جا رہی ہے۔ اور پاس ہی میلی بیٹھی ہے۔

"کیا ہوا اماں ایسے کیوں ہنس رہی ہو؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اپنی اس پھیلی سے پوچھ۔ آج تایا غلام رسول اور اس کی بیوی اس میلی سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ تیری تائی نے اس کا نام پوچھا بولی میرا نام میلی ہے۔ اماں پھینی کہتی ہے۔ میرا اور تیری تائی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔"

"اماں اچھا چھوڑو اس بات کو تو ایسے کر میلی کو کل بازار لے جانا اور تین چار شلوار قمیض لے دے اس کو۔" اماں پہلے ہی شاپنگ کی شوقین فوراً مجھ سے پیسے پکڑے اور کل شاپنگ پر جانے کو مان گئی۔

اگلے دن اماں میلی کو لے کر بازار چلی گئی۔ کپڑے کی دکان پر اماں نے دو سوٹ پسند کیے۔ اور سیلز مین سے کہنے لگی۔

"یہ دو سوٹ میری چینی پھینی کے لیے کاٹ دے۔"

"اچھا خالہ جی آپ کی بہو چینی ہے۔"

"کس نے یہ شہرت کر دی۔" اماں نے حیران ہو کر کہا۔

"اماں جی آپ نے ہی۔ سنا ہے بڑا ہنگامہ مچایا ہے۔"

"ہیں۔ تو نہ ہنگامہ کروں۔ تو اگر چوہے مینڈک کھانے والی پھینی سے شادی کرے گا۔ تو تیری ماں نہ ہنگامہ کرے گی۔" اماں کا شور سن کر بہت سے دکان دار اور لوگ اماں اور میلی کے گرد جمع ہو گئے۔

سیلز مین اور دوسرے لوگ ہنس ہنس کر اماں سے پوچھنے لگے۔

"خالہ جی یہ چینی چوہے مینڈک کھاتی ہے۔"

اب اماں کو احساس ہوا کہ کافی لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ اماں نے جلدی سے میلی کا ہاتھ پکڑا اور واپس گھر آ گئیں۔ اب میرے آفس سے آنے کے بعد سے اماں کا ہنگامہ پھر جاری تھا۔

"ہائے، ہائے اس پھینی کی وجہ سے میری بے

سالگرہ نمبر

میمونہ صدف

# یارِ بے وفا

مکمل ناول



عزتی ہوگئی۔'' اماں یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھی کہ یہ ہنگامہ اماں کی وجہ سے ہوا۔

☆☆☆

ایک دن تایا غلام رسول اپنے بیٹے ولید کی شادی کا دعوت نامہ دے گئے اور مجھے اور میلی کو خاص طور پر شادی میں شرکت کی دعوت دی۔ شادی کے سارے فنکشن میں پاکستانی لباس میں میلی سب کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ ہر کوئی میلی کی وجہ سے اماں کو بہت اہمیت دے رہا تھا۔ اماں خوش ہوگئی۔ گھر آ کر ہنس ہنس کر مجھے اور ابا کو بتایا کہ کیسے سب لوگ اماں اور میلی کے گرد پھر رہے تھے۔

اگلے دن اماں کو صبح ہی کسی کام سے خالہ سے ملنے جانا پڑ گیا۔ میلی اکیلی تھی۔ اس نے گھر گندا دیکھا تو سارے گھر کی صفائی کر کے فرش دھو دیا۔ اماں باہر سے آئی ابھی اس نے گھر میں پیر ہی رکھا تھا کہ پیر پھسل گیا۔ پھر کیا ہونا تھا۔ اماں کی میلی کو گالیاں، رونا دھونا اور شور ..... سن کر پڑوس کی خالہ حمیدہ آ گئی۔ ہمارے گیراج میں پرانی گاڑی کھڑی تھی جو کبھی کبھی استعمال کی جاتی تھی۔ میلی نے جلدی سے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور اماں کو بڑی مشکل سے گاڑی میں ڈالا ..... اور خالہ اور میلی اماں کو ہسپتال لے گئیں۔ اماں کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور پلستر لگ گیا۔

میلی نے مجھے اور ابا کو بھی اطلاع دی۔ گھر آ کر میلی نے اماں کے لیے سوپ۔ میرے اور ابا کے لیے کھانا بنایا۔ میں نے بھی میلی کی مدد کی۔ ابا اور میں نے تو کھانا کھا لیا۔ لیکن اماں سخت ناراض تھی اور کچھ بھی کھانے پر راضی نہ تھی۔ میں نے اور میلی نے بہت معافی مانگی پر اماں کی نہ ہاں میں نہ بدلی۔ آخر ابا نے ڈانٹ کر اماں کو کھانے پینے پر راضی کیا۔ لیکن اپنی ضد میں پکی تھی۔ کھانے پر مانی لیکن شرط یہ رکھی۔

''میلی کے ہاتھ کا پکا کچھ نہیں کھاؤں گی۔'' اب میں آفس جانے سے پہلے اماں کے لیے ناشتا اور دوپہر کا کھانا پکا کر جاتا اور آ کر رات کا پکاتا۔

اماں تو چارپائی پر پڑ گئی۔ اور سارے گھر کی ذمہ داری میلی پر آ گئی۔ میلی نے اتنے اچھے طریقے سے اپنی ذمہ داری پوری کی کہ ابا تو ہر وقت میلی کے گن گانے لگا۔ اماں کا بھی اپنا خیال رکھا۔ کہ کیا کرنی بیٹی رکھتی۔ پر اماں کی اکڑ نہ ٹوٹی۔

ایک دن میلی نے ابا سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ میں اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں آپ میری مدد کریں۔'' ابا خوش ہوگیا..... اور ابا نے میلی کو کچھ اسلامی کتابیں جو انگلش میں تھیں لا کر دیں۔ ابا نے بھی اسلام کے بارے میں میلی کو بتانا شروع کیا اب میلی میں آہستہ آہستہ کافی تبدیلی آ گئی۔ وہ ہر وقت سر پر دوپٹا رکھنے لگی۔ کچھ عرصے بعد اس نے مجھ سے اسلام قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں اور ابا اس بات سے بہت خوش ہوئے۔

میلی کا اسلامی نام فاطمہ رکھا گیا اور میلی کو مسجد کے مولانا صاحب نے کلمہ پڑھوایا۔ اب فاطمہ پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگی۔ اور قرآن پاک ابا سے سیکھنے لگی۔ اماں لیٹے لیٹے یہ سب دیکھتی لیکن میلی کو نہ بلاتی۔ آخر دو مہینے کے بعد اماں کا پلستر کھلا۔ اماں لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ فاطمہ نے اماں کی مالش اور دوائی وغیرہ کا بہت خیال رکھا۔ لگتا ہی نہ تھا کہ فاطمہ دوسرے ملک سے ہے۔ اس نے اپنے آپ کو پوری طرح ہمارے رنگ میں ڈھال لیا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے اماں کی ٹانگ ٹھیک ہوگئی۔ میں نے اور فاطمہ نے اس خوشی میں سب رشتے داروں کی دعوت کی۔ اماں نئے کپڑے پہن کر بیٹھی تھی اور سب رشتے دار جمع تھے۔

''آخر میلی بھی ہمارے رنگ میں ڈھل گئی ہے۔'' خالہ نے ہنستے ہوئے اماں سے کہا۔

''اب یہ میلی نہیں رہی۔ یہ میری بیٹی فاطمہ ہے۔ پاک اور نیک۔'' اماں نے اسے گلے لگایا۔ آخر اماں نے میری بیوی کو اپنی بہو کیا بیٹی بھی تسلیم کر لیا۔ میں نے اور ابا نے سکون کا سانس لیا اور فاطمہ کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆

"وہ تم سے ملنے آیا ہے۔" ان کی آواز میں لرزش تھی اور اس کے ہاتھوں میں۔

"آپ کو اس کے ساتھ یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آ ہی گئی تھیں تو اسے اندر نہیں بلانا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں آئے، مجھے دیکھے یا مجھ سے ملے۔" وہ اپنا کوئی کمزور پہلو اب اس کے سامنے نہیں لانا چاہتی تھی۔ یہ اس کی کمزوری ہی تو تھی جس نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ محبت۔

"ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔" وہ اسی ایک پل سے ہی تو ڈرتی تھی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی میں پوری طرح سے خود کو اس کے مقابل کے لیے آمادہ کرلوں۔" اور ایسا کب تک ہو پائے گا وہ نہیں جانتی تھی۔

"ایک بار مل لو۔ بات سن لو۔ پھر نہیں آئے گا۔ میں اسے اپنے واسطے دوں گی تو دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کرے گا۔" وہ واسطے بھی دینے کی بات کر رہی تھیں تو کس کا۔؟ اسے ہنسی سے زیادہ رونا آیا تو کرب سے آنکھیں موند لیں۔ نہ وہ انھیں دیکھنا چاہتی تھی نہ ان کے بندھے ہاتھ۔

"وہ نہیں آئے گا تو میں کس امید پہ زندہ رہوں گی؟ یہاں کا رخ نہیں کرے گا تو میں کہاں کا رخ کروں گی؟" اس نے سوچا تھا، کہا نہیں تھا۔ وہ ایسی باتیں ان سے کیسے کہہ سکتی تھی۔ وہ ایسی باتیں کسی سے نہیں کہا کرتی تھی۔

"کیا اب میری اتنی حیثیت بھی نہیں رہی کہ تم میرے بندھے ہاتھوں کے لیے ہی سہی، اس سے ایک بار مل لو۔" وہ اپنے بندھے ہاتھوں کو دیکھتی، اس کے ہاتھ باندھ رہی تھیں۔ اسے بے بس کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں آئی نمی اس نے چھپالی اور ان کی طرف مڑ کر دیکھا اور دیکھے ہی گئی۔ ان دونوں کی بے بسی انتہا پہ تھی۔ ان دونوں کو ایک ہی مرد نے بے بس کیا تھا۔ اسے خود پہ ہنسی، ان پہ رونا آیا۔ وہ کیا کیا کرے گی ان کے لیے اور کیا نہیں کر پائے گی اپنے لیے۔ کیا اب بھی زندگی ایسی ہی رہنا تھی۔ اب بھی،

آگے بھی؟

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ وہ ہمیشہ رویا ہی کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ رویا ہی کرتی تھیں۔ یہ ان کا مشغلہ تھا۔

"بلائیں اسے، بٹھائیں۔ میں آتی ہوں۔" پلٹ گئی تھیں اور وہ خود کو مضبوط کرنے کی ناکام ہوئے چلی جارہی تھی۔ وہ کچھ بھی کیسے پوچھے گی، جواب دے گی؟ آنسو ابھی سے آنکھوں میں بھر رہے تھے۔ وجود ابھی سے کپکپا رہا تھا۔ جن لوگوں سے آپ نفرت کی باتیں کرتے ہیں، شدید نفرت کی، یہ وہی ہوتے ہیں جن سے کبھی محبت کی باتیں کی گئی ہوتی ہیں، شدید محبت کی۔ وہ اس سے نفرت کرنے میں ہار گئی تھی۔ پوری طرح، مکمل۔ اس بات کا ادراک اسے ابھی ابھی ہوا تھا، اتنے ماہ بعد اس کے دوبارہ چلے آنے پہ۔

باہر لاؤنج سے آوازیں آرہی تھیں۔ اس کی آواز..... جو وہ پورے دو ماہ، نو دن بعد براہ راست سن رہی تھی اور اتنے ہی عرصے بعد وہ اسے دیکھے گی۔ اس نے اپنی مضبوطی کے لیے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

وہ دوپٹا سر کے گرد لپیٹ کر باہر نکلی تھی۔ ویسے ہی جیسے پہلی بار ملی تھی، اب عرصے بعد مل رہی تھی۔ ویسے ہی جیسے اس کو آخری بار دیکھ کر نکلی تھی اور پھر دیکھ رہی تھی۔ کیا آخری بار؟ اس کی سانسیں اس بات کو سوچنے سے ہی رکنے لگی تھیں۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کچھ قسمیں اور دعوے بس ایک پل کی مار ہوا کرتے ہیں۔ اسے اپنے مقابل دیکھتے ہی احساس ہوا تھا۔ وہ جو اس کا سامنا کرتے ہوئے نفرت سے منہ موڑ لینے کا سوچتی تھی، اس کا گریبان پکڑ کر اسے ذلیل کرنے کا ارادہ رکھتی تھی اسے عزت سے بٹھا رہی تھی۔ اور اس کے بیٹھنے سے بھی پہلے وہ خود بیٹھ گئی، کھڑی رہتی تو گر جاتی، گر جاتی توڑ دھے جاتی اور ابھی ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔



"میں..... مجھے پہلے آنا چاہیے تھا لیکن۔" وہ اس کے عین سامنے بیٹھا تھا۔

"تمہیں اسی روز آجانا چاہیے تھا۔" وہ سر جھکائے سوچ گئی۔

"مجھ میں ہمت نہیں تھی۔" وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور بغور دیکھ رہا تھا۔

"جو سب کیا، اس کی ہمت تھی؟" وہ اسے نہیں دیکھ سکتی تھی، ایک پل کو بھی نہیں۔

"میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تم نے سنا نہیں۔"

"کیونکہ تم وہ نہیں کہہ پا رہے تھے جو میں سننا چاہتی تھی۔" وہ اس کی خاموشی کے ٹوٹنے کا منتظر رہا لیکن نہ اسے بولنا تھا، نہ وہ بولی۔ بولنے وہ آیا تھا تو وہ اسے بھرپور موقع دے رہی تھی، خود خاموش رہ کر۔

"کچھ تو بولو۔ برا بھلا ہی کہہ لو۔ میں نے اتنا کچھ کیا اور تم چپ چاپ بنا مجھے بتائے میرے گھر سے چلی آئیں، مجھے وضاحت کا موقع دیے بنا وہاں سے نکل آئیں۔ کوئی اپنا گھر اس طرح چھوڑا کرتا ہے جس طرح تم نے چھوڑا۔" وہ اٹھ کر اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ یہ کرب تھا، درد تھا، اذیت تھی یا نفرت؟

وہ اس سے کیا کہہ رہا تھا۔ اپنے گھر کی بات کر رہا تھا، وہ گھر جس کا گھر والا اس کا نہیں رہا تھا، وہ گھر بھلا اس کا کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ جس دل کی مکین تھی، اس دل سے نکال دی گئی تھی تو گھر میں رہ کر کیا کرتی بھلا؟

"میں پچھتا رہا ہوں اپنی غلطی پہ۔ دیکھو میری طرف۔ کیا تمہیں یہ سزا نہیں لگتی؟" وہ چلانا چاہتا تھا لیکن چلا نہیں رہا تھا۔

"تمہیں پچھتانا بھی چاہیے۔ اس سے کم کیا سزا ہو سکتی تھی تمہارے لیے کہ تم اتنا کچھ کر کے پچھتاتے بھی نہ؟" اس نے آنکھوں کو بے تاثر کر لیا جیسے اس نے اس رشتے کو بے اثر کر دیا تھا اور اس کی جانب دیکھے بنا ہی پوچھا، جتایا، یاد دلایا، اپنی دس منٹ کی خاموشی کو توڑ ڈالا۔

"تم مجھے مداوے کا موقع دو۔ میرے ساتھ چلو۔ اب کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ زندگی میں تو کیا موت بھی نہیں۔ اتنا تو یقین کرو۔ کیا دو سال کے ساتھ میں، میں اتنے اعتبار کا حق بھی نہیں رکھتا؟" وہ اسے دیکھے گئی، پلکیں جھپکے سانس لیے بنا، کچھ کہے بنا۔ لمحوں نے جیسے سالوں اور سالوں نے صدیوں کی جگہ لے ڈالی ہو۔ وہ اس سے زندگی کی بات کر رہا تھا جو اس نے خود اس سے چھین لی تھی۔ وہ اس سے موت کی بات کر رہا تھا جو اس نے خود اسے سونپی تھی۔ وہ یقین اعتبار کی بات کیسے کر سکتا تھا جسے اس نے اپنے ہاتھوں گنوایا تھا۔

وہ اس کے ساتھ جانے کے بجائے یک دم اٹھی، ایک دو قدم پیچھے ہٹی اور پھر تیزی سے بھاگتی اندر چلی گئی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، خود سے دور۔

"ابھی اسے وقت چاہیے۔" بانو بیگم نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ دھرا جو خود دو ماہ نو دن کا وقت لے کر اسے نو منٹ دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے سامنے بند دروازے کو دیکھتے سوچ رہا تھا کہ اس کے لیے یہ دروازہ کب کھلے گا۔ اب کبھی کھلے گا بھی کہ نہیں۔

☆☆☆

رات کے کسی پہر اس کی آنکھ گرمی کی شدت سے کھلی تھی۔ بجلی خاصی دیر سے گئی ہوئی تھی شاید تبھی یو پی ایس کی چارجنگ ختم ہونے کی وجہ سے پنکھا بند ہو چکا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور اسی سبب سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ پانی کے لیے اس نے ساتھ پڑی تپائی کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس کے ہاتھ سے کچھ ٹکرا کر نیچے گرا تھا۔ ایک آواز گونجی اور پھر سے سناٹا۔ اس نے اپنے تکیے کے قریب پڑے موبائل کو اٹھا کر اس کی روشنی تپائی پہ ماری تو وہ خالی تھی۔ تبھی اسے یاد آگیا کہ سونے سے پہلے وہ پانی کا تھرماس اور گلاس رکھنا بھول گیا تھا۔ اب اسے پھر سے اٹھنا پڑے گا یا

خشک حلق پہ صبر کرنا پڑے گا۔ اسے خود پہ غصہ آیا۔ وہ کیسے بھول گیا تھا رات سونے سے پہلے تپائی پہ پانی رکھنا جب کہ رات کئی بار اس کی آنکھ کھلتی تھی اور وہ پانی پینے کا عادی تھا۔ ابھی وہ اٹھنے کا قصد ہی کر رہا تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ٹارچ کی روشنی اس کی آنکھوں کو چندھیا گئی۔ روشنی سے بچنے کے لیے اس نے آنکھوں کے آگے ہاتھ رکھ لیا تھا۔ آنے والی کون تھی وہ جانتا تھا۔

"کچھ چاہیے تھا؟" انھوں نے نیچے گرے لکڑی کے گلدان کو اٹھا کر واپس اپنی جگہ پہ رکھا۔

"میں لے لیتا۔ آپ کیوں آئی ہیں؟" اس نے اٹھنے کی پھر سے کوشش کی۔

"آواز سن کر جاگ گئی۔ جانتی تھی تمہیں کچھ چاہیے ہوگا۔" وہ واپس لوٹ گئی تھیں۔

"آپ اتنا جانتی ہوتیں تو میں یہاں یوں پڑا ہوتا۔" ایک تلخ بڑبڑاہٹ اس کے لبوں سے نکلی تھی جسے وہ باہر چلے جانے کی وجہ سے سن نہیں پائی تھیں۔

کچھ دیر بعد ان کی واپسی ہوئی تو ٹھنڈے پانی کا تھرماس ان کے ہاتھ میں تھا مع گلاس کے۔ اسے تپائی پہ رکھتے انھوں نے اس کی جانب دیکھا۔

"کچھ اور چاہیے؟"

"سکون چاہیے جو آپ کے جانے سے ملے گا۔" اس کی بڑبڑاہٹ وہ نہیں سن سکی تھیں۔ وہ اسی طرح بڑبڑانے کا عادی تھا اور ہمیشہ سے تھا۔

"کچھ نہیں۔ آپ سو جائیں۔" وہ نظریں جھکائے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ ان کی نیند خراب کر دینے پہ شرمندہ نہیں تھا۔ وہ کب ایسے نظریں جھکاتا تھا وہ جانتی تھیں۔ ایک بوجھ تھا جو بڑھ گیا تھا، جسے وہ پچھلے تینتیس سال سے اٹھائے پھر رہی تھیں لیکن اب کبھی اتار نہیں سکتی تھیں۔ کم از کم انھیں ایسا ہی لگتا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک ایسے پلیٹ فارم پہ ہاتھ میں سفری بیگ اور دلہناپے کا روپ دھارے بیٹھی تھی جہاں اس کے سوا کوئی مسافر نہیں تھا۔ ایک پھولے ... کے نیم شکستہ لکڑی کے بنچ پہ بیٹھی وہ ... احساس لیے بیٹھی تھی۔ دوسرا احساس جو ... موجود تھا وہ اکیلے پن کا تھا۔ پاس کا ... جیسے خالی تھا اور وہاں کی واحد مسافر وہی تھی۔

تبھی ایک کونے سے ٹک ٹک کی آواز ... گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ آنے والا دکھائی نہیں ... لیکن وہ اس آواز کو پہچانتی تھی جو کسی کے چھڑی کے سہارے چلنے کی تھی۔ وہ ایک طویل عرصے سے اس آواز کو سنتی آرہی ہے۔ اس سے زیادہ اس نے شاید ہی کسی آواز کو ایسے انہماک سے سنا ہو، شاید کبھی ... دیکھے ایسے کسی آواز کو پہچانا ہو۔

"ٹک ٹک ٹک۔" چلنے والا اب تک سامنے نہیں آیا اور وہ گردن موڑے اب تک اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے جانتی تھی اس کے اندر سے آواز آئی تھی۔ کیسے؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ اتنے میں دور سے ٹرین کے آنے کی آواز سنائی دی لیکن اب وہ ٹرین کی جانب متوجہ ہونے کے بجائے آنے والے کی منتظر تھی۔ اسے ٹرین سے نہیں جانا یہ وہ طے کر چکی تھی۔ اسے آنے والے کے ساتھ جانا تھا یہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ ٹرین کی سیٹی کی آواز اب قریب آرہی تھی لیکن آنے والا ابھی تک منظر عام پہ نہیں آیا تھا۔ ٹرین اسٹیشن پہ پہنچ چکی تھی۔ وہ چند ثانیے ہی رکے گی وہ جانتی تھی کہ یہ ایک چھوٹا اسٹیشن تھا۔ اس ٹرین کے بعد وہاں اگلے دو روز کوئی ٹرین نہیں آنا تھی وہ بخوبی واقف تھی پھر بھی وہ اس میں سوار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

تبھی ٹرین نے چلنے کے لیے سیٹی بجائی اور عمارت کے بوسیدہ سے ستون کے پیچھے سے وہ برآمد ہوا۔ لاٹھی کے سہارے چلنے والا ایک خوبرو نوجوان جس کی شخصیت کامل تھی سوائے اس کی ایک ٹانگ کے لنگ کے۔ وہ اسی کی تو منتظر تھی۔ جس کے ساتھ وہ اب جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی یہ وہی تھا، جو اب اسے دیکھ رہا تھا۔



ایک جھٹکے سے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا اور خود کو اپنے نرم گرم بستر پہ پایا۔ ایک ٹھنڈی سانس اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

"پھر سے ویسا ہی خواب۔" اس نے بالوں کو پیچھے کی طرف سمیٹ کر جوڑے کی صورت باندھ لیا تھا۔ بہت مدت بعد اس نے یہ خواب پھر سے دیکھا تھا۔ خواب نہیں، خواب والے کو۔ خواب تو ہر بار منفرد ہوتا لیکن چھڑی کے سہارے چلنے والا وہی ہوتا، جس کا چہرہ وہ کبھی نہیں دیکھ پائی تھی بس اتنا جانتی تھی کہ وہ ہمیشہ دلہن کے روپ میں اس کی منتظر ہوتی ہے۔

دائرہ آپی اس کے خوابوں کو سنتے ہمیشہ کہا کرتیں۔

"یہ قدرت کا اشارہ اور تمہاری ذہن سازی ہے کہ تمہارا لائف پارٹنر ایک ایسا انسان بنے گا جو جسمانی طور پہ مکمل نہیں ہوگا۔" اور وہ زچ ہو جاتی۔

"پچھلے پانچ سالوں میں اتنی بار اسے دیکھا ہے کہ تیار ہو ہو کر میں تھکنے لگی ہوں اب۔ ذہن تیار سے زیادہ بے کار ہوتا جا رہا ہے۔"

قدسیہ اس کے لیے اب تک نجانے کتنے رشتے دیکھ چکی تھیں لیکن بات وہیں کی وہیں کھڑی تھی۔

"مجھے اس جیسے میٹریلسٹک بندے سے ہرگز شادی نہیں کرنا جس کی ہر بات پیسے سے شروع اور پیسے پہ ختم ہوتی ہے۔"

"اسے میری سوچ جذباتیت پہ مبنی لگی سو میں نے بھی اسے رد کر دیا۔ اچھا کیا نا؟"

"عجیب انسان تھا جو خود کچھ کرنے کے بجائے بیوی کی کمائی کھانے کے چکر میں تھا۔ ایسا شان دار رشتہ آپ کو کہاں ملا ماما؟"

یہ اور اس قسم کے اعتراض اس کی طرف سے تھے اور بہت سے اعتراض لڑکے والوں کی طرف سے بھی ہوا کرتے تھے اسے لے کر۔

"آپ کی بیٹی کو اپنی کمائی، ذہانت کا بہت غرور ہے جو ہمارے بیٹے کو کسی جگہ ٹک کر نوکری کرنے کے مشورے دے رہی ہے۔ اگر وہ پچھلے چار سال میں دس نوکریاں بدل چکا ہے تو اسے کیا اعتراض؟"

"ہمیں ایسی لڑکی نہیں چاہیے جو صدقے کے نام پہ اپنی ساری کمائی کسی این جی او کے نام کر دے۔" وہ ایسے تبصرے سن کر بڑے آرام سے شانے اچکا دیتی۔

"تو میں کون سا مرے جا رہی ہوں ان کے بیٹے کے لیے۔ وہ دنیا کا آخری مرد تھوڑا ہے؟"

قدسیہ اس سارے سلسلے اور اس کی ان باتوں سے تنگ آ چکی تھیں لیکن خولہ بڑے پیار سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر انھیں تسلی دیتی۔

"نہ پریشان ہوں ماما۔ وہ آئے گا۔" اور اس "وہ" کو وہ اچھے سے جانتی تھیں، غصے سے اسے دیکھتیں۔

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ ایک خواب کو تم نے ہوا ہی بنا ڈالا۔ اسے خواب ہی رہنے دو۔"

"کوئی خواب اتنا مستقل کیسے آ سکتا ہے، وہ بھی بنا کسی وجہ کے؟"

"کیسے ایسے شخص سے شادی کر سکتی ہو تم؟"

"ماما وہ میرا نصیب ہے۔"

"وہ نصیب نہیں تمہارا دماغی فتور ہے جو انسانیت کے جھنڈے لہرا لہرا کر تمہارے دماغ پہ سوار ہوا ہے۔"

وہ اپنی ماں کو نہیں سمجھا سکتی تھی کہ کوئی انسانیت کے جذبے میں ایسے بڑے قدم نہیں اٹھایا کرتا۔ وہ لوگوں کی ضروریات پوری کر سکتی ہے، ان کی تکلیفوں کو دور کر سکتی ہے، ان پہ پیسہ خرچ کر سکتی ہے لیکن محض ہمدردی کی خاطر کسی سے شادی نہیں کر سکتی۔

وہ دائرہ آپی سے، جو اس کی کزن تھیں، اکثر خوابوں کی تعبیر پوچھا کرتی اور جب سے اس کے کچھ خواب سچ ہوئے تھے اسے لگتا کہ یہ خواب تو ہے ہی سچا جو وہ پچھلے پانچ سالوں سے ایک ہی شخص خواب میں دیکھ رہی ہے۔

"لڑکیوں کے بڑے بڑے آئیڈیل ہوتے ہیں لیکن آج تک کسی کا آئیڈیل کوئی اپاہج شخص ہو، نہ دیکھا نہ سنا۔" قدسیہ نے پہلی بار سنتے ہی کہا تھا۔

''وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے ماما۔ وہ بس ایک اشارہ ہے۔''

''کس بات کا اشارہ؟'' اور یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کس بات کا اشارہ۔ بس قدسیہ نے اسے کہا اور اس نے بغیر کسی سوال جواب کے مان لیا۔

''دائرہ آپی کہتی ہیں۔''

''ایک تو دائرہ کو میں ٹھیک کرتی ہوں جو تمہاری ہوتی سوتی بن کر بیٹھی ہے۔ وہ کون ہوتی ہے تمہیں تعبیریں بتانے والی۔۔ تم چلو میں جامع مسجد کے مفتی صاحب سے تمہیں دم کرواتی ہوں اور خبردار جو آئندہ دائرہ کے آس پاس بھی تم مجھے نظر آئیں تو۔'' اس روز کے بعد سے اس نے ماما کے سامنے دائرہ آپی سے رابطے میں رہنے کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ ماما اس کی وجہ سے پریشان رہتی ہیں، خاص کر تب سے جب سے بابا کا انتقال ہوا تھا ۔ باپ سر پہ رہا نہیں تھا اور اکلوتے بھائی نے ضد کر کے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی۔ نہ صرف شادی کر لی تھی بلکہ پہلے دن سے ہی الگ ہو گیا تھا۔ بھابھی نے پھر حتی الامکان بھائی کو ان سے دور ہی رکھا۔ مہینوں گزر جاتے تھے وہ ملنے نہیں آتا تھا، ہفتوں فون نہیں کرتا تھا۔ اب تو وہ خود بھی بھول گئی تھی کہ اس کا کوئی بھائی بھی ہے۔ وہ ماسٹرز میں تھی تب سے قدسیہ اس کے رشتے دیکھ رہی تھیں لیکن جیسے ہی اس نے پچیس کا ہندسہ عبور کیا تھا وہ تب سے اس کے رشتوں کے لیے مزید سرگرم ہو گئیں اور وہ اپنے سے دو سال چھوٹی فروا کی۔ شادی کے لیے اس نے اپنی ماں کو کیسے منایا تھا وہی جانتی تھی، اب تو فروا کی شادی ہوئے بھی سال ہو چکا تھا۔ قدسیہ بڑی سے پہلے چھوٹی بیٹی کی شادی کے حق میں بالکل بھی نہ تھیں لیکن لڑکے والے جلدی کر رہے تھے سو انہیں ماننا ہی پڑا۔

''میری اتنی اچھی بیٹی کی قسمت میں نجانے کیا لکھا ہے روبینہ؟'' وہ رخصت فروا کو کر رہی تھیں اور رو خولہ کے لیے رہی تھیں۔

''جتنی وہ اچھی ہے اس کے ساتھ ... نہیں سکتا۔'' اسی بات کا تو انہیں غم ... اتنی اچھی ہے ہی کیوں۔ اپنی ساری ... بھائیوں، دوستوں اور غریبوں پہ لگا دیتی ... ہی مست ملنگ بنی پھرتی جیسے پلے ... سوفٹ ویئر ہاؤس کی نوکری کے ساتھ اس نے ... این جی او بھی جوائن کر رکھی تھی جہاں وہ ہر ماہ ... خطیر رقم جمع کر کے دیتی تھی۔ قدسیہ کو یقین تھا کہ ... نوکری بھی اسی لیے کرتی ہے کہ دوسروں کے گھر کے ... چولھے جلا سکے، ان کے بچوں کو پڑھا سکے، ان کے ... علاج کے خرچے نکال سکے اور اس کی اسی انسانی ... ہمدردی کے جذبے سے عاجز تھیں۔

''خولہ اتنی اچھی مت بنو کہ لوگ تمہیں نگل جائیں۔ آج کل اتنی اچھائی کا زمانہ نہیں ہے۔'' اور ہوا تو بہت بار تھا کہ لوگ اس کی اس خوبی کو اس کی کمزوری سمجھ کر فائدہ اٹھاتے تھے جس میں اس کے اپنے بہن بھائی تک شامل تھے لیکن وہ کبھی بھی ایسی کہ کبھی کسی کے لیے شکایت، شکوہ اس کی زبان پہ نہ آیا تھا۔ وہ کسی کو یہ نہیں جتاتی تھی کہ اچھا ہونے کا ہر گز مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اسے بے وقوف سمجھیں اور فائدہ اٹھائیں۔ اگر وہ ان سے جواباً دیسا سلوک نہیں کرتی جیسا وہ اس سے کرتے ہیں تو اس میں سراسر ہاتھ اس کی اچھائی اور شرافت کا ہے، حماقت کا نہیں۔

وہ دوسروں کے لیے اپنا من مار کر جینے والی لڑکی تھی اور ایسا وہ دانستہ نہیں کرتی تھی۔ ایسا بس اس سے ہو جاتا تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی اور ہر شخص کی طرح وہ بھی عین اپنی فطرت پہ تھی۔

☆☆☆

اپنے پروجیکٹ کی وجہ سے این جی او کی طرف وہ پچھلے دو ماہ سے دھیان نہیں دے پا رہی تھی۔ اس نے اپنی ایک یونیورسٹی فیلو کی مدد سے یہ این جی او جوائن کی تھی جو اس کی کوئی آنٹی چلا رہی تھیں۔ وہ ہر چند ماہ بعد مختلف اسٹوڈنٹس اور کولیگز کی مدد سے اور



کچھ اپنی تنخواہ سے بھاری رقم جمع کر کے انہیں دیتی۔ اسی لیے وہ این جی او کا ایک سرگرم رکن مانی جاتی تھی

''ہماری ٹیم کو آپ کی ایک کلاس فیلو نے جوائن کیا ہے۔ تہمینہ بختاور۔'' وہ پورے دو ماہ بعد این جی او آئی تھی جب اس کی ملاقات آنٹی سے ہوئی تھی جو چیک وصول کرتے ہوئے اسے بتا رہی تھیں۔ وہ جس لڑکی کا نام لے رہی تھیں، اس کا نام تو کچھ سنا سا تھا لیکن اسے شکل یاد نہیں آ رہی تھی۔ تہمینہ کے سامنے آنے پہ بھی وہ یاد نہ کر سکی کہ وہ اس کی کس زمانے میں کلاس فیلو رہی تھی۔ تبھی تہمینہ نے اس سے اپنا تعارف کرواتے بتایا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں محض ایک ماہ اس کی کلاس فیلو رہی تھی۔ پھر شادی کی وجہ سے اسے تعلیم کا سلسلہ چند ماہ کے لیے منقطع کرنا پڑا تھا اور چھ ماہ بعد وہ دوبارہ جب یونیورسٹی آئی تھی تو خولہ اس سے ایک سمسٹر آگے تھے۔

تہمینہ سے پہلی ملاقات کے بعد بھی اس کی کئی ملاقاتیں کافی پر اثر ثابت ہوئی تھیں۔ وہ اس این جی او میں دیگر کئی کارکنان کی طرح محض اس لیے تھی کہ اسے اس نوکری کی ضرورت تھی جبکہ خولہ ایک جذبے کے تحت بلا معاوضہ کام کر رہی تھی۔ تہمینہ کو اس کے ساتھ کام کرتے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا لیکن اس کی عادات اور فطرت کو وہ دل سے پسند کرنے لگی تھی ۔ جو کچھ اس کے دماغ میں چل رہا تھا اس کے لیے ایک معصوم، ریا سے پاک سادہ دل لڑکی کی ہی تو ضرورت تھی۔ تبھی اس نے خولہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''تمہیں برا لگا؟'' تہمینہ کو بات مکمل کرتے ہی احساس ہوا کہ خولہ جیسی لڑکی سے ایسی بات کرنا بھی زیادتی تھی۔ یوں تو اس نے بات بڑے طریقے سے کی تھی کہ خولہ کو برا بھی نہ لگے اور وہ سمجھ کر بھی نہ سمجھے۔ لیکن پھر بھی اسے برا محسوس ہو رہا تھا۔

خولہ کا چپس کھاتا ہاتھ چپس کے پیکٹ میں ہی رہ گیا تھا۔ وہ اس قدر حیران تھی اس کی بات پہ کہ تہمینہ اس سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

''آئی ایم سوری۔ مجھے تم سے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔''

''تم نے مجھ سے ہی کیوں کہا؟ کیا کسی نے تمہیں مجھ سے یہ سب کہنے کو کہا ہے؟''

تہمینہ نے سر نفی میں ہلایا۔ ''مجھے لگا تم سمجھو گی۔''

''تمہیں کیسے لگا کہ میں سمجھوں گی؟'' اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔

''کیوں کہ تم مجھے دوسروں کی طرح نہیں لگتیں۔ تم ایک میچور لڑکی ہو۔۔'' خولہ اسے اسی بے یقینی سے دیکھتی رہی جب تک تہمینہ اس کے اس طرح دیکھے جانے سے زچ نہیں ہو گئی۔

''کہا نا آئی ایم سوری۔ اب مجھے ایسے دیکھنا بند کرو کہ میں اپنے آپ سے نظریں نہ ملا پاؤں۔''

''میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ تم نے کیا کہہ دیا ہے مجھ سے۔'' خولہ جیسے کتنی دیر بعد حرکت میں آئی۔

''بھول جاؤ کہ میں نے کچھ کہا اور تم نے کچھ سنا۔ سمجھو میں گونگی اور تم بہری ہو۔''

''ایویں سمجھ لوں۔ خواہ مخواہ۔'' خولہ نے چپس منہ میں رکھتے مزے سے بات اڑائی۔ تہمینہ اس کے لب و لہجے پہ غور کرنے کی کوشش میں ہی تھی کہ خولہ نے ارد گرد دیکھتے جیسے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''پھر کب لا رہی ہو؟''

تہمینہ کی آنکھیں اب حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اسے خولہ کی دماغی حالت پہ شک سا گزرا۔

''یہ مذاق نہیں ہے خولہ۔''

''تو میں نے کب کہا کہ یہ مذاق ہے؟''

''تم کس کی بات کر رہی ہو؟'' تہمینہ نے اب کی بار نا سمجھی سے اسے دیکھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ کسی اور کی بات کر رہی ہے۔ اور کاش کہ وہ کسی اور کی بات کر رہی ہوتی تا کہ تہمینہ اپنی کچھ دیر پہلے کی گئی حماقت کے دکھ سے باہر نکل پاتی۔

''اپنی اور کس کی۔ تم نے میرے لیے ہی تو مجھ

سے بات کی ہے نا؟"

"تمہارے لیے۔ نہیں..... میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ۔۔ اگر کوئی رشتہ ہو تو۔ وہ کیا ہے کہ تم ایسے کام مطلب سوشل ورک ٹائپ کرتی رہتی ہو نا۔ اس لیے کہہ دیا۔" اس نے اٹک اٹک کر بات جیسے تیسے مکمل کی۔

"کسی اور کا کیوں؟ میں تم سے کہہ رہی ہوں نا کہ میں ہوں۔ تو تم کب لا رہی ہو ممانی کو ہمارے ہاں؟" خولہ حد درجے سنجیدہ تھی ورنہ تہمینہ کو ضرور لگتا کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔

"آر یو سیریس؟ خولہ عماد بھائی۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"بس کل شام لے آؤ۔ میں ماما کو بتا دوں گی۔" اس نے پھر سے چپس کھانا شروع کر دیے۔ تہمینہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

تہمینہ نے اپنے ماموں کے بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے اس سے رشتے کی بات کی تھی۔ اس کزن کے رشتے کی بات جو بچپن میں ایک ٹانگ میں پولیو ہو جانے کی وجہ سے کچھ لنگڑا کر چلتا، اکثر چھڑی کا استعمال بھی کرتا تھا۔ خاندان کے اندر باہر اس کے بے شمار رشتے تلاش کیے جا چکے تھے لیکن کہیں اس کی کم آمدن کو بہانہ بناتے انکار ہو جاتا اور کہیں ذاتی گھر نہ ہونے کی وجہ سے لیکن اصل وجہ اس کی معذوری تھی، سب جانتے تھے بس اظہار نہیں کرتے تھے۔ ممانی بیٹے کی وجہ سے بے حد پریشان تھیں اور تہمینہ کی امی بھی کیونکہ انھوں نے ایک عرصے تک اسے پالا تھا۔

قدسیہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"اب تم سارے ملک سے ایسے مردوں کو ڈھونڈو گی جو ٹھیک سے چل نہ سکیں؟" وہ چلائی تھیں۔

"میں نے اسے نہیں ڈھونڈا ماما۔ آپ بے شک تہمینہ سے پوچھ سکتی ہیں کہ اس نے خود مجھ سے بات کی ہے۔"

"تو وہ خود کیوں نہیں کر لیتی؟"

"کیونکہ وہ شادی شدہ ہے۔"

"اپنی بہن کی کرا دے، نند کی، کزن کی یا جس مرضی کی مگر تمہاری جان چھوڑ دے۔"

"اس نے مجھے مجبور نہیں کیا۔ اس نے مجھ سے بس ذکر کیا تھا۔" اس کی بات نے قدسیہ کو مزید تاؤ دلا دیا تھا۔

"اور تم تو یونہی حاضر بیٹھی تھیں۔ فوراً مان گئی ہو گی۔" کہہ تو وہ سچ رہی تھیں اسی لیے خولہ نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

تہمینہ جب اپنی ممانی کے ہمراہ اس کے ہاں آئی تھی۔ انہیں خولہ ہر لحاظ سے پسند آئی تھی اور انھوں نے کھل کر بیٹے کے متعلق بتا دیا تھا۔ قدسیہ ان سے بہت اچھی طرح ملی تھیں۔ ان کی کسی بات سے ناپسندیدگی ظاہر نہیں ہوئی تھی اور خولہ نے اسی بات پہ مہمانوں کے جانے کے بعد ماں کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"اچھی طرح سے ملنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس رشتے پہ مان گئی ہوں۔ میں نے کبھی تمہیں سوشل ورک سے نہیں روکا۔ جو تم نے چاہا وہ کیا۔ جیسے جینا چاہا، جیا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں تمہیں اپنی زندگی برباد کرنے دوں گی۔ باپ سر پہ نہیں ہے تو مطلب تم ماں کو بھی مرا سمجھو۔" وہ خالص ماؤں والی جذباتی باتیں کرنے پہ آ گئی تھیں۔

"بہتر ہو گا آپ مفتی صاحب سے مشورہ کر لیں۔ شاید اسی سے آپ کی تسلی ہو جائے۔" اس نے بال ماں کی کورٹ میں ڈال دی تھی جو ہر بڑا کام کرتے ہوئے جامع مسجد کے مفتی صاحب سے ضرور مشورہ کر کے چلتی تھیں۔ قدسیہ اس کی اس بات پہ سوچ میں پڑ گئی تھیں اور پھر کتنے دن اس نے ماں کو خاموش پایا۔

"آپ بہت دن سے اتنی خاموش کیوں ہیں ماما؟" اس نے ایک روز انھیں گم صم بیٹھا دیکھا تو پوچھ لیا۔



"مفتی صاحب کہتے ہیں کہ اس رشتے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔" ان کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ نہ چاہ کر بھی مان گئی ہیں۔ خولہ نے بے یقینی سے انھیں دیکھا۔

"کیا ضروری ہے کہ ہر بات میں فائدہ نقصان دیکھا جائے۔ دلیلیں دی جائیں۔ کبھی ان سب سے ہٹ کر بھی سوچ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"یہ تمہاری زندگی کا فیصلہ ہے کوئی کھیل نہیں ہے۔"

"ہم بہت منافق ہیں ماما۔ زبان سے قسمت پہ یقین رکھتے ہیں لیکن دل سے اسے نہیں مانتے۔ انسان کی موت، حیات، رزق، نکاح سب پہلے سے لکھا گیا ہے تو پھر کیوں ہم اچھی چیزوں کے غم میں گھلے جاتے ہیں۔ ہم کیوں ان کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں جب کہ یہ ہمیں ڈھونڈتی ہمارے پاس آتی ہیں۔"

"تو کیا ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں؟ سب قسمت پہ چھوڑ کر خود کچھ نہ کریں؟"

"کوشش سے انکار نہیں ہے بس قسمت سے لڑنا چھوڑ دیں۔ آپ اتنے سالوں سے اپنی سی کوشش کر کے دیکھ چکی ہیں۔ اب ایک بار توکل کر کے بھی دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے اسی میں کچھ بہت اچھا ہو۔" قدسیہ خاموش رہیں۔

اس سے اگلے روز ہی جواد بھائی کا اسے فون آیا تھا۔

"تم ایک معذور انسان سے شادی کرو گی؟" نخوت بھرا انداز جوان کا خاصہ بن چکا تھا، خولہ کو برا لگا۔

"معذور انسان سے شادی کرنا ایک ذہنی مریض سے شادی کرنے سے کہیں گنا بہتر ہے۔"

"عروہ ذہنی مریض نہیں ہے، اسے بس ہلکا سا ڈپریشن ہے۔" وہ بیوی کی وکالت میں فوراً میدان میں اتر آتے تھے۔ خولہ استہزائیہ مسکرا دی۔

"عماد بھی معذور نہیں ہے، بس ہلکا سا ٹانگ میں لنگ ہے۔"

"تم ابھی سے اس کی اتنی طرف داری کر رہی ہو۔ ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی۔۔" وہ چلائے تھے۔

"کیونکہ میں آپ ہی کی بہن ہوں۔ آپ بھی بھابھی کی اسی طرح طرف داری کرتے تھے شادی سے پہلے کیونکہ وہ آپ کی پسند تھیں۔"

"تو میں کیا سمجھوں کہ وہ معذور انسان تمہاری پسند ہے؟"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں، سمجھ سکتے ہیں۔ پسند ہے نہیں تو ہو جائے گا۔" کال اس نے کاٹ دی تھی۔ جب وہ، ماما اور اسے دونوں کو چھوڑ ہی چکے تھے۔ ایک عرصے تک ان کی خبر نہیں لیتے تھے۔ بھائی ہونے کا نہ کوئی فرض نبھاتے تھے اور نہ ہی بیٹے ہونے کی کوئی ذمہ داری تو انہیں اب بھی اسے اس کے حال پہ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ ان کے معاملات میں نہیں بولنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

"تم بہت پریکٹیکل ہو خولہ! بالکل بھی مادیت پرست نہیں ہو اور یہی بات مجھے تم میں اچھی لگی تھی۔" اس نے تہمینہ کے کریدنے پہ اسے بتا دیا تھا کہ اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور اسے تو کبھی تھا ہی نہیں۔

"لیکن تم نہیں ہو۔ اگر تم ہوتیں تو تم یہ رشتہ میرے بجائے اپنے لیے قبول کر چکی ہوتیں۔" باتوں باتوں میں تہمینہ کی ممانی سے یہ جان کر کہ وہ تہمینہ کو بہو بنانا چاہتی تھیں لیکن اس نے انکار کر ڈالا تھا اسے افسوس ہوا تھا۔ تہمینہ اس کی بات سن کر کتنی دیر خاموش رہی تھی۔

"مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں ایک ایسے انسان سے شادی کرتی جو....." بات دانستہ اس نے ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"آئی کین انڈر اسٹینڈ تہمینہ۔ تمہیں وضاحت

دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے وہیں اپنے تئیں بات ختم کر ڈالی تھی۔

اور جب وہ پہلی بار عماد سے ملی تو اسے اپنا خواب یاد آیا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھا تھا لیکن حلیے اور شخصیت کے اعتبار سے عماد اسے وہی لگا تھا جو اسے خواب میں دکھائی دیتا تھا۔

''میں مالی لحاظ سے اتنا مضبوط نہیں ہوں۔'' وہ دونوں اب گھر کے لان میں بیٹھے تھے۔

''اگر آپ اعصابی طور پہ مضبوط ہیں تو آپ دنیا کے مضبوط ترین انسان ہیں۔'' اس نے سر پہ ٹکا اپنا دوپٹا درست کیا۔

''لیکن میں جسمانی اعتبار سے بھی آپ کے قابل نہیں ہوں۔'' وہ جیسے اس بات پہ شرمندہ تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ آپ ذہنی طور پہ میرے قابل ہیں۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے؟''

''آپ سب کچھ جان کر بھی مجھے قبول کر رہی ہیں؟'' خولہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اسے کیا کہے۔ وہ اسے خواب کے بارے میں بتائے گی لیکن ابھی نہیں یہ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

''مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا، یہ تو میری مرضی ہے۔ اور آپ کبھی ایسا مت سوچیے گا کہ مجھے اس بات سے یا ایسی کسی بات سے کوئی فرق پڑتا ہے۔ میرے لیے یہ باتیں بے معنی ہیں۔''

''پھر بھی۔ آپ بہت اچھا انسان ڈیزرو کرتی ہیں۔''

''کرتی ہوں تبھی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ اس کی بات پہ جو اتنی دیر سے سر جھکائے بیٹھا تھا، حیران ہوتا سر اٹھانے پہ مجبور ہوا۔

''آج کل آپ جیسی لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ اتنی منفرد اور اتنی کمپرومائزنگ۔''

''بس اللہ نے ایک ہی پیس بنا کر چھوڑ دیا تھا۔'' اور وہ دونوں اس بات پہ بے ساختہ ہنسے تھے۔ آگے کی ساری گفتگو ایک دوسرے کی پسند ناپسند سے متعلق تھی۔ عام، سادہ فہم، تکلف سے ہٹ کر۔

قدسیہ نے اس ملاقات کے بعد بھی اس سے ایک موہوم امید پہ پوچھا تھا۔

''کیا واقعی تم اب بھی اس سے شادی پہ آمادہ ہو؟'' انھیں لگا تھا شاید کسی بات پہ اس نے ارادہ ترک کر دیا ہو۔ شاید اسے دیکھ کر، اس سے مل کر، حقیقت پسند بن کر وہ اپنے فیصلے پہ نظر ثانی کر لے۔

''ماما کیا ہماری تخلیق میں ہمارا کوئی بھی عمل دخل ہے؟ اگر اس کی جگہ میں ہوتی تو تب بھی آپ یہی کہتیں؟ کیا مجھے حق نہیں ہوتا اچھے انسان کو بطور جیون ساتھی چننے کا؟ پھر یہ ظلم میں کسی پہ کیوں کروں؟ آج میں اسے اس کی کمی پہ رد کرتی ہوں، کل میری اپنی اولاد کی صورت وہی کمی میرے سامنے لائے، خدا مجھے یہ دکھا دے کہ میں نے اس انسان کو نہیں بلکہ اس کی قدرت کو رد کیا تھا تو میں کیا کروں گی۔ اور تب آپ کیا کریں گی؟'' اس کے سوال، اس کی سوچ نے انھیں لاجواب کر دیا تھا۔

ان دونوں کی ایک دوسرے کے لیے رضامندی دیکھتے ہوئے بڑوں کے درمیان بات طے ہو گئی اور محض تین ماہ بعد ان کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ جواد بھائی راضی نہیں تھے لیکن مزید مخالفت بھی نہیں کی تھی۔

☆☆☆

وہ برف پہ اپنا اور اس کا نام لکھ رہا تھا اور وہ موبائل سے اس کی ویڈیو بناتی بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ نام مکمل ہوا اور عماد کے ہاتھ سرد۔۔

''تم خوش ہو؟'' دونوں وہیں قریب ہی برف کے ایک ٹیلے پہ جا بیٹھے تھے۔ سامنے سڑک پہ سے گزرتی گاڑیوں کو دیکھتے ٹھنڈی ہوا، سبزے کو محسوس کرتے۔

''بہت۔ کیوں تمہیں نہیں لگ رہی؟'' اس نے مسکراتے اس کی جانب دیکھا۔

''لگ رہی ہو۔ بس پوچھنا میرا فرض ہے۔'' اس کے گرم ہاتھوں کو اس نے اپنے سرد ہاتھوں میں تھام لیا کہ ان کی گرمی اپنے اندر اتار سکے۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ بہتر جگہ نہیں لے جا سکا۔ لیکن۔'' وہ شرمندہ تھا، اسی لیے ٹھہر ٹھہر کر الفاظ کا چناؤ کر رہا تھا۔ خولہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''مجھے بھی افسوس ہے کہ تم اس بات پہ افسوس کر رہے ہو جس کے بارے میں میں نے سوچا تک نہیں۔ تم مجھے کسی دوسرے ملک بھی لے جاتے تب بھی مجھے اتنا ہی اچھا لگتا جتنا کہ اب۔ کیونکہ میرے لیے تم اور تمہارا ساتھ اہم ہے، جگہ نہیں۔'' وہ اس کے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے مسل رہی تھی۔ یہ ان کی شادی کا تیسرا مہینہ تھا جب وہ پہلی بار کہیں گھومنے نکلے تھے۔ پہلے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ اسے گھمانے لے کر جاتا اور پھر آفس کی کچھ مصروفیات۔

''تم اتنا مجھے کیوں چاہتی ہو؟'' وہ اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''کیونکہ مجھے تمہیں ہی چاہنا چاہیے۔''

''مجھے چاہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے تمہارے پاس۔''

''ایک سو ایک وجہ ہیں۔ لیکن پہلی اور آخری کہ تم میرے شوہر ہو۔''

''میں روز خدا کا شکر کرتا ہوں کہ تم میری بیوی ہو۔'' وہ ہنس دی تھی۔

''اس شکر کی وجہ؟''

''تم سے پہلے میری کتنی جگہ بات چلائی گئی لیکن بات نہیں بنی۔ حتی کہ میں نے خود بھی دو لڑکیوں کو پرپوز کیا تھا۔'' وہ یہ بات کر کے جیسے کچھ یاد آنے پہ سر نفی میں ہلاتا ہنس دیا تھا۔ خولہ نے اسے ایسے ہنستے ہوئے بے یقینی سے دیکھا۔

''ڈونٹ ٹیل می۔ تم تو مجھے بہت شریف لگتے تھے عماد۔'' وہ مذاق کے ہی موڈ میں تھی اسی لیے عماد مزید ہنس دیا۔

''لگتے تھے کیا مطلب، میں شریف ہوں۔ کسی کو پرپوز کرنا انسان کو شرافت کے دائرے سے باہر کر دیتا ہے کیا؟ ویسے میں نے خود سے نہیں کیا تھا پرپوز۔ بہزاد کی بیوی نے دکھائی تھی مجھے اپنی پڑوسن اور اسی نے بات کی تھی۔ لڑکی مان گئی تو میں نے ایک بار بہزاد کے کہنے پہ فون پر بات کر لی۔ لیکن اس کے گھر والے نہیں مانتے تھے۔ انھیں بہت کچھ چاہیے تھا۔ پیسہ، گھر، گاڑی، اچھی نوکری اور سب سے بڑھ کر انھیں میں ایسے نہیں چاہیے تھا جیسا کہ میں ہوں۔'' اس نے اپنی جانب اشارہ کیا۔ خولہ نے اس کا تھاما ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیا۔

''اور دوسری سے بھی بہزاد نے ہی ملوایا تھا، اس کے آفس کی ایک کولیگ۔ تعریف کرتا تھا اس کی کہ اچھی لڑکی ہے لیکن اس اچھی نے ایسے اچھی طرح سے گھمایا ہمیں کہ ہم گھوم ہی گئے۔ انکار بھی نہیں کرتی تھی اور مانتی بھی نہ تھی۔ بس ٹالے جاتی تھی۔ میں سمجھ گیا اسے اعتراض ہے مجھ پہ بس کہہ نہیں پا رہی۔ سو میں خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔'' خولہ نے اب کی بار اپنا سر اس کے کاندھے سے ٹکا دیا۔ کتنوں نے اسے ایسے بیٹھے دیکھا، کتنوں نے گھورا لیکن وہ ایسی ہی ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی۔

''محبت تھی یا پسند؟''

''نہ محبت نہ پسند۔ بس وقتی پسندیدگی تھی جو وقت گزرنے سے بھی پہلے ختم ہو گئی۔''

''کیونکہ تمہیں میں جو ملنا تھی۔'' اس نے مسکرا کر اپنے محبوب شوہر کو دیکھا۔

''سب کو لگتا تھا کہ مجھے کبھی کوئی لڑکی نہیں ملے گی۔ خاص کر امی کو۔ لیکن تم میرے مقدر میں لکھی جو تھیں پھر کیسے نہ ملتیں۔ تم، جس کے لیے نہ دولت اہم تھی، نہ گھر گاڑی۔ تم نے مجھے میری تمام کمیوں سمیت قبول کر کے مجھے کامل کیا ہے خولہ۔'' وہ اسی طرح اسے سراہتا، چاہت کا اظہار کرتا رہتا تھا لیکن خولہ کو کبھی یہ نہیں لگا کہ اس نے اس سے شادی کر کے کوئی بہت منفرد کام کیا ہے۔ یہ سب عماد کو لگتا

تھا۔

''میں نے کچھ بھی ایسا نہیں کیا۔''

''یہ تمہیں لگتا ہے ورنہ مجھ جیسے انسان کے ساتھ زندگی.....'' اس نے خولہ کا بگڑتا موڈ دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''مجھے تم جیسا انسان ہی چاہیے تھا عماد۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ جب بھی چاہوں گی، اپنے شوہر کو ہی چاہوں گی لیکن یہ تو میں بھی نہیں جانتی تھی کہ میں اتنی شدت سے چاہوں گی۔'' وہ اٹھ کر اب اسے اٹھنے میں مدد دینے کے لیے ہاتھ بڑھا رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ برف باری پھر سے شروع ہونے کو تھی اور وہ اب اپنے ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''تم نے مجھ سے شادی محض ایک خواب کی بنا پہ کر لی؟'' وہ اب تیز چلتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

''خواب کی بنا پہ نہیں، اس محبت کی بنا پہ جو میں تم سے ملنے سے پہلے ہی تم سے کرنے لگی تھی۔'' وہ اس کی بات پہ ہنس رہا تھا اور خولہ اس کے تھامے بازو میں اپنے ناخن کھبو رہی تھی۔

اس نے پہلی بار جب اسے خواب کے متعلق بتایا تھا تو وہ کتنی دیر اس بات کو لے کر ہنستا رہا تھا۔

''یار اتنا مذاق تو مت کرو۔''

وہ خوابوں پہ یقین نہیں رکھتا تھا، رکھتی تو وہ بھی کچھ خاص نہیں تھی لیکن اس خواب کو اس نے اپنی آنکھوں سے حقیقت بنتے دیکھا تھا سو اب رکھنے لگی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں عماد!''

''اچھا مان لیا کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔'' وہ مان کر بھی نہیں مان رہا تھا وہ جانتی تھی۔

''بھلے مت مانو لیکن یہ سچ ہے کہ تم میرے سول میٹ ہو اور تمہیں مجھ سے بڑھ کر کبھی کوئی چاہ ہی نہیں سکتا۔'' ایک مان تھا اس کے لہجے میں جس پہ عماد نے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔

''اس میں ایک فیصد بھی شک نہیں ہے کہ تم سے بڑھ کر نہ کوئی چاہ سکا ہے نہ چاہے گا۔'' اس کی شادی سے پہلے بھی سب جاننے والوں نے اعتراضات کیے تھے لیکن اس نے یہ کہہ کر سب کے منہ بند کر دیے تھے۔

''ایک ٹانگ سے معذوری اس ذہنی معذوری سے بہتر ہے جس میں مبتلا شوہر اپنی بیویوں کو بیچ دیتے ہیں۔ کم از کم عماد ایسا نہیں کرتا۔'' بولنے والوں کے لیے ایک بیوی کا اتنا دفاع ہی خاموش ہو جانے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

رات سونے سے قبل وہ دونوں اپنی دن بھر کی مصروفیات ڈسکس کرتے تھے یہ ان کا معمول تھا۔ اب بھی وہ اسے بتا رہی تھی کہ اس نے دن کیسے گزارا کتنے کام کیسے کیسے کیے۔

''شادی سے پہلے بھی تم اسی طرح کام کرتی تھیں؟'' وہ اس کے بازو پہ سر رکھ کر لیٹی ہوئی تھی اور وہ آنکھیں موندے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں تو۔ شادی سے پہلے میں بس اپنی دلچسپیوں میں لگی رہتی تھی۔ جاب سے وقت ہی کم ملتا تھا اور جو ملتا تھا اس میں پودوں کی دیکھ بھال اور ککنگ کیا کرتی تھی۔''

''اور یہ سارے کام تم اب نہیں کر پاتیں کیونکہ اس گھر میں تمہارے پودے رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ تمہاری ککنگ کا خرچا میں نہیں اٹھا سکتا۔''

''مگر مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ میرے پاس کرنے کو اب اور کام ہیں جیسے میں اپنے کمرے کو سجاتی ہوں، گھر والوں کے لیے خاص نہ سہی، عام سا ہی مگر کھانا بناتی ہوں اور تمہاری چیزوں کا خیال رکھتی ہوں۔ ایسے میں ہی دن گزر جاتا ہے۔ عماد یہ جو دلچسپیاں اور شوق ہم نے پال رکھے ہوتے ہیں نا، یہ سارے شادی سے پہلے ہی اچھے لگتے ہیں۔ شادی کے بعد تو فرصت ہی نہیں ملتی ایسے کاموں کی۔''

یہ اس کا عماد کو کم، خود کو دیا بہلاوا زیادہ تھا۔ ورنہ



شادی کے بعد اس نے کہاں کہاں اور کیسے کیسے سمجھوتا نہیں کیا تھا وہ جانتی تھی۔ عماد اس کا شوہر تھا اور وہ ایسی کوئی بات کر کے اس کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے کم مائیگی کا احساس نہیں دلانا چاہتی تھی۔ وہ یہ سب کرنے اس کی زندگی میں نہیں آئی تھی۔ وہ اچھے دنوں کی آس لے کر اس کی زندگی میں آئی تھی اور اسے اسی امید کے سہارے ہی جینا تھا۔

''کبھی تو کہہ دیا کرو خولہ کہ تم یہاں تنگ ہو، کسی بھی چیز کو لے کر ہی سہی۔ تم مطمئن نہیں ہو کیونکہ یہ تمہارا معیار زندگی نہیں ہے۔ تمہیں اس سب کی عادت نہیں ہے۔'' اس نے نرمی سے اپنے سینے پہ رکھا اس کا بازو سہلایا تھا۔

''کیوں کہوں جب ایسا ہے ہی نہیں۔'' اسے اس کی آواز کچھ بھرائی محسوس ہوئی تھی لیکن وہ اسے نہیں بتائے گی وہ جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اسے کوئی تنگی تھی بھی تو وہ اس سے نہیں کہے گی۔ اسے شکایتیں کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ ہر شے کو جس طرح ہے، جیسے ہے کی بنیاد پہ قبول کر لیتی تھی۔

وہ ایک کھاتے پیتے، متمول گھرانے سے اس گھر میں آئی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی شے کی کمی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ایک آزاد اور کھلے ڈلے ماحول سے ایک گھٹن زدہ ماحول میں آ گئی تھی جہاں اس کی بھابھی کی اجارہ داری تھی۔ آمدن کم تھی سو مہینہ گزارنے کے لیے ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ روزمرہ کھانے کے علاوہ کچھ بھی پکانا عیاشی سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے کوکنگ کے شوق کو آتے ہی نذرِ آتش کر ڈالا تھا۔ وہ ایک کرائے کا گھر تھا جہاں ایک بڑا خاندان اور ان کی چیزیں رکھنے کے لیے ڈھیروں جگہ درکار تھی۔ پورچ چھوٹا تھا جہاں ایک گاڑی بمشکل کھڑی ہو پاتی تھی اور وہ بڑے بھائی کی تھی۔۔ وہاں پودے نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ پچھلی گیلری میں کپڑے دھو کر ڈالے جاتے تھے، وہاں بھی نہیں۔۔ گھر کا چھت مالک مکان کے پاس تھا سو وہاں تو بالکل بھی نہیں۔ اس نے خود ہی گھر پہ نظر ڈالنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے پودوں کو یہاں نہیں لا سکتی۔ اس نے انھیں اپنی ماں کے ہاں رہنے دیا تھا۔

بھابھی گھر کی بڑی بہو تھیں اور پچھلے دس سال سے گھر میں ان ہی کی چلتی تھی۔ بانو بیگم ایک بے ضرر خاتون تھیں جنھوں نے کبھی بہو اور بیٹوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔ سو بھابھی نے ہمیشہ گھر میں اپنا حکم چلایا تھا۔ شروع شروع میں اس نے گھر میں اکا دکا تبدیلیاں کی تھیں تو انھیں ناگوار گزریں، اس حد تک کہ کہنے کے بجائے انھوں نے اس کی لائی چیزوں کو گھر کے ایک پرانے حصے میں ڈال دیا تھا۔ پھر نوبت یہاں تک آئی کہ وہ اپنے جہیز میں لائے سامان کو بھی اپنی مرضی سے استعمال نہیں کر سکتی تھی۔

عماد کے پوچھنے پہ وہ با آسانی کہہ دیا کرتی تھی کہ جب بھی اپنا گھر ہو گا تو میں اپنے سارے شوق پورے کر لیا کروں گی۔ لیکن وہ جب اپنے میکے جایا کرتی، اپنے شوق کی تسکین ضرور کیا کرتی۔ وہ اپنے پودوں کو بھی سجاتی، گھر والوں کے لیے زبردست سا ڈنر بھی بناتی اور سارے گھر کی سیٹنگ بھی تبدیل کر ڈالتی۔ ماما کو لگا کرتا کہ ان کی بیٹی ذمہ دار ہو گئی ہے، اپنے گھر کے ساتھ ان کے گھر کا بھی خیال رکھنے لگی ہے لیکن وہ یہ سب کیوں کرتی تھی، صرف عماد جانتا تھا۔

''میں غلط تھی یہ جان کر اچھا لگتا ہے۔'' وہ اسے عماد کے ساتھ اس قدر خوش اور مطمئن دیکھ کر اب خود اس سے کہیں زیادہ مطمئن تھیں۔۔ خود سے اعتراف کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ کبھی نہیں جان پائی تھیں کہ ان کی وہ بیٹی ایک اچھی اداکارہ بھی ہے جو محض ماں کو پریشانی سے بچانے کے لیے بہت سی باتیں چھپا جاتی ہے۔۔ وہ اپنے گھر میں کتنا تنگ ہے، اس کی سسرال میں کیسے گن گن کر حساب رکھا جاتا ہے کھانے پینے کا، پہننے اوڑھنے کا، اس کے شوہر کی آمدن کتنی کم ہے کہ وہ بنیادی ضروریات کے علاوہ اس کی کوئی ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔ ایسی اور اس

جیسی کئی باتیں تھیں جو وہ ماں سے چھپانے کا ہنر جان گئی تھی۔ ماں کے گھر کے بھرے پرے آسائشات والے گھر اور کچن کو دیکھ کر اکثر اس کی آنکھوں میں آنسو آجایا کرتے تھے۔ یہ سب اس کا تھا، یہ سب اب اس کا نہیں رہا تھا۔ وہ اب ان چیزوں پہ حق نہیں رکھتی تھی۔

"تمہیں پتا ہے میں تمہاری ماما کے سامنے کتنا شرمندہ ہوتا ہوں۔" اس رات وہ اسے بتا رہا تھا۔

"وہ کیوں؟" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اب شوہر کی طرف دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

"یہ جو بیٹیوں کی مائیں ہوتی ہیں نا انہیں پتا چل جاتا ہے کہ ان کی بیٹی اپنے گھر میں خوش نہیں ہے۔ ماما کو بھی پتا چل جاتا ہے جب تم وہاں جا کر یہ سارے کام کرتی ہو تو۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ کیا سوچتی ہوں گی کہ میں ان کی بیٹی کی اتنی سی بھی ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔"

"غلط بالکل غلط۔ ماما کو پتا ہے کہ میں ان کے داماد کے ساتھ کتنا خوش ہوں۔" وہ احتجاجاً چلائی تھی۔

"تم میرے ساتھ خوش ہو نا خولہ؟" وہ یقین چاہتا تھا۔ خولہ اسے دیکھنے کے بجائے سر پھر سے اس کے سینے پہ رکھ چکی تھی۔ وہ خاموش رہی اور جب بولی تو اس کی آواز مدھم تھی۔

"بہت خوش۔" وہ اس کے ساتھ خوش تھی لیکن اس گھر میں خوش نہیں تھی جو چار ماہ گزر جانے کے باوجود اسے اپنا بھی نہیں لگتا تھا۔ ماحول کے فرق، وسائل کی کمی کے علاوہ رویوں کی تنگی بھی تھی جو اسے خوش ہونے سے روکے ہوئے تھی۔ یہ بات وہ کبھی عماد سے نہیں کہہ سکتی تھی جو تھکا ہارا باہر سے آتا اور اس کی ایک مسکان پہ ہی خوش اور تر و تازہ ہو جاتا۔

زندگی میں بہت کچھ اس سے چھوٹ گیا تھا اور بہت کچھ ترس ترس کر ملتا تھا۔ مہینے بھر میں ایک بار گھر میں جو راشن آتا تھا وہ اتنا تھوڑا ہوتا کہ ہر ماہ کے اختتام پہ وہ دالوں، چاولوں کے خالی منہ چڑاتے ڈبوں کو منہ اٹھا کر دیکھ رہی ہوتی اور انگلی کی پوروں پہ باقی دن گنتی۔ سبزی مہنگی تھی اور گوشت اس سے بھی مہنگا۔ پھل بھی کبھار کی عیاشی تھا اور دودھ انڈے اس سے بھی کم کی۔ کبھی وہ خود ہنستی اور کبھی رو دیتی۔ وہ کہاں سے نکل کر کہاں آ گئی تھی لیکن پھر بھی کبھی عماد جیسے انسان کی سنگت پہ کلمہ کفر اس کے منہ سے تو کیا دل سے بھی نہ نکلا تھا۔ وہ خود کو، دل کو بس تسلیاں دیے جاتی کہ کچھ وقت بعد یہ وقت بھی سرک جائے گا ۔ سب بدل جائے گا۔۔ بس کچھ دن بعد۔ اور کچھ دن گزر جاتے، نئے دن آ جاتے، پہلے جیسے یکسانیت بھرے۔ اس کی تسلیاں خود کو دیے گئے دلاسے جاری رہتے۔۔ وہ سب سہہ سکتی تھی مگر یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ عماد اس کے لیے ایک غلط انتخاب تھا۔ وہ قسمت کو بھی برا نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ ساری زندگی اسی قسمت نے اس کے ساتھ بہت اچھا کیا تھا۔

☆☆☆

"تمہارے نزدیک ایک آئیڈیل وائف کیا تھی؟" وہ اس روز موبائل پہ اس سے کوئی کوئز کھیل رہی تھی جب کھیلتے کھیلتے اس نے یونہی عماد سے پوچھا۔

"تم ایک آئیڈیل وائف ہو۔"

"شادی سے پہلے تمہارے ذہن میں کیا تھا کہ تمہاری بیوی میں کون کون سی خصوصیات ہونا چاہئیں؟"

"کیئرنگ ہو، لونگ ہو، سمجھ دار ہو کہ ہر معاملے کو اچھی طرح سمجھے اور سب سے بڑھ کر میری اچھی دوست ہو۔" اس نے ایک ایک کر کے سب گنوایا اور خولہ کا ہاتھ تھام کر پیار سے لبوں سے لگایا۔

"اور تم میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔" خولہ مسکرا دی۔

"کیا تم مجھ سے، میرے ساتھ سے مطمئن ہو؟" نجانے اسے کیوں یہ سوال کرتے رہنے کی عادت تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ اپنی ساری ذمہ داریاں اچھی طرح سے نبھا پا رہی ہے یا نہیں۔

"مطمئن سے بھی زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے نا خولہ عماد تو وہ میں ہوں۔ تم سب کچھ بہترین طرز پہ چلا رہی ہو، اچھے سے نبھا رہی ہو، تم سے زیادہ اور بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہو سکتا تھا میری زندگی میں۔"

"بدلے میں مجھے صرف ایک بات کی یقین دہانی چاہیے۔" خولہ نے اپنی تھوڑی اس کے کاندھے سے ٹکاتے اسے دیکھا۔

"شکر ہے کہ خولہ عماد کو بھی مجھ سے کچھ چاہیے۔" وہ ہنس دی تھی۔

"بس ایک شے۔ جو تم ہمیشہ، ہر لمحے، آخری سانس، آخری پل تک مجھے دو گے وہ تمہاری وفا ہے عماد۔ اور کچھ نہیں۔ میں ہر شے پہ گزارا کر سکتی ہوں، اس بات پہ بس کنارہ کروں گی۔"

"میں اور میری وفا بس ایک لڑکی کے ہیں، خولہ عماد کے، جو اس دنیا کی پہلی اور آخری لڑکی ہے جسے میں نے اتنا اور اس قدر چاہا ہے۔"

"مجھے مان ہے تمہاری بیوی ہونے پہ۔" اس نے اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا دیا تھا۔

"ایک وقت تھا جب مجھے لگنے لگا تھا کہ میرے نصیب میں شادی ہے ہی نہیں۔ میں ہر دوسرے دن رد ہو ہو کر تھک چکا تھا۔ مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ تم جیسی اچھی لڑکی میری زندگی کا حصہ ہے۔ ایک خوب صورت احساس کی مانند مجھ میں بس گئی ہے، دل میں دھڑکنے لگی ہے۔ سوچتا ہوں اتنے سال کہاں تھیں تم؟ کیوں اتنے عرصے مجھے انتظار کروایا۔"

وہ اسی قسم کے والہانہ اظہار کرتا رہتا تھا اور خولہ اسی محبت پہ نہال رہتی اور خود وہ بھلے اظہار نہ کرتی لیکن وہ عماد کو اس سے کہیں زیادہ چاہنے لگی تھی۔

"میں خواب میں ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، ہوٹل، شادی ہال، دریاؤں، ندی نالوں پہ بیٹھی تمہارا انتظار کرتی تھی بدھو۔ تم وہاں آجاتے تو مجھے پا لیتے نا۔" وہ ایسے منہ بسور کر کہتے اسے خفا خفا سی دیکھ رہی تھی۔ عماد کا اس کی بات پہ قہقہہ روکنا مشکل تھا اور خولہ کا ہنسی۔

☆☆☆

وہ دونوں اس روز رات کے کھانے پہ اس کی ماما کے ہاں مدعو تھے۔ ماما نے سارے گھرانے کو تو نہیں لیکن ان کے ساتھ بانو بیگم کو بھی مدعو کیا تھا۔ وہ تیار ہونے سے پہلے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے بیڈ پر لیٹے، موبائل میں محو عماد سے پوچھنے لگی۔

"تم نے امی کو بتا دیا تھا کہ وہ آٹھ بجے تک تیار ہو جائیں۔؟"

"نہیں۔" اس نے اسی مصروف انداز میں کہا۔ خولہ کے تیزی سے کام سمیٹتے ہاتھ وہیں تھم گئے تھے۔

"کیا مطلب نہیں؟ انہیں ہمارے ساتھ جانا ہے۔"

"میں ضروری نہیں سمجھتا کہ انہیں ساتھ لے کر جاؤں۔ ویسے بھی یہ تمہارا فیملی ڈنر ہے۔ اس میں ان کا جانا معنی نہیں رکھتا۔" وہ مزے سے موبائل پہ اب گیم کھیلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"عماد مجھے تمہاری اس بات کی سمجھ نہیں آرہی۔ ماما نے امی کو بھی انوائٹ کیا ہے اور تم یہ بات جانتے ہو۔ امی کیوں نہیں جا سکتیں ہمارے ساتھ۔ ہم کوئی ہنی مون پہ نہیں دعوت پہ جا رہے ہیں۔" وہ غصہ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن کر گئی تھی۔

"اور وہ میری ماں ہیں تمہاری نہیں۔ جب میں انہیں نہیں لے کر جانا چاہتا تو تمہیں ان کی فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم پہلے ہی دیر کر چکے ہیں۔" وہ اٹھ کر اپنا سوٹ لیے باتھ روم میں گھس گیا تھا اور خولہ ناسمجھی سے وہیں کھڑی کتنی دیر اس کی ذہنیت سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

ڈنر میں بھی وہ کچھ چپ چپ تھی لیکن عماد اتنا پر اعتماد سب سے مل رہا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر ہی رہ گئی۔ اس کی بہن اور بھائی اپنے اپنے خاندان کے ساتھ مدعو تھے۔ سب آپس میں بول چال رہے تھے سوائے اس کے۔ اس گھر میں سب کے عجیب رویوں میں عجیب ترین رویہ اس کے شوہر کا تھا۔ اس کی جیٹھانی ایک عرصے سے اس گھر پہ حکومت کرنے کی عادی

"اس نے تمہیں نہیں، تمہارے اندر زہر پالا ہے۔" وہ رو دی تھیں۔

"کسی نے اگر میرے اندر زہر پالا ہے تو وہ آپ خود ہیں۔ آپ کا بھرا زہر میری زندگی تباہ کر گیا، مجھے اپاہج کر گیا، مجھے معذور بنا گیا، جہاں جاتا ہوں لوگ مجھے ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مجھے معذور کہتے ہیں۔ جانتی ہیں کیسا لگتا ہے یہ لفظ مجھے۔ ایسے جیسے کسی نے تیزاب انڈیل دیا ہو میرے چہرے پہ۔ جانتی ہیں کیسا لگتا ہے جب بھرے مجمع میں لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھتے ہیں، سوال کرتے ہیں کہ مجھے کیا ہوا، کیسے ہوا۔ تب مجھے لگتا ہے کہ آپ کا رشتہ میرے لیے گالی ہے۔ میں انھیں کیسے بتاؤں کہ یہ سب میری ماں کی کرم نوازی ہے۔۔ کوئی ماں اپنی ہی اولاد کے ساتھ ایسا برا کیسے کر سکتی ہے جیسے آپ نے میرے ساتھ کیا۔؟ اب آپ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی ہیں جب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر یہ سب تب کیا ہوتا تو میں ایسا نہیں ہوتا۔" اس کے لہجے میں نفرت اور نظروں میں حقارت تھی۔ بانو بیگم زور زور سے رو رہی تھیں اور خولہ ایک مجسمہ بنی انھیں اور عماد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی اتنی ہمت بھی نہ ہو سکی کہ وہ عماد کی زبان کو روک سکے جو اپنی سگی ماں کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔

"میں نے یہ سب جان کر نہیں کیا میرے بچے۔ کیسے یقین دلاؤں میں تمہیں؟ کیسے نکالوں تمہارے دل سے اس نفرت کو جو تم بچپن سے پال رہے ہو۔ پھر بھی مجھے معاف کر دو۔ ہاتھ جوڑ کر تمہارے آگے معافی مانگتی ہوں۔ کہو تو تمہارے پیروں میں بھی بیٹھ جاتی ہوں، کوئی اور سزا سنانے کا دل ہے تو وہ بھی سنا دو، سہہ لوں گی مگر اب اس نفرت کو دل سے نکال دو۔" وہ ہاتھ جوڑے اپنے بیٹے سے بھیک مانگ رہی تھیں۔ خولہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"یقین کر لوں گا، نفرت بھی نکال دوں گا گر آپ مجھے میری یہ ٹانگ لوٹا دیں تو۔ کر سکتی ہیں آپ؟ لوٹا سکتی ہیں آپ وہ وقت جب میں [illegible] ٹانگوں سے کھیلتا، چلتا، بھاگتا بچہ تھا؟ [illegible] سکتیں۔ تو میں بھی نہیں نکال سکتا۔" بانو بیگم چادر [illegible] منہ دیے تیزی سے باہر نکل گئی تھیں۔ خولہ [illegible] سے عماد کو دیکھتی رہی جو اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔

☆☆☆

"عماد اور آپ کے درمیان اتنی دوریاں کیوں [illegible] ہیں امی؟" سلائی مشین چلاتے ان کے ہاتھ [illegible] گئے اور اجنبی نظروں سے انھوں نے خولہ کو دیکھا۔

"وہ مجھ سے اتنی وابستگی نہیں رکھتا۔" وہ پھر سے مشین چلانے لگ گئیں۔ وہ محلے بھر کی خواتین کے کپڑے کم معاوضے میں سی دیا کرتی تھیں۔ اسی لیے محلے والیاں انہی سے کپڑے سلواتی تھیں۔ اس طرح ان کا تھوڑا بہت خرچا بھی نکل آتا تھا اور وقت بھی گزر جاتا تھا۔

"بیٹا ماں سے وابستگی نہیں رکھے گا تو کس سے رکھے گا امی؟"

"وہ مجھے ماں نہیں سمجھتا، مجرم سمجھتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس کی ماں اس کی پھپھو ہے۔"

"مگر کیوں؟ کیوں اسے لگتا ہے کہ اس کی محرومی کی وجہ آپ ہیں۔ کیوں اسے لگتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ آپ کی لاپروائی کی وجہ سے ہوا۔ آپ نے کیوں اسے اس کی پھپھو کے حوالے کیا کہ وہ ان سے قریب اور آپ سے دور ہوتا چلا گیا؟" انہوں نے زخمی نظروں سے خولہ کو دیکھا تھا۔

"میرا جرم میری بیوگی، میری ممتا تھی۔ کمانے کے لیے گھر سے نہ نکلتی تو کیا کرتی؟ رمیز تو اسکول جاتا تھا لیکن عماد اس وقت میری گود میں تھا، محض پانچ ماہ کا جب ان کے ابو کا انتقال ہوا۔ گھر چلانے کے لیے مجھے کچھ تو کرنا تھا سو قریب ہی ایک لیدر فیکٹری میں سلائی کا کام کرنے لگی۔ صبح سویرے رمیز کو اسکول چھوڑتی اور عماد کو اس کی پھپھو کے ہاں اور خود فیکٹری چلی جاتی۔ سارا دن کام کرنے کے بعد رات گئے میری واپسی ہوتی تھی۔ اسی بھاگم دوڑ میں کب مجھ سے عماد کی پولیو ویکسینیشن رہ گئی، نہیں جانتی۔ اس وقت گھر گھر جا کر قطرے پلانے کا رواج نہیں تھا۔ بچوں کو لے کر خود مرکز جانا ہوتا تھا، جو کام کی زیادتی اور زندگی کی الجھنوں میں مجھ سے رہ گیا۔ اتنی بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے کہ میں اس نقصان کا ازالہ خود جان دے کر بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن عذرا، وہ تو لے کر جا سکتی تھی اسے۔ میں بھول گئی لیکن وہ تو نہیں بھولی تھی۔ اپنی اولاد نہیں تھا نا اسی لیے۔ مجھے جب تک ہوش آیا، دیر ہو چکی تھی۔ عماد اس مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا کر چلنے لگا تھا۔ میں چیخی چلائی، خود پہ، عذرا پہ، بین کیا، ماتم منایا لیکن کسی بات کا بھی اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ میرا بچہ اب معذور ہو چکا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ میں لنگ آ گیا تھا جو کبھی نہیں جانا تھا۔ اب مجھے ساری زندگی اسے ایسے ہی دیکھنا تھا، اور اسے ساری زندگی ایسے ہی جینا تھا۔۔ میرے پاس عذرا کے گھر کے سوا کوئی گھر نہ تھا جہاں میں عماد کو چھوڑتی۔ ساتھ لے جانے کی اجازت نہ تھی اور اس کے سوا کوئی نوکری ملتی نہ تھی۔ عذرا نے اس پہ بھی بس نہ کیا، وہ بیٹیوں کی ماں اور میں بیٹوں کی۔ حسد کا شکار عذرا، شاید اسی بات کی سزا دینے کے لیے میرے بیٹے کو مجھ سے دور کرنے کے لیے اس کو میرے خلاف بھرتی رہی۔ مجھ سے دور، خود سے قریب کرتی رہی۔ میرے خلاف اس کے اندر نفرت اس طرح انڈیلتی رہی کہ وہ مجھے اپنا مجرم سمجھنے لگا۔۔ اپنی سگی ماں کو ڈائن سمجھنے لگا اور میں کچھ نہ کر سکی۔" ان کی بوڑھی آنکھوں نے بہتے آنسوؤں پہ کوئی بند نہ باندھے۔

"تو آپ نے کیوں اسے سمجھایا نہیں، اسے کیوں نہیں بتایا کہ آپ سے انجانے میں یہ سب ہوا ہے۔ اپنی اولاد کیسے آپ نے کسی کی مٹھی میں دے دی۔"

"جب تک مجھے احساس ہوا عماد مجھ سے کھو گیا تھا۔"

"آپ نے اسے ڈھونڈا کیوں نہیں امی؟ کیوں گم کر دیا؟"

"جب وہ کھو گیا تو ہی مجھے سمجھ میں آیا کہ میں نے کیا کھو دیا ہے۔ جب گم ہونے والا خود ہی ملنا نہ چاہے تو ڈھونڈنے والا بھلا کیسے اسے ڈھونڈے؟ میں کیا کروں کہ وہ مجھے معاف کر دے۔ وہ مجھے پچھلے تیس سالوں سے جس جہنم میں جلا رہا ہے، کیا مجھے ساری عمر اسی جہنم میں جلنا ہوگا؟ یا کبھی وہ سمجھ سکے گا کہ میں اپنی ماں کی غلطی کی سزا ختم کر دے۔ وہ مجھے پچھلے تیس اس سے کہیں زیادہ تکلیف میں ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ اذیت سہہ رہی ہوں۔" خولہ نے روتی ہوئی بانو بیگم کو گلے لگا لیا تھا۔ ابھی وہ ان کے لیے بس اتنا ہی کر سکتی تھی۔ لیکن وہ ان کے لیے بہت کچھ کرے گی یہ اس نے سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

عماد اس روز کے بعد خولہ سے بالکل معمول کے مطابق بات کر رہا تھا یوں جیسے جو کچھ ہوا تھا، خولہ تو اس سب سے انجان تھی۔ وہ اس روز سے عجیب بے چینی کا شکار تھی اور عماد کے لیے جیسے کہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا۔ اسے شاید یہ سب کرتے رہنے کی عادت تھی۔ وہ اسی طرح خود کو اس سارے معاملے سے لاتعلق ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ سب اس نے نہیں، کسی اور نے کیا ہو۔ شاید وہ ذکر بھی کرنا پسند نہ کرتا گر خولہ بات شروع نہ کرتی۔

"تم نے امی کے ساتھ جو کیا اور اب تک تم جو بھی کرتے آئے ہو، نہایت غلط ہے۔" اس روز وہ پھپھو کے ہاں جانے کا پلان بنا رہا تھا اور پھپھو کے لیے اتنی الفت اور ماں کے لیے ایسی بے مروتی خولہ سے برداشت نہ ہو پا رہی تھی۔

"وہ اسی قابل ہیں کہ ان سے ایسا ہی کیا جائے۔"

"اور تم خود کس قابل ہو؟" سینے پہ ہاتھ باندھے وہ باقاعدہ جرح کرنے پہ آ گئی تھی۔

"مجھے انھوں نے کسی قابل چھوڑا ہی کب ہے؟" وہ استہزائیہ مسکرایا۔

"انہوں نے نہیں تمہاری پھپھو نے۔ انھوں

نے واقعی تمہیں کسی قابل نہیں چھوڑا عماد۔"

"پھپھو کے لیے ایک لفظ نہیں۔ وہ ماں ہیں میری۔ پالا ہے انھوں نے مجھے۔" انگلی اٹھاتے تنبیہ کرتے وہ غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"انہوں نے تمہیں نہیں، تمہاری صورت اپنا عناد پالا ہے۔" وہ حقیقت دکھانے کی کوشش میں ساس کی حمایت، شوہر کی مخالفت پہ اتر آئی تھی۔

"انہوں نے کچھ ایسا نہیں کیا۔ بانو بیگم کی حقیقت تم نہیں جانتیں۔ جان جاؤ تو یوں ان کی حمایت میں اتنا کچھ نہ کہو۔" وہ اپنی ماں کی سچائی اور جھیلی سختیوں کو بھول چکا تھا۔ عذرا کا سکھایا جھوٹ پورے قد سے کھڑا تھا۔

"امی نے کیسی کیسی مصیبتیں سہہ کر تمہیں اور رمیز بھائی کو پالا ہے۔ کتنی محنت کی ہے تم دونوں کے پیچھے یہ سب تم کیسے بھول سکتے ہو؟ اپنی ماں کی قربانیوں کے بدلے کچھ نہیں کر سکتے تو مت کرو مگر ایسا بھیانک بدلہ تو مت لو۔"

"انھوں نے جو کچھ بھی کیا سب مائیں ہی کرتی ہیں اپنی اولاد کے لیے۔"

"لیکن تم جوان کے ساتھ کر رہے ہو وہ کوئی بیٹا نہیں کر سکتا۔" خولہ کے لہجے میں پہلی بار اس کے لیے شدید ملامت تھی۔ عماد نے نفرت سے سر جھٹک دیا۔

"ماں تمہیں سارے جہاں میں جھوٹی اور پھپھی سچی لگتی ہیں۔ اگر اتنی سچی تھیں تو تمہیں بیٹے سے داماد کیوں نہ بنایا؟ جب پورے خاندان میں رشتے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں، دوسروں کو تمہارے حق میں رام کر رہی تھیں تو اپنی بیٹیوں سے کیوں نہ بیاہ ڈالا۔ اتنی محبت تھی تو بیٹیاں بیاہتے وقت وہ کہاں جا سوئی کہ بھتیجا دکھائی نہیں دیا۔؟ اس وقت انھیں تمہارا ادھورا پن جو نظر آ گیا ہوگا۔ پھر تم انھیں اپنی بیٹیوں کے قابل نہیں دکھے ہوگے۔ تم کیوں نہیں سمجھتے عماد کہ ان کی محبت دکھاوا اور مفاد پرست ہے۔" وہ اگر حقیقت کی بات کر رہا تھا تو اب وہ بھی آئینہ لیے کھڑی تھی جس میں اس کا سچ جھلکتا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ۔" وہ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"کیوں؟ اب سچ کڑوا لگ رہا ہے تمہیں جب خود پہ بات آئی تو۔ تم جانتے بھی ہو کہ امی نے پھپھو سے تہمینہ کے لیے بات کی تھی اور پھپھو نے۔" وہ ابھی بتانا ہی چاہتی تھی کہ عماد نے ہاتھ میں تھاما گلدان سامنے زمین پہ دے مارا۔

"کہانا بند کرو اپنی بکواس۔ پھپھو اور ان کی فیملی کے خلاف ایک لفظ بھی مت کہنا۔ جب تم کچھ جانتی نہیں ہو تو۔"

"جانتے تو تم نہیں ہو عماد! اور جس دن جان جاؤ گے، پچھتاؤ گے۔" یہ ان کے درمیان ہونے والی پہلی شدید تلخی، پہلا جھگڑا تھا جو اگلی صبح تک ہی جاری رہ پایا تھا۔ صبح ہوتے ہی خولہ نے عماد سے از خود معافی مانگ لی تھی کیونکہ وہ کسی کے لیے اپنے رشتے کو داؤ پہ نہیں لگا سکتی تھی۔ عماد بھی بغیر کچھ جتائے، نخرے دکھائے مان گیا تھا۔ اس روز کے بعد سے ان دونوں کے مابین کبھی اس بات پہ کوئی بحث نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

عماد کا بائیک ہر دوسرے روز خراب ہو جاتا تھا۔ ایسے میں وہ بھیا سے گاڑی مانگتا تو سو سو باتیں بھابھی کی سنتا۔ وہ خاموش رہتا اور خولہ اندر ہی اندر نادم۔ مہینے کے اختتام سے پہلے ہی وہ اپنی باقی ماندہ تنخواہ گن رہا ہوتا جو باقی دنوں سے بھی کم ہوتی۔ ایسے میں وہ بائیک بھلا کہاں سے ٹھیک کرواتا۔ ہر بار اگلے مہینے پہ اس کام کو چھوڑ دیتا اور اگلے ماہ وہ باقی اخراجات پورے کرتے کرتے پھر سے اس کام کو نہ کر پاتا۔

خولہ نے یہ سب خاموشی سے دیکھتے رہنے کے بعد ایک رات ایک بھاری رقم کا چیک عماد کے حوالے کیا تھا۔ یہ اس گاڑی کی رقم تھی جو وہ خریدنے جا رہی تھی۔ اپنی تمام تر سیونگز اس نے اپنے شوہر کے ہاتھ پہ رکھ دی تھی۔



"سب کچھ تم ہی کرو گی تو میں کیا کروں گا خولہ۔ کچھ مجھے بھی کرنے دو۔"

"تم اتنا کچھ تو کرتے ہو میرے لیے۔ اس گھر کے لیے۔ کچھ میں نے کر دیا تو کیا ہوا؟" گاڑی اس نے اپنے اور عماد کے استعمال کے لیے لی تھی۔ اس سے پہلے گھر میں کھڑی گاڑی بڑے بھیا کے استعمال میں تھی۔ ضرورت کے وقت ان سے مانگنا تو عماد ہی تھا لیکن عزت نفس خولہ کی مجروح ہوتی۔ اگلے دن ہی نئی گاڑی تو آ گئی تھی لیکن اس کے بنک اکاؤنٹ میں اب تین ہزار باقی بچے تھے۔

"تم نے گاڑی خرید لی اچھا کیا، لیکن گاڑی اپنے نام تو کروا لیتیں خولہ۔ یہ تمہاری زندگی کی آخری بچت تھی جو تم نے لگا دی اور جو خریدا وہ شوہر کے نام کر ڈالا۔ تم کس قدر احمق ہو۔" فروا نے اس کے اس اقدام کو ناپسند کیا تھا۔

"میں گاڑی اپنے نام لگواتی تو کیا عماد کو نہ لگتا کہ میں اس پہ اعتبار نہیں کرتی۔ ایسی بے اعتباری دکھا کر میں اپنے رشتے کو کیسے بے اعتبار کر سکتی تھی۔ چیزیں اہم نہیں ہوتیں، رشتے اہم ہوتے ہیں۔" اس نے بڑی نرمی سے وضاحت تو دے دی لیکن اندر کہیں سے وہ ڈر بھی گئی تھی۔

"گاڑی عماد نے چلانا ہے تو اسی کے نام ہونا چاہیے۔" اس نے ماں کے گھر سے لوٹتے خود کو تسلی دی تھی۔ اس کی دیگر اشیاء کی طرح وہ بھی اس کے کم اوروں کے مصرف میں زیادہ رہی۔ بڑے بھیا نے گھر میں ایک اور گاڑی آتے دیکھ کر اپنی گاڑی بیچ ڈالی۔

"دو گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ کہاں تھی یار۔ بڑے بھیا کو یوں بھی کبھی کبھار ہی تو گاڑی چاہیے ہوتی ہے۔" یہ عماد سے کہیں زیادہ بڑے بھیا کی زبان تھی جو بولی جا رہی تھی۔ وہ لڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ اس بات پہ عماد سے خفا ضرور ہوئی تھی۔ اس نے روز روز کی چخ چخ سے بچنے کے لیے ہی عماد کو گاڑی لے کر دی تھی اور روزانہ کی چخ چخ اب بھی وہیں تھی۔ کبھی گاڑی عماد کے پاس تو کبھی بھیا کے پاس۔

"میں نے وہ گاڑی ہمارے لیے لی تھی عماد۔ اس لیے نہیں کہ تم بعد میں بھی بائیک کی خرابی پہ روتے ہی رہو گے۔" اتنی رقم لگا دینے کے باوجود مسئلہ وہیں کا وہیں تھا۔ اس کا غصہ کرنا تو جائز تھا۔ عماد کتنی دیر اسے مناتا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن ایک شرط پہ کہ تم مجھے باہر جا کر نہیں تو گھر پہ رہ کر کام کرنے کی اجازت دے دو۔ میں گھر بیٹھ کر آن لائن وہی کام کر سکتی ہوں جو میں باہر جا کر کیا کرتی تھی۔ کیا یہ بھی تمہیں نامنظور ہے؟" اس نے کبھی اپنی مرضی کی شرط رکھی تھی اس بار۔ عماد سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن جلد ہی مان بھی گیا۔

"تم گھر بیٹھ کر جو بھی کرنا چاہو تم کر سکتی ہو بس گھر سے باہر نہیں جاؤ گی۔" خولہ نے مسکراتے، بہت کچھ سوچتے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

شروع شروع میں ملنے والے پروجیکٹس چھوٹے تھے سو وہ گھر کے کاموں کے ساتھ انھیں جلدی نبٹا لیتی تھی لیکن پھر اس کے کام اور صلاحیت کے مطابق کمپنی نے اسے بڑے پروجیکٹ دینے شروع کر دیے جو وہ بطور ٹیم ممبر کے کرنے لگ گئی تھی۔ اس کے ساتھ دیگر کچھ انجینئرز بھی شامل ہوتے تھے۔ پروجیکٹ کی باریکیاں، خامیاں، خوبیاں، مختلف زاویے وہ سب مل کر اسکائپ پہ گروپ ڈسکشن کی صورت میں ڈسکس کیا کرتے تھے۔ اب وہ عموماً کمرہ بند کیے بیٹھی رہتی۔ گھر کے کام اکثر اس سے رہ جاتے جنھیں بانو بیگم بنٹا لیتی تھیں لیکن عماد اس بات سے چڑتا تھا۔

"تم میری بیوی ہو، میرے کام تمہیں کرنے چاہئیں خولہ۔"

"تمہارے جوتے پالش کرنے سے لے کر کپڑے دھونے تک کے کام تو میں کرتی ہوں اور کیا کروں؟"

"تم اب کچن کا کوئی کام نہیں کرتیں۔"

"کچن اس گھر کے سب لوگوں کا مشترکہ ہے، صرف میں ہی کیوں کروں۔" اسے اعتراض تھا۔

"لیکن میں تمہارے ہاتھ کا پکا کھانا چاہتا ہوں، بھابھی یا امی کے ہاتھ کا نہیں۔" وہ بری طرح چڑ رہا تھا۔

"تمہیں جو بھی کھانا ہو مجھے بتا دیا کرو، میں بنا دیا کروں گی۔" اس نے اپنے تئیں بات ختم کرنا چاہی لیکن وہ بات بڑھانے کے موڈ میں تھا۔

"پہلے تو تم ایسے نہیں کہا کرتی تھی، پہلے تو تم میرے کہے بغیر سب بنا دیا کرتی تھی۔"

"کیونکہ پہلے میں یہ کام نہیں کر رہی تھی جواب کر رہی ہوں۔"

"اسی لیے میں تمہارے کام کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ تم یہ کام کر کے مجھ پہ احسان نہیں کر رہی خولہ۔ یہ کام تم اپنی مرضی سے کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں مجبور نہیں کیا۔" خولہ کو اس کی بات پہ غصہ آ گیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو کہ یہ کام میں اپنی مرضی سے کر رہی ہوں لیکن کیوں کر رہی ہوں؟ محض اپنے لیے تو نہیں کر رہی نا۔ اس گھر میں دن بدن ضروریات بڑھ رہی ہیں، آمدن نہیں۔ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر روتے رہنے سے، مجھے کچھ کرنا زیادہ بہتر لگتا ہے۔ میں عمل اور محنت پہ یقین رکھتی ہوں۔ مجھے وہی سب کرنے دو۔ اسے خواہ مخواہ انا کی جنگ مت بناؤ۔" عماد جواباً خاموش رہا تھا۔ اور اسے عماد کی خاموشی بری طرح چبھی تھی۔

"تمہارے آنے سے پہلے میں اپنے سب کام ختم کر لیتی ہوں کیونکہ تمہارے آنے کے بعد میں تمہیں وقت دینا چاہتی ہوں۔ اس سب میں اگر تم نظر انداز ہوئے ہو تو کہو۔ کچن کے تھوڑے بہت کام میں کر دیتی ہوں، باقی امی یا بھابھی کے کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ مکمل ہاؤس وائف ہیں۔ اتنا تو کر ہی سکتی ہیں۔ مجھے کچھ تو مارجن دو عماد۔ میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں ہمارے لیے، اس گھر کے لیے ہی کر رہی ہوں۔ ورنہ گھر بیٹھ کر، ملکہ بن کر شوہر کی آمدن کھانا کس عورت کو برا لگتا ہے۔" عماد اب بھی خاموش رہا تھا، بس اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا اور خولہ کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ قائل ہو گیا ہے۔

☆☆☆

اس کے کام کے سبب گھر میں پیسہ آتے ہی حالات بدلنے لگے تھے۔ پہلے جو ذرا ذرا سی پچتوں کے لیے بھاگ دوڑ کی جاتی تھی اب کھل کر اتنا خرچ کیا جاتا کہ اسراف نہ سہی لیکن کنجوسی کے مدار سے بھی باہر نکل چکے تھے۔ ماما کے گھر جیسا بھلے نہ سہی لیکن کسی حد تک ان کے قریب قریب کا ہی، ان کا معیارِ زندگی بلند ہوا تھا۔ ایک تنگ تاریک گھٹن زدہ مکان سے اٹھ کر وہ سب اب کھلے مکان کے دو پورشن والے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے اور یہ سب خولہ کی وجہ سے ممکن ہو پایا تھا۔

"تم اس گھر کے لیے نعمت بن کر آئی ہو۔" بانو بیگم اسے اٹھتے بیٹھتے دعائیں دیتیں۔

"کاش کہ میں ایک نعمت آپ کے لیے بھی ثابت ہو جاؤں۔" وہ انہیں دیکھ کر دل ہی دل میں کہتی۔

اس نے فی الحال اتنا کیا تھا کہ بانو بیگم کی سلائی کڑھائی والا سارا کام چھڑوا دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی بینائی ویسے بھی کمزور ہو چکی تھی اور ساری زندگی لیدر فیکٹری میں کام کرنے سے ہاتھ سلائیاں لگا لگا کر خود پھٹ چکے تھے۔ اسے ان پہ ہمیشہ سے ترس آتا تھا۔ جس عورت نے ایک مشکل زندگی گزاری تھی، اسے بڑھاپے میں کوئی سکھ تو ملنا چاہیے تھا۔ اتنا تو وہ حق رکھتی ہی تھی۔

"تم نے بچوں کے مستقبل کے لیے اتنا کچھ کیا۔ کون اس دور میں کسی کے بچوں کے لیے اتنا سوچتا ہے۔" بھابھی نے ممنون ہوتے ہوئے اس سے اپنا رویہ دوستانہ کر لیا تھا۔ اب وہ اس کے بیشتر کام بھی خاموشی اور خوشی سے کر دیا کرتی تھیں پہلے جن کاموں پہ وہ سو باتیں سنایا کرتی تھیں۔ وہ ہر وقت لیپ ٹاپ میں گھسی کیا کرتی رہتی ہے اب انہیں



سمجھ میں آ رہا تھا جب ہاتھ میں پیسہ آ رہا تھا۔ جو جواب وہ نہیں دے سکتی تھی اس کا کمایا پیسہ دے رہا تھا اور بخوبی دے رہا تھا۔

گھر کے حالات بدل گئے تھے یہ تو ہر کسی کو دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی ازدواجی زندگی کے حالات بھی بدل رہے تھے یہ نہ ان دونوں کو دکھائی دیا اور نہ ہی کسی دوسرے کو۔ وہ اب اکثر کام کی زیادتی کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر پاتی تھی جس کی شکایت وقتاً فوقتاً عماد کرنے لگا تھا۔

"آج بھی تم میرے کپڑے استری کرنا بھول گئی ہو خولہ۔" وہ وارڈ روب میں سارے غیر استری شدہ کپڑوں کو دیکھتے ہوئے جتانے لگا۔

"زیادہ مصروف تھی تو ذہن سے نکل گیا۔ آج خود کر لو، کل کر دوں گی۔" وہ ہنوز اپنے لیپ ٹاپ پہ کام کرتی معذرت خواہ تھی۔

"اگر مجھے اپنے کام خود کرنا تھے تو میں نے شادی کیوں کی خولہ؟" خولہ اس بات پہ کچھ دیر کو خاموش رہی پھر لیپ ٹاپ ایک طرف رکھ کر اٹھنے لگی۔

"رہنے دو، میں پہلے بھی خود کرتا تھا اب بھی کر سکتا ہوں۔" وہ تب تک اپنے کپڑے لے کر کمرے سے جا چکا تھا۔

"تم نے ایک عرصے سے میرے لیے کچھ بنایا نہیں ہے۔" اس رات کھانے کی میز سے وہ بھوکا اٹھ گیا تھا کیونکہ وہ بینگن کی ترکاری ناپسند کرتا تھا۔ خولہ کھانے کی میز پہ موجود نہیں تھی۔ اس کے ایک سینئر انجینئر کی کال آ گئی تھی۔ وہ فون سننے چلی گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح بانو بیگم نے اس کے لیے کباب فرائی کر دیا تھا جسے وہ کھائے بنا اٹھ گیا تھا۔ زیادہ غصہ خولہ پہ تھا جس نے اس کے لیے کچھ الگ سے نہیں بنایا تھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ اب تمہیں میری کسی بات کی پروا نہیں رہی۔" وہ طعنے مارتا ہوا منہ دوسری طرف کر کے لیٹ گیا تھا۔ خولہ اس کے لیے خود سے کھانا بنا کر لائی بھی تھی لیکن اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

"جو باتیں احساس دلا کر یاد کروائی جائیں، ان کا ہونا نہ ہونا میرے لیے معنی نہیں رکھتا۔"

وہ خود کو روز بھول جانے والے کاموں پہ سرزنش کرتی لیکن اگلے روز پھر سے کوئی نہ کوئی کام بھول جاتی۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ اس کا ذہن کام کی زیادتی سے بٹ جاتا ہے۔ وہ کام پہ دھیان دیتی ہے تو کسی نہ کسی ذمہ داری سے چوک جاتی ہے اور ذمہ داریاں پوری کرنے پہ آئے تو کام رہ جاتا ہے۔ شروع شروع میں عماد اسے یاد دلاتا شرمندہ کرتا تھا پھر اس نے ایسا کرنا بھی چھوڑ دیا۔

بظاہر سب معمولی باتیں تھیں لیکن معمول کو متاثر کر رہی تھیں۔ اب وہ پہلے کی نسبت ساتھ میں کم وقت گزارتے تھے، کم کم باہر جاتے تھے، ان میں کسی بھی معاملے کو لے کر کم ڈسکشن ہوتی تھی اور تو اور ان کے ساتھ سونے کا جو ایک معمول تھا وہ تک بدل گیا تھا۔ جب تک خولہ اپنا کام نبٹا کر فارغ ہوتی، عماد اس کا انتظار کرتے کرتے سو چکا ہوتا۔ ایک فاصلہ تھا جو بڑھ گیا تھا۔

پیسہ ضرب ہوا تھا لیکن وقت تقسیم ہو گیا تھا۔ اس گھر کا معیارِ زندگی بلند ہوا تھا تو ان دونوں کی ازدواجی زندگی کا معیار بہت نیچے گر گیا تھا۔ اس بات کا جب تک اسے احساس ہوا تھا، وقت اور فاصلہ خاصا آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

تہمینہ سے چھوٹی ندا کی منگنی دو سال رہنے کے بعد ٹوٹ گئی تھی۔ اس بات پہ پھپھو نے رو رو کر خود کو ہلکان کر ڈالا تھا۔ عماد کے فون کرنے پہ بھی وہ اس قدر روئیں کہ اسی شام عماد آفس سے سیدھا ان کے ہاں چلا گیا۔ پھپھو روتے ہوئے اس سے ندا کے سسرالیوں کے لالچی پن کا تذکرہ کر رہی تھیں جو جہیز میں اعلا ترین فرنیچر، بھاری زیور کے ساتھ ساتھ گاڑی کا بھی مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ بیوہ خاتون جب ان کے مطالبات پورے کرنے سے انکاری ہوئیں تو وہ منگنی توڑ کر چلتے بنے۔ عماد پھپھو اور ندا کے لیے رنجیدہ تھا لیکن وہ بھلا کیا کر سکتا تھا۔ اس نے تسلی

کے دو بول بولے اور چلا آیا۔

پھر وہ ہر دوسرے روز پھپھو کے ہاں بلا ناغہ جانے لگا تھا۔ شادی سے پہلے بھی وہ ہفتے کے دو چکر لازمی لگا آتا تھا۔ یہ تو شادی کے بعد خولہ اس کی دوپہر سے منتظر بیٹھی ہوتی تو وہ سیدھا گھر چلا آتا تھا۔ اب جب خولہ نے خود کو مصروف کر لیا اور وہ پہلے کی طرح اس کی منتظر بھی نہ ہوتی، نہ ہی پہلے کی طرح سج سنور کر اس کا استقبال کرتی تو اس کا گھر جانے کا من ہی نہ کرتا۔ کبھی ایک دوست کی طرف چلا جاتا تو کبھی دوسرے کے۔ کہیں بس نہ چلتا تو پھپھو کے ہاں چلا آتا۔ پھپھو تو یوں بھی ہمیشہ کی طرح اس کے صدقے واری ہوئے جاتیں اب اس کے بدلے حالات دیکھ کر خدا بھی اس کے آنے پہ اس سے ہلکی پھلکی بات چیت کرنے بیٹھ جاتی۔

"وقت ملتا ہے تو اس مظلوم لڑکی کو تھوڑا باہر گھما لایا کرو۔ جب سے رشتہ ٹوٹا ہے بستر سے لگ کر بیٹھ گئی ہے۔" اور پھپھو کا فرماں بردار بھتیجا ان کی بیٹی کو 'تھوڑا' نہیں 'کافی' گھمانے لگا تھا۔ کبھی کہیں سے شاپنگ کروا دیتا اور کبھی ڈنر پہ لے جاتا۔ پھپھو کی وہ مظلوم بیٹی اب اپنے پہ کیے جانے والے ظلم کے گرداب سے نکل کر کسی اور عورت پہ ظلم ڈھانے کے درپے ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ ان دونوں میں دوستی بڑھنے لگی تھی۔ اب وہ گھر آ کر بھی اس سے موبائل پہ بات کرنے لگا تھا۔ باقاعدگی سے اس کا حال احوال پوچھتا، اس نے کھانا کھایا ہے یا نہیں، وہ ٹھیک سے سوئی ہے کہ نہیں، وہ کچھ الٹا سیدھا سوچتی تو نہیں رہتی، اسے کسی شے کی ضرورت تو نہیں ہے، وہ خود کو اکیلا محسوس تو نہیں کرتی۔ ایسی بہت سی باتیں انھیں ایک دوسرے سے قریب کرنے لگ گئیں کیونکہ اب عماد سے ایسی باتیں کرنے والی ہو کر بھی نہیں تھی۔ رات گئے تک وہ دونوں میسجنگ کرتے رہتے اور جب کبھی وہ ایک نظر خولہ پہ ڈالتا وہ اسے یوں اپنے کام میں مصروف دکھائی دیتی جیسے شکر کرتی ہو کہ عماد اس پہ طنز کرنے کے بجائے کسی جانب تو مصروف ہوا۔ ان دنوں وہ ایک بہت بڑے پروجیکٹ پہ کام کر رہی تھی جس کے متعلق اس نے عماد کو سرسری سا بتایا تھا۔

"جانتے ہو اس پروجیکٹ کی جب پے منٹ آئے گی تو کیسے ہماری قسمت بدل جائے گی۔" اور عماد نے بھی ہولے سے مسکرا کر سر ہلا دیا تھا۔ وہ اگر اس کی طرح بہت پرجوش نہیں ہوا تھا تو ناخوش بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کی اس بات پہ قسمت ضرور مسکرائی تھی اس نادان عورت اور شوہر سے بے خبر بیوی پر جو واقعی نہیں جانتی تھی کہ اس کی قسمت بدلنے والی ہے۔ جس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی، نہ ہی کبھی پوچھا کہ وہ اب دیر سے گھر کیوں لوٹنے لگا ہے۔ وہ اتنی دیر تک کس سے موبائل پہ لگا رہتا ہے۔ ایسے کون سے اس کے دوست پیدا ہو گئے ہیں جن سے وہ اب کالز پہ لمبی لمبی باتیں کرتا ہے۔ بیویوں کو سب کچھ ہونا چاہیے بس اندھا نہیں ہونا چاہیے۔ یہیں اس سے غلطی ہوئی تھی کہ کام کی دھن میں وہ اندھی بن گئی تھی۔

اب وہ اس سے سوال بھی نہیں کرتی تھی کہ وہ اس سے مطمئن ہے، اس کے ساتھ سے خوش ہے، وہ ایک آئیڈیل بیوی ہے کہ نہیں۔ شاید وہ پوچھ لیتی تو وہ کہہ بھی دیتا کہ اب وہ اس سے مطمئن ہے نہ ہی خوش کیونکہ وہ سب اچھے سے نبھاتے نبھاتے سب کچھ ہی نبھانا بھول گئی ہے۔

وہ دن رات بس اپنے پروجیکٹ کو مکمل کرنے کی فکر میں گھلے جا رہی تھی۔ وہ پروجیکٹ جو اسے پیسے، مرتبے، آسائشوں سے قریب کرتا، شوہر، محبت اور آسودگی سے دور کر رہا تھا۔ ایک شے دوسرے کا نعم البدل ثابت ہو رہی تھی۔

☆☆☆

پروجیکٹ کی تکمیل اسے نہ صرف معاشی اعتبار سے اوپر لے آئی تھی بلکہ اس کے لیے اس سے بھی کہیں گنا بہتر کام کے مواقع ساتھ لائی تھی۔ اس نے عماد کو بتائے بنا ایک پوش علاقے میں عماد کے نام ایک فلیٹ بک کروایا تھا۔ اسے جلد ہی قبضہ مل گیا تھا



ادائیگی اقساط وہ ساتھ ساتھ ادا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے یہ بات عماد سے وقتی طور پہ چھپائی تھی۔ وہ اپنی شادی کی دوسری اینی ورسری پہ اسے بطور تحفہ فلیٹ کے پیپرز دے دینا چاہتی تھی۔ وہ تصور میں ہی عماد کو خوش ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اس نے بانو بیگم سے اس خوشی کو بانٹنا تھا۔ جواباً وہ خاموش رہی تھیں۔

"مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ آپ کو اس خبر سے اتنی خوشی نہیں ہوئیں جتنا میں چاہتی تھی۔"

"اس بات پہ خوش ہوں کہ تم نے ایک بڑی کامیابی پائی ہے لیکن کیا تمہیں نہیں لگتا کہ اس سب میں تم کچھ بھول رہی ہو؟" وہ بانو بیگم کی اس بات پہ الجھ گئی تھی۔ اس نے ناسمجھی سے شانے اچکائے جیسے وہ ان کی بات کا حوالہ نہ سمجھ پائی ہو۔

"عماد کو۔" خولہ نے ساس کی بات پہ ایک لمحے کو سانس رکتا پایا تھا۔

"آپ کھل کر کہیں جو کہنا چاہتی ہیں۔"

"ایک عرصے سے میں تم دونوں کے درمیان در آنے والے فاصلے کو محسوس کر رہی ہوں پھر کیسے ممکن ہے کہ تمہیں یہ محسوس نہ ہوا ہو۔"

وہ ان کی بات پہ مسکرا دی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ اسے خود بھی کھوکھلی لگی تھی۔

"میں مصروف تھی، اسے وقت نہیں دے پائی اس لیے آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔ یہ سب میں اس گھر کے لیے، عماد کے لیے ہی تو کر رہی ہوں ورنہ ہم اب بھی پہلے جیسے ہیں امی۔ پہلے کی طرح ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے اور ایک دوسرے کی پروا کرتے ہیں۔" اب بانو بیگم اس کی بات پہ یوں مسکرائی تھیں جیسے انھیں اس کی تاویل بچکانا لگی ہو۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تمہیں ایک بار خود سے پوچھنے کی ضرورت ہے کہ اب بھی تم دونوں پہلے جیسے ہو یا نہیں؟" ان کے سوال پہ اس کے چہرے کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔

"تم وہی غلطی دہرا رہی ہو جو مجھ سے ہوئی۔ زمانے بھی جو کیا اس گھر کے لیے کیا، اپنے بچوں کے لیے کیا لیکن عماد کبھی اس بات کو سمجھ نہیں سکا۔ نہ ہی سمجھنے کو تیار ہے۔ وہ یکطرفہ فیصلہ کر چکا ہے جس میں مجرم سراسر میں ہوں۔ تم مجھ سے سوال کرتی تھیں کہ میں نے اسے کیسے گنوا دیا۔ اب یہی سوال خود سے کیے جانے کی نوبت مت لاؤ۔ سنبھل جاؤ۔"

"کیا عماد اس سب سے خوش نہیں ہوگا؟ کیا وہ کبھی سمجھ نہیں پائے گا کہ یہ سب میں نے اس کی محبت میں کیا۔ اس کی آسانی، اس سے جڑے رشتوں کے لیے اتنی محنت کرتی رہی۔ اس سب میں میری کوئی خواہش نہیں تھی۔"

"وہ اتنے سالوں میری محنت، میری محبت کو سمجھ نہیں سکا تو تمہاری کیا سمجھے گا۔ عماد ان مردوں میں سے ہے جو عورت کے ہر روپ میں اس سے توجہ چاہتا ہے، وقت چاہتا ہے، پیسہ نہیں۔۔ اپنے اور اس کے بیچ اس ایک شے کو اس طرح سے مت حائل کرو جس طرح سے کوئی خلیج حائل کر دیتا ہے۔" خولہ کی اس روز کی ساری خوشی رخصت ہو چکی تھی۔ وہ روایتی بیوی سے ایک پیشہ ور انجینئر بن کر رہ گئی تھی اسے ابھی ابھی یہ احساس ہوا تھا۔

اس نے عماد کے معمولات پہ غور کرنا شروع کیا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ عماد رات کو اکثر دیر سے گھر آنے لگا تھا یہ اب اس نے غور کیا تھا۔ وہ اکثر کھانا بھی باہر سے کھا کر آنے لگا تھا اسے اب احساس ہوا تھا۔ وہ رات گئے تک موبائل پہ میسجنگ کرتا رہتا تھا اسے اب نظر آیا تھا۔ وہ رات میں اٹھ کر کمرے سے باہر جا کر کسی سے فون پہ بات کرتا تھا اسے اب ہوش آیا تھا۔ اس کے لہجے، انداز میں اس کے لیے پہلے سی گرمائش اور توجہ معدوم ہو چکی تھی اسے اب دکھائی دیا تھا۔ بیوی کو سب کچھ ہونا چاہیے مگر اندھا نہیں۔ یہی اس سے بڑی غلطی ہوئی تھی۔

ان دونوں کے درمیان، دلوں کے درمیان ایک ان دیکھا فاصلہ آ چکا تھا۔ بانو بیگم ٹھیک کہتی تھیں، جو غلطی ان سے ہوئی، اس نے بھی وہی دہرائی۔ حالات بہتر بنانے کے لیے وہ دوسری بانو بیگم بن گئی

تھی جس نے اپنا اور عماد کا رشتہ اپاہج کر ڈالا تھا۔ اب وہ کیا کرتی، ماتم مناتی یا خود پہ ملامت کرتی۔ کیا وہ اس سے پوچھتی کہ وہ کیوں بدل گیا ہے، اس کے معمولات کیوں بدل گئے ہیں؟ کیا ان دونوں کے درمیان کوئی اور آ گیا ہے؟ کیا ایک شے جو اس نے اپنے شوہر سے مانگی تھی، وفا۔ وہ اسے دیتے دیتے تھک گیا ہے یا اس نے خود ہی اسے گنوا دیا ہے۔

اور وہ کیا کہے گی جب وہ اسے اس کی غفلت یاد دلائے گا۔ اس سے سوال پوچھے گا تو کیا جواب دے گی؟

عماد کو بتائے بنا اس نے رات کی تاریکی میں اس کا موبائل چیک کیا تھا۔ اس کا واٹس ایپ، میسجنگ سب ندا کے نام سے جگمگا رہے تھے۔ بہت سے میسج جو اسے سمجھ میں نہیں آئے اور بہت سے شاید ڈیلیٹ کر دیے گئے۔ بہت کچھ واضح اور بہت کچھ مبہم تھا۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی عماد۔" ندا کا محبت بھرا پیغام۔

"میں بھی۔" اور ان دو لفظوں نے اس کا سانس لینا مشکل بنا دیا تھا۔

وہ اندھی نہیں تھی کہ دیکھ نہ سکتی کہ یہ ان دونوں کی دوستی نہیں تھی، اس سے کہیں گنا بڑھ کر تھا۔ اس کا شوہر کسی اور عورت کا محبوب بنا بیٹھا تھا۔ واحد شے جو اس نے اپنے شوہر سے مانگی تھی وہ اسے کھو چکی تھی۔ کھو چکی تھی کیونکہ وہ اسے کسی اور کے لیے وقف کر چکا تھا۔ اب وہ کیا کرے، اس سے جرح کرے، کچہری لگائے، سوالات کرے، جوابات اکٹھے کرے۔ وہ کیا کہے گا، کیا جواب دے گا۔ اسے کیا الزام دے گا، اس کی مصروفیت، محبت، عزم۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا قابل جرم گناہ نہیں تھا کہ وہ ایسی بڑی سزا اسے سناتا۔ اس کی ساری محبت اور قربانی کا اسے یہ صلہ دیتا۔ وہ مجرم ہی سہی لیکن ایسی سزا کی حق دار کبھی نہیں بنتی تھی۔

تو خولہ عماد اپنی ساری محبتوں، محنتوں کے باوجود ایک دوسری عورت کے ہاتھوں شکست کھا چکی تھی۔ اپنے سارے مسائل ہمت سے حل کرنے کا عزم کرتی اب وہ کہاں سے اس مسئلے کے حل کے لیے ہمت لائے گی؟ ایک لمحہ میں بننے والا رشتہ ایک لمحے کی مار ہی ہوتا ہے۔

اس کا موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھی وہ سسک رہی تھی جب عماد کی آنکھ کھلی۔ وہ اس کے برابر میں نہیں لیٹی تھی۔ اس کی سسکیوں کی آواز بستر کی پائنتی کی طرف سے آ رہی تھیں۔ عماد نے سائیڈ لیمپ آن کیا۔ وہ وہیں نیچے کارپٹ پہ بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے عماد کا موبائل کھلا پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دماغ بالکل سن ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈز لگے تھے اسے سمجھنے میں، سب جان لینے میں کہ وہ سب جان گئی ہے۔ وہ بستر سے اتر کر اس کے برابر آ بیٹھا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔ اس کی آہٹ پہ بھی چونکی نہ تھی۔

"خولہ۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی زخم خوردہ آنکھوں کا کاجل پھیل کر پورے چہرے کو سیاہ کر گیا تھا بالکل ویسے ہی جیسے عماد کی بے وفائی ان کے رشتے کو سیاہ کر گئی تھی۔

"کیوں کیا ایسا عماد؟ ایسا کیوں کیا؟ میری محبت، قربانی کہیں بھی نہیں دکھائی دی تمہیں۔ دو سال کے ساتھ کے بعد ایسی دھتکار۔ ایسی تذلیل۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بہ مشکل بول پا رہی تھی۔ عماد سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"میں تمہیں بتا دینا چاہتا تھا لیکن۔"

"میں تمہارے خاندان کے لیے، تمہارے لیے، ہماری محبت کے لیے یہ سب کرتی رہی اور تم میری پیٹھ پیچھے یہ سب کرتے رہے۔ کسی دوسری عورت سے چکر چلاتے رہے۔ میرے حصے کی وفا، خوشیاں، محبت کسی اور کو دیتے رہے۔" اب کی بار وہ بری طرح چلائی تھی۔

"آواز نیچی رکھو۔ سب سو رہے ہیں، تماشا مت بناؤ۔" وہ اس کا بازو دبوچ کر بولا تھا۔ اس کے



بازو میں درد ہوا تھا لیکن اس سے کم جو اس کے دل میں ہوا تھا۔

"تو بن جائے تماشا۔ تم نے میرا، میری زندگی کا تماشا تو بنا ہی دیا ہے۔ اب اور کیا تماشا بنے گا۔" وہ اسی طرح چلائی۔

"ہاں تو بناؤ تماشا۔ تمہیں شوق ہے نا خود کو مظلوم بنا کر دکھانے کا تو کرو یہ سب۔ میں جو سمجھانا چاہ رہا ہوں تم سننے کو تیار ہی نہیں ہو۔ بھاڑ میں جاؤ پھر تم اور جو سوچنا ہے سوچو۔ رودو، چلاؤ، ماتم مناؤ لیکن یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" وہ غصے سے پاگل ہوتا اسی کے انداز میں چلایا تھا۔ اپنا موبائل اٹھایا اور لنگڑاتا ہوا واپس بستر پہ چلا گیا تھا۔ باقی ساری رات وہ اس کی سسکیاں سن کر کروٹ بدلتے بدلتے سو گیا تھا اور وہ نیچے کارپٹ پہ بیٹھے ساری رات روتی اور جاگتی رہی تھی۔

اگلی صبح جب وہ جاگا تو خولہ اس کے کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی جا چکی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی ہے۔ اس نے ہانو بیگم سے کسی قسم کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن دو روز بعد اس کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا جب قدسیہ کی اس کے موبائل پہ کال آئی تھی اور وہ شکایت کر رہی تھیں کہ خولہ کا فون دو روز سے بند جا رہا ہے۔

"خولہ کہاں گئی پھر؟ کہاں ڈھونڈے اس بے وقوف لڑکی کو؟" وہ انھیں جھوٹی کہانی سنا کر مطمئن کر چکا تھا لیکن خود بے سکون ہو گیا تھا۔

پھر جہاں جہاں ممکن تھا وہ اسے ڈھونڈ چکا تھا، اس کی سہیلیوں کے ہاں، رشتے داروں کے ہاں۔ لیکن اس طرح کہ کسی کو شک بھی نہ گزرے کہ خولہ کہیں چلی گئی ہے اور وہ اسے تلاشتا پھر رہا ہے۔ وہ پریشان تھا کہ جو بھی تھا وہ اس کی بیوی تھی۔ دو سال کا ساتھ رہا تھا ان کا۔ ہزار شکوے سہی لیکن وہ کم از کم اس سے نفرت تو بالکل بھی نہیں کرتا تھا کہ اسے اس کی پروا نہ ہوتی۔

ان دنوں وہ ندا سے بھی ملنے نہیں جا رہا تھا۔ نہ ہی پہلے کی طرح اس سے فون پہ بات کرتا تھا۔ وہ کال کرتی تو اٹھاتا نہیں تھا، اٹھاتا تھا تو جلد بند کر دیتا یا بہانہ بنا کر کاٹ دیتا۔ زندگی عجیب جمود کا شکار ہو چکی تھی۔ اسے خولہ کی غیر موجودگی بری طرح سے کھل رہی تھی۔ اسے اس لڑکی کی اپنے کمرے میں، گھر میں، زندگی میں عادت ہو چکی تھی۔ یک دم اس کا جانا جیسے اسے ادھورا کر گیا تھا۔

"مجھے تمہاری اتنی عادت ہو چلی ہے کہ اب جب تم اپنی امی کے ہاں جانے کی بات کرتی ہو نا تو میرا دل ڈوب جاتا ہے۔" اس کی اس محبت پہ وہ مان سے کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ اب وہ کتنے مزے سے اس کے بغیر اتنے دن گزار چکا تھا۔

"میں تمہارے لیے اتنا کچھ کرنا چاہتی ہوں عماد کہ تم حیران رہ جاؤ اور پوچھو کہ خولہ کیا تم مجھے اتنا چاہتی ہو۔" شروع میں جب وہ کام کر کے تھک جاتی تو اس تھکن زدہ مسکراہٹ میں بھی وہ نئے عزم سے کہتی اور اب وہ واقعی اس کے لیے اتنا کچھ کر چکی تھی کہ وہ اس اتنے کچھ سے ہی اکتا گیا تھا۔ کاش وہ اس کے لیے اتنا کچھ نہ کرتی بس اک محبت ہی کرتی۔ وہ اتنے کچھ کا نہیں اس کی محبت اور توجہ کا عادی تھا۔ وہی محبت جو ہر وقت خولہ کو اس کے اردگرد باندھے رکھتی، ایک مدار میں گھمائے رکھتی۔ جو دن میں کتنی بار میسج کر کے بلاوجہ اس کا حال پوچھتی یہ یاد دلانے کی کوشش کرتی کہ وہ اسے کتنا یاد رکھتی ہے۔ اتنا کچھ کرنے کی دھن میں وہ یہ سب بھول گئی تھی جس کا اس نے عماد کو عادی بنا دیا تھا۔ عادی بنا کر اب چھوڑ دیا تھا۔

پھر اسے کارپٹ پہ بیٹھی وہ خولہ یاد آئی جو اپنا سب کچھ ہار چکی تھی اور اس سے پوچھ رہی تھی۔

"کیوں کیا ایسا عماد؟ ایسا کیوں کیا؟ میری محبت، قربانی کہیں بھی نہیں دکھائی دی تمہیں۔ دو سال کے ساتھ کے بعد ایسی دھتکار۔ ایسی تذلیل۔" ندا کے ساتھ بطور کزن ہمدردی دوستی میں بدلی اور پھر پسندیدگی میں۔ پہل بھی ندا کی جانب سے ہوئی تھی۔

وہ اسے کہتی تھی کہ وہ اسے چاہنے لگی ہے۔

"میں شادی شدہ ہوں ندا۔ ہمارے خاندانوں کو اور خولہ کو پتا چلے گا تو کیا ہوگا؟" وہ اسے سمجھاتا تھا لیکن وہ بے باک لڑکی صاف کہہ دیتی۔

"میں کسی خاندان سے نہیں ڈرتی اور خولہ سے تو بالکل بھی نہیں۔ وہ عورت تم سے محبت کرتی ہوتی تو تمہیں سنبھال کر رکھتی۔ میرے یا کسی اور عورت کے لیے یوں کھلا نہ چھوڑ دیتی۔" اور عماد کو یہی لگتا تھا کہ اسے ندا کی جانب دھکیلنے میں سارا عمل دخل خولہ کا ہے۔ نہ وہ اسے نظر انداز کرتی، اس سے بے پروا ہوتی نہ ہی وہ ندا سے قربتیں بڑھاتا۔ مرد جتنا بھی نادم ہو، اپنی غلطی اتنی آسانی سے نہیں مانا کرتا۔ وہ بھی نہیں مان رہا تھا کہ اس کا بھی سرے سے کوئی قصور ہے۔

☆☆☆

وہ اپنی اسی الجھن میں ایک شام پھپھو کے گھر جا نکلا۔ غم غلط کرنے، دکھ سکھ کہنے سننے۔ گیٹ کھلا ملا تو وہ سیدھا سیدھا اندر داخل ہو گیا۔ تہمینہ آئی بیٹھی تھی جس کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔

"کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ایک اپاہج انسان نہیں ہو سکتا، میرا بھی نہیں تھا، اسی لیے انکار کیا تھا اور اب یہ بے وقوف ندا بی بی اس سے محبت کرنے چلی ہیں۔" وہ عجیب طنز بھرے لہجے میں ماں بہن کو سنا رہی تھی۔

"اور آپ کیوں اسے اس اندھی کھائی میں گرتے دیکھ کر بھی خاموش بیٹھی ہیں اماں؟ سے کیا اس کے پاس سوائے بیوی کی کمائی دولت اور دی گئی آسائشوں کے؟ خولہ ہی تھی جو ایسے انسان اور خاندان کے لیے مان گئی۔ اعلا ظرف کہوں یا بے وقوف۔ لیکن تم نہ ہی اعلا ظرف ہو اور نہ ہی بے وقوف تو ایسی حماقت کیوں؟"

"نہ اعلا ظرف ہوں اور نہ ہی بے وقوف۔ کچھ سوچ کر ہی یہ بازی کھیل رہی ہوں۔ بیوی کا ہی سہی پیسہ لگا رہا ہے مجھ پہ، ہزار کام نبٹا رہا ہے۔ کاٹھ کا الو ہی سہی میرے تو کام کا گدھا ہے۔ میرے ہزار مسائل کا حل۔" یہ ندا تھی، اس سے محبت کا دم بھرنے اور اس سے چاہت کے دعوے کرنے والی۔ ایک مکروہ چہرے والی لڑکی جس کے فریب میں وہ اپنی باوفا بیوی سے بے وفا ہوا تھا۔

"یوں بھی آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں اس سے شادی کروں گی؟ انسان محبت بھی دیکھ کر کرتا ہے چہ شادی۔" وہ اک ادا سے ہنسی اور عماد کا دل ڈوب گیا۔

"ایک تو معذور، اوپر سے شادی شدہ۔ نہ اپنا گھر، نہ کام کی نوکری۔ اندھی ہوں جو اس جیسے سے شادی کر لوں۔ اس جیسے کیا اس سے بہتر بیٹھے ہیں رستے میں جنہیں میں منہ نہ لگاؤں۔" ایک زہر برسوں پہلے اس کی ماں نے اس کی رگوں میں اتارا تھا، ایک وہ اس لمحے اس کے اندر اتار رہی تھی۔ وہ کیسا زہر آگیں ہو گیا تھا۔

"وہ اور اس کی ماں ازل سے ہمارے ہاتھوں استعمال ہو رہے ہیں۔ ہونے دو۔ جنھوں نے خود عقل کوڑیوں کے مول بیچ ڈالی ہو انھیں ہم خرید کر کیوں دیں؟ قسمت نے تو میری گود بیٹے سے خالی رکھی لیکن اپنی عقل سے میں نے بن جنا بیٹا جن لیا۔ اب کیا ایسے لڑکے کو ہاتھ سے جانے دوں؟ ندا ٹھیک کہتی ہے اور ٹھیک کہہ رہی ہے۔ سو کام آتا ہے، آنے دو۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔"

اس کی ماں کی قائم مقام پھپھو اس کی ماں اور اس پہ ہنس رہی تھی۔ ان کا واقعی کچھ نہیں گیا تھا، گیا تو اس کا تھا۔ اس کی پیاری ماں اور محبوب بیوی، جو ان مکڑیوں کے بچھائے جال میں پھنس کر وہ گنوا چکا تھا۔ اب وہ کیا کرے گا، کیسے ڈھونڈے گا، کیسے پائے گا۔ وہ رکا نہیں، لوٹ گیا تھا۔ گھر اور زندگی کے رستے پہ۔ پھر سے سب پانے، پھر سے سب جوڑنے۔ وہی سب جو اس نے اپنے ہاتھوں گنوایا تھا۔

☆☆☆

وہ ٹوٹا بکھرا سا بانو بیگم کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ خشک آنکھوں سے ماں کی نم آنکھیں دیکھتا۔ کتنے



برسوں بعد اس نے ماں کی گود میں سر رکھا تھا، انہیں نام کے بجائے اُس رشتے سے پکارا تھا جس کی وہ حق دار تھیں۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ کوئی دکھ بھرا شکوہ، معافی کے الفاظ، کچھ ندامت بھرے جملے۔ وہ ماں تھیں اس کے چلے آنے سے ہی سمجھ گئی تھیں کہ وہ ان کی مامتا پہ یقین کر کے لوٹ آیا ہے۔ ان کی سزا ختم ہو گئی ہے۔ اس کی ساری نفرت مٹ گئی ہے۔ ان کا رشتہ آزمائش کی بھٹی میں پک پک کر کندن بن گیا ہے۔ اب ایسے کندن کو بھلا کیا زوال؟

"اچھا بیٹا تو کبھی میں تھا ہی نہیں لیکن میں ایک برا شوہر بھی ثابت ہو گیا۔ ایک ناکام انسان، جو ہر رشتہ نبھانے میں بھی ناکام رہا۔"

"غلطی انسان کی سرشت میں گندھی ہے۔ سب سے ہوتی ہے، تم سے بھی ہو گئی۔"

"آپ اسے غلطی مت کہیں، گناہ کہیں۔ میں نے آپ جیسی ماں اور خولہ جیسی بیوی کے ساتھ جو کیا، وہ کسی صورت کسی کبیرہ گناہ سے کم نہیں۔ نہ تو میں آپ جیسی ماں کا بیٹا بننے کے لائق ہوں اور نہ خولہ جیسی بیوی کا شوہر بننے کے۔" انہوں نے اس کی پچھتائی نظروں کو نرمی سے چوم لیا۔ وہ روئے چلے جا رہی تھیں۔

"امی اس مکمل لڑکی نے مجھ جیسے نامکمل انسان کو اپنایا تب جب مجھے سب نے ٹھکرا دیا تھا۔ نا صرف اپنایا، اس قدر چاہا بھی۔ میرے سارے رشتوں کے لیے محنت کی، کوشش کی، ہماری مشکلات کو دور کرنے کے لیے دن رات ایک کیا، اپنا سب کچھ مجھے دے ڈالا اور بدلے میں مجھ سے صرف وفا چاہی لیکن میں وہ بھی نہ دے سکا اسے۔ میں جیسے خود ادھورا تھا ویسے ہی ہمارے رشتے کو بھی ادھورا کر ڈالا۔ جیسے خود ناکام تھا، اس رشتے کو بھی ناکام بنا ڈالا۔ میں اس کے قابل تھا ہی نہیں یہ خود میں نے ثابت کیا۔ اس جیسی ہیرا لڑکی مجھ جیسے کوئلے کے ساتھ کالی پڑ گئی۔ ٹوٹ گئی۔" قطرہ قطرہ وہ اپنی آنکھ سے بہنے والے آنسوؤں کے ساتھ پگھل رہا تھا۔

"تم اس سے معافی مانگ لو۔ اسے منا لو۔ تمہیں بہت چاہتی ہے، مان جائے گی۔ معاف بھی کر دے گی۔"

"کیا کہوں گا اس کے پاس جا کر، کیا تو جیہہ دوں گا اپنے گناہ کی۔ بے وفائی کی۔ اپنی بدکرداری کی؟ کیسے سمجھاؤں گا اسے کہ یہ سب میں نے کیوں کیا؟ کیوں اس کی بے مول وفا کی ایسی بری قیمت ادا کی؟ اب کس منہ سے اسی کے سامنے جا کر ہاتھ جوڑوں جس کا دل توڑا اور اعتبار بھی۔"

"عورت بڑی عجیب مخلوق ہے۔ مضبوط ایسی کہ سب کچھ سہہ جاتی ہے، برداشت کر لیتی ہے۔ نرم ایسی کہ مرد کی ذرا سی محبت، ساتھ اور وفا سے پگھل جاتی ہے۔ معاف کر دیتی ہے۔ یقین کر لیتی ہے۔"

"عورت سب کر لیتی ہے لیکن بھول نہیں پاتی۔ نہ مرد کے ظلم کو نہ ہی اس کے جرم کو۔ وہ بھلے میرے ساتھ رہ لے گی لیکن سب یاد رکھے گی اور میں ہر پل یہی سوچتا رہوں گا کہ وہ جی تو رہی ہے لیکن خوش نہیں ہے۔"

"زندگی میں سب مکمل نہیں ہوتا، بہت جگہ دل مارنا پڑتا ہے اور خود کو بھی۔ اس سے کم از کم رشتے جینے لگتے ہیں۔ اب نباہ تو کرنا ہے، جیسے بھی ہو۔ خوش ہو کر یا قربانی دے کر۔"

ایک خوب صورت اور مکمل رشتے کو اب وہ نبھانے کے لیے ساتھ جئیں گے، ساتھ رہیں گے پھر بھی پہلے سا مکمل اور حسین کر نہیں پائیں گے۔ خلا بھر نہیں پائیں گے۔ آگے بڑھ نہیں پائیں گے۔ درد تھا کہ کچھ اور بڑھ گیا، آنکھیں تھیں کہ پھر سے برس گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ اتنے ماہ سے جسے ڈھونڈ رہا تھا، اس کے گھر سے نکل کر اسی کے نام پہ لیے فلیٹ میں رہنے چلی آئی تھی۔ اسی نے تو کہا تھا کہ یہاں سے دفان ہو جاؤ تو وہ بھی دفان ہو گئی تھی۔ چلی آئی تھی سب چھوڑ

کر۔ بس سب تو ڑ نہیں سکی تھی۔ اتنی ہمت نہیں تھی۔
مختصر سے سامان کو اس نے مختصر ہی رکھا۔ وہ نیچے کچھ بھی بچھا کر سو جاتی، وہیں خریدے گئے چند برتنوں میں کچھ بھی تھوڑا بہت بنا کر کھا لیتی۔ جینا ہی تھا تو اتنا کافی تھا۔ سانس ہی لینا تھی تو خالی گھر میں بھی لے ہی رہی تھی۔ جب وہ خالی دل لیے نہیں مری تھی تو خالی گھر سے کیا ہوتا تھا۔
روز وہ خود کو یقین دلاتی کہ جو کچھ ہوا وہ ایک غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے لیکن پھر خود پہ ہنسنے لگتی۔ اچھی خود فریبی تھی جو وہ خود کو دے رہی تھی۔ اپنی آنکھوں سے سب دیکھا تھا پھر بھی وہ خود کو سمجھا رہی تھی کہ وہ اندھی ہے۔ اس نے جو دیکھا غلط دیکھا۔ جس شخص کے لیے اس نے سب کیا وہ ہی اس سے مخلص نہ رہا۔ اب وہ کیا کرے گی، کہاں جائے گی؟ اپنوں سے اس لیے لڑتی رہی تھی، اس کے مقدمے کی وکیل بنی ہمیشہ دوسروں کو اس کی اچھائی دکھانے کی کوشش میں وہ کب اس کی جانب سے خود ایسی بے خبر ہو گئی تھی کہ اس کی برائی دیکھ ہی نہ پائی۔
ایک اچھی بیوی بنتے بنتے وہ ایک بری بیوی بن گئی تھی یا بے وقوف بن گئی تھی۔ وہ ہم سفر تھی تو ہم سفر بن کر دکھانا چاہتی تھی۔ اپنے شوہر کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ پھر غلط کہاں ہوا تھا؟ پہلی غلطی جو اس سے ہوئی وہ یہ کہ وہ اپنے شوہر کے مزاج کو ٹھیک سے سمجھ نہ سکی اور دوسری بڑی غلطی کہ اپنے کام کی دھن میں وہ اسی انسان کو نظر انداز کر گئی جس کے لیے وہ دن رات کام کر رہی تھی۔ یہیں سے وہ اپنے شوہر کی نظروں میں ایک اچھی سے بری بیوی ثابت ہوئی تھی۔ پہلی غلطی عماد سے ہوئی کہ وہ خوفِ خدا بھول گیا تھا۔ اس کا احساس کرنے کے بجائے وہ کسی اور کے احساس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ گھر کے بجائے باہر سکون ڈھونڈنے لگ گیا تھا اور یہی اس کی آخری غلطی تھی۔
"جانتے ہو مجھے کس بات سے ڈر لگتا ہے عماد؟" اس نے عماد کے کندھے پہ سر ٹکا کر اداسی سے پوچھا تھا۔
"کس بات کا؟"
"کہ کچھ سال گزرنے کے بعد کہیں تم مجھ سے بے زار نہ ہو جاؤ۔" وہ کھل کر ہنسا تھا۔
"وقت گزرنے کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ کی ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ جیسے جینے کو ہوا ضروری ہے، پانی اور کھانا ویسے محبت بھی اور خوله محبت ہی تو ہے۔" وہ نرمی سے اس کے ہاتھوں کو لبوں سے لگا کر کہہ رہا تھا۔
"میں بھی۔" پھر وہی دو الفاظ اسے یاد آ گئے اور سب تحلیل ہو گیا۔ اس کے دعوے، وعدے، محبت، عادت سب۔
"کیوں کیا عماد ایسا؟ کچھ بھی اور کر دیتے مجھے ایسا دھوکا تو نہ دیتے۔ عورت سب سہہ سکتی ہے بس محبت میں شراکت نہیں۔ تم اور تمہاری وفا تو بس دنیا کی پہلی اور آخری لڑکی کے لیے تھے، خولہ عماد کے لیے۔ پھر خولہ دنیا کی پہلی لڑکی تو بن گئی۔ آخری کیوں نہ بن سکی؟" وہ اپنے اخلاص پہ روتی یا اس کی بد دیانتی پہ۔ کتنا کچھ تھا یاد آنے کو، کتنا کچھ تھا رلانے کو۔
موبائل پچھلے کتنے دن سے بند پڑا تھا۔ اسے تھوڑا ہوش آیا تو چارج کیا۔ ماما کی اسے کال آئی تھی۔ وہ اس کی طرف سے پریشان ہو رہی تھیں، اسے بہت کچھ سنا رہی تھیں اور نجانے کیا کیا بتا رہی تھیں، وہ سب سن رہی تھی مگر کچھ بھی سن نہیں رہی تھی اس کا دھیان ان دو لفظوں کی طرف ہی تھا جس نے اس کی زندگی کو اس جگہ لا چھوڑا تھا۔ اس نے بہانہ بنا کر خود فون بند کر دیا تھا۔ بانو بیگم کو اس نے فون کر کے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ کہاں ہے اور ان سے وعدہ بھی لے لیا تھا کہ وہ عماد کو اس کے بارے میں کچھ مت بتائیں۔ عماد اسے پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا ہے انھی سے اسے پتا چلا تھا۔ وہ خاموش رہی تھی۔
"ایسا کیا ہوا تھا بیٹا؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔
"عماد ہی بہتر بتا سکتا ہے۔" اس نے فون رکھ دیا تھا۔ جانتی تھی نہ وہ عماد سے پوچھ سکتی ہیں اور نہ ہی



بتائے گا۔ پھر وہ ماما سے بھی ملتی رہی تھی لیکن انھیں بغیر بتائے کہ اس کی زندگی میں اتنا کچھ ہو چکا ہے۔ وہ آج کل کہیں اور رہ رہی ہے، عماد کے ساتھ نہیں۔ اس کی ماں پہلے ہی تنہا اور بیمار تھیں وہ انھیں اپنے حوالے سے کسی دکھ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھلے عماد کا گھر چھوڑ آئی تھی لیکن اپنے اور اس کے رشتے کا بھرم رکھنا چاہتی تھی اور کچھ باقی نہ بچا تھا، دنیا دکھاوے کو ایک پردہ ہی سہی۔

☆☆☆

اب وہ روز اس کے فلیٹ کے باہر کھڑا گھنٹیاں بجاتا رہتا، گھنٹیاں بجا بجا کر وہیں دروازے سے ٹیک لگائے نیچے بیٹھ جاتا، اسے پیغامات بھیجتا رہتا۔ ابھی وہ یہ دروازہ نہیں کھولنا چاہتی تھی۔ اسے وقت چاہیے تھا اس سب سے نکلنے میں، سنبھلنے میں۔ وہ روز آتا تھا گھنٹیاں بجا بجا کر اسے معافی بھرے پیغامات بھیجتا تھا۔ کبھی موبائل پہ، کبھی کسی کاغذ پہ لکھ کر دروازے سے اندر دھکیلتے۔ ان پیغامات میں سوائے معافی کی درخواست کے کچھ نہیں ہوتا تھا۔
"کیا میں سمجھوں کہ تم علیحدگی چاہتی ہو؟" اس رات اس نے باہر دو گھنٹے بیٹھے رہنے کے بعد اسے پیغام بھیجا تھا۔ اس پیغام نے اس کی سانس ایک بار پھر سے روک ڈالی تھی۔ کیا وہ واقعی ایسا چاہتی تھی۔ اس نے خود سے یہی سوال دہرایا۔ وہ کچھ بھی چاہ سکتی تھی سوائے اس ایک بات کے۔ اس رشتے کو ختم کر کے وہ کہاں جاتی؟ باپ، بھائی کے نام پہ اسے سہارا دینے کے لیے کوئی میکا نہ تھا۔ آس تھی تو ایک بوڑھی ماں کی۔ اسے سب برداشت کرنا اور شوہر کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ جس معاشرے میں وہ سانس لے رہی تھی، اس میں جینے کے لیے یہ ایک بڑا عملی اقدام تھا۔ ہر دوسری عورت کا اقدام۔ محبت نہ سہی، سہارا ہی سہی۔
"مجھے رہائی دے دو یا قید کر لو مگر ایسا مت کرو۔" اس سے اگلا پیغام۔ تین ماہ گزر چکے تھے اب وہ خود بھی کوئی انجام چاہتی تھی۔ وہ اٹھی اور چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھول کر وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ایک طرف نیچے، دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے ساتھ ہی وہیں بیٹھ گیا تھا۔
"کچھ پوچھو گی نہیں؟"
"تم بتا دو۔"
"میں کبھی اپنی اس حرکت کو درست نہیں کہوں گا، نہ ہی اس کے حق میں وضاحتیں دوں گا۔"
"ایک باضمیر انسان کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہارا ضمیر مرا نہیں۔"
"میں تمہارے قابل نہیں تھا، تم جیسی اچھی لڑکی مجھ جیسے انسان کی جیون ساتھی نہیں ہونا چاہیے تھی۔" دل نے کہا 'شاید'.....
"تم ہر لحاظ سے اچھی لڑکی تھیں پھر اچھی بیوی بنیں، اچھی بہو، اچھی بھابھی۔ کیونکہ تم تھیں ہی اچھی۔ بہت اچھی..... لیکن میں اچھا نہیں تھا۔ ایک معذور، اپاہج انسان تو میں تھا ہی لیکن میں ذہنی بیمار بھی تھا اور بدکردار بھی۔ کبھی میں نے ایسی حرکت کی۔ ایسا نہ ہوتا تو کبھی یہ سب نہ کرتا۔" اس نے خاموشی سے سب سنا۔
"ایک اونچے خاندان سے ایک نیچے خاندان میں آ کر تم نے اپنا آپ اس رشتے کی خاطر بدل ڈالا اور میں نے اس رشتے کو ہی بدل ڈالا۔ بات بات پہ تم نے میرے لیے اپنا دل مارا اور میں نے تمہیں ہی مار ڈالا۔ میں نے تمہاری ایک ایک تکلیف کا بدلہ تمہیں مزید تکلیف سے دیا۔ تمہارے ہر آنسو کے بدلے تمہیں اور رلایا۔ میں کسی طور تمہارے قابل تھا ہی نہیں۔ تمہارے کیا کسی بھی اچھی لڑکی کے قابل نہیں تھا۔" وہ رو رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اسے روتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ خود اس سے زیادہ تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھانا اور اسے چپ کرانا چاہتی تھی، اس کے آنسو پونچھنا چاہتی تھی۔ اس کی ساری تکلیفیں جیسے سمیٹتی رہی تھی، اسے بھی سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ پھر یک دم وہ انجان بن گئی۔

اسے اب ایسا کچھ نہیں کرنا تھا۔ اپنا کوئی کمزور پہلو سامنے نہیں لانا تھا۔ وہ ہنوز اسی انداز میں بیٹھی رہی۔ خاموش، چپ چاپ۔

"میں نے تمہیں ہمیشہ سے سمجھایا تھا کہ نوکری اور اس کام کے پیچھے ہمارے گھر اور رشتے کو خراب مت کرنا۔ میں ڈرتا تھا، اس لیے نہیں کہ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تم گھر کی ذمہ داریاں نہیں نبھا پاؤ گی بلکہ میں خود سے ڈرتا تھا کہ میں نظرانداز ہونا برداشت نہیں کر پاؤں گا۔" وہ اب کی بار بھی خاموش ہی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ بولے، اسے بتائے کہ اس سے اتنا بڑا گناہ بھی نہیں ہوا تھا کہ عماد نے اسے ایسی بڑی سزا دی تھی۔

"مجھے ایک دوست کی ضرورت تھی خولہ۔ محبت کی ضرورت تھی۔ توجہ کی ضرورت تھی۔"

"اور تمہیں لگا کہ میں مر گئی ہوں۔" وہ استہزائیہ ہنسی اور ایسا کرنا کتنا اذیت ناک تھا وہ جانتی تھی۔

"تم بہت مصروف تھیں۔ میں نے کتنی بار تمہیں متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ تمہیں احساس دلانے کی لیکن تم اپنے کام میں مصروف ہی رہیں۔" وہ اپنی مجبوری بتا رہا تھا۔ ہر مرد کی طرح اسے اپنی بے وفائی کی وضاحتیں دے رہا تھا۔

"ایک لگاتے میرے منہ پر۔ لگا کر سمجھاتے جو میں نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اس وقت تم ایسا کر دیتے تو آج قسمت میرے منہ پہ یہ تھپڑ نہ مارتی۔ میں تو ان عورتوں میں سے تھی جو شوہر کی مار کھانا قسمت کی مار کھانے سے زیادہ بہتر سمجھتی ہیں۔ پھر کیوں تم نے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا۔ تم مجھے ڈانٹتے، مارتے مگر یہ بے وفائی نہ کرتے۔" وہ جو سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی اب رو رہی تھی۔ بے آواز آنسوؤں سے۔

"خولہ پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"تم نے مجھے سمجھا کیا؟ تم نے مجھے سمجھا ہوتا تو آج ہم یہاں نہ کھڑے ہوتے عماد۔ مرد ہمیشہ عورت سے ہی کیوں امید باندھ لیتا ہے کہ وہ ہی اسے، اس کی مجبوری، اس کی مشکلات کو سمجھے۔ یہ کام مرد عورت کے لیے کبھی کیوں نہیں کرتا۔ وہ کبھی عورت کو، اس کی تکلیفوں، صبر، قربانیوں کو کیوں نہیں سمجھتا۔ ایک پل نہیں لگایا تم نے ہمارے بیچ ایک دوسری عورت کو لانے میں، ہمارے رشتے کو کمزور اور بودا بنانے میں، میرا اعتبار، یقین توڑنے میں۔ مجھے توڑنے میں۔ ہمیشہ عورت اپنی ساری وفاؤں، ساری محنت، محبت، قربانیوں کے باوجود بھی مرد کی طرف سے بے وفائی کی سولی پہ کیوں لٹکتی رہتی ہے؟ یہ ڈر ہمیشہ عورت کے اندر ہی کیوں پنپتا رہتا ہے؟ مرد کیوں اس سے نہیں گزرتا؟ شوہر کی مصروفیت کا بہانہ بنا کر بیوی کوئی دوسرا رستہ تلاش نہیں کرتی، یہ کام پھر شوہر ہی کیوں کرتا ہے؟" وہ اسی طرح رو رہی تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ حرف بہ حرف۔ ایسا کرنے میں، ایسا کہنے میں وہ حق بجانب تھی۔ وہ کسی ایک بات کی بھی تردید نہیں کر رہا تھا۔

"ہمارے درمیان اتنی محبت تو رہی ہے کہ تم مجھے معاف کر دو؟" اس کے منہ سے 'رہی ہے' سن کر کرب سے اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ تو کیا ان کے درمیان محبت اب نہیں رہی تھی۔ اتنا آسان تھا محبت کو حال سے ماضی ہو جانا۔

"سب بھول جاؤ۔" وہ ابھی اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ بے جان، بنا حرکت کیے۔

"گھر لوٹ آؤ۔" اس نے آنکھیں کھول دیں اور اسے دیکھا۔

"پھر سے میرا یقین کر لو۔ پھر سے ایک نئی زندگی شروع کر لو۔" وہ لب بھینچے بس اسے دیکھ رہی تھی۔

"بس ایک بات کا جواب چاہیے۔" عماد نے اسے بے چینی سے دیکھا۔

"اگر میرے موبائل سے ایسی کوئی چیٹ نکلتی تو کیا تم تب بھی مجھے اپنے ساتھ بسا لیتے؟ مجھے اسی طرح کھلے دل سے معاف کر دیتے جیسی مجھ سے



شروع کر آئے ہو؟ سب بھول جاتے۔ پھر سے نئی ...ی شروع کرتے؟" وہ خاموش نظروں سے اسے ...کتا رہ گیا۔

"تم ایسا نہ کرتے عماد! کیونکہ وہ گناہ ایک مرد کا ...ہیں عورت کا ہوتا۔ ایک شوہر کا نہیں، بیوی کا ہوتا۔ ...اور ایسا گناہ تو ناقابل معافی ہوتا ہے۔" بیوی ہوں تو معاف بھی کر ...ایک گہری سانس بھری۔ "لوٹ بھی آؤں گی۔ یقین بھی شاید کر ہی ...دوں گی۔ لوٹ بھی آؤں گی۔ نئی زندگی بھی شروع کر لوں گی کیونکہ میرے ...ں۔ نئی زندگی آپشن نہیں ہے۔ لیکن بھول پاؤں گی ...اس کی امید مت رکھنا۔" وہ جانتا تھا اس کا جواب یہی ...ہونا تھا۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا۔

"مجھے وقت چاہیے عماد! لوٹنے میں، یقین ...کرنے میں۔"

"اور بھولنے میں؟" وہ ایک امید سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پتا نہیں۔" وہ اٹھ کر اسی طرح مرے قدموں سے اندر بڑھ گئی تھی۔ اس نے دروازہ بھی بند کر دیا تھا ...اب اسے چلے جانا چاہیے تھا۔ اسے فیصلے کا وقت دینا چاہیے تھا۔ وہ اٹھا اور دھیمی چال سے چلتا ہوا باہر چلا گیا۔

خولہ جواب کھڑکی کے پردے کھولے باہر جاری ٹریفک کو دیکھ رہی تھی۔ عماد نادم تھا اس کے پورے وجود پہ کندہ تھا۔ جو ہوا اب کبھی نہیں ہوگا ایسا اس کی آنکھوں کی سچائی میں لکھا تھا۔ وہ غلطی کر کے مداوا کرنے آیا تھا تو مکمل طور سے تبدیل ہو کر، یہ اسے یقین تھا۔ لیکن وہ دل کا کیا کرتی جو ایک بار ٹوٹ کر جڑ نہیں پا رہا تھا، سنبھل نہیں پا رہا تھا، پہلے سا ہو نہیں پا رہا تھا۔ وہ عورت تھی پہلے بھی اپنی ازدواجی زندگی کے لیے خود کو قربان کرتی آئی تھی، اب بھی کرے گی وہ جانتی تھی۔ گھر عورت بناتی ہے، اب بھی اسے ہی بنانا تھا، بچانا تھا۔ پہلے بھی باوفا تھی، اب بھی رہے گی۔ وہ اس کے ساتھ جائے گی، گھر پھر سے بسائے گی لیکن پہلے سی ہو پائے گی۔ سوال اسی ایک بات کا تھا۔۔ عورت کے دل میں بھلے کتنی وسعت ہو، اتنی نہیں ہوتی کہ خوشی خوشی مرد کی بے وفائی سہہ جائے۔ شاید وقت کبھی اسے دوبارہ پہلے سا کر دے۔ اسے، اس کے رشتے کو، ان دونوں کو شاید..... یقیناً نہیں..... اور اسی شاید پہ اب ان دونوں کو یقین کرنا اور چلنا تھا۔


الف لیلہ ہزار داستانیں

پیارے بچوں کے لئے

الف لیلہ ہزار داستانیں

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں

300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں

فی کتاب 1200/- روپے

ڈسکاؤنٹ 300/- روپے

آج ہی 950/- روپے

منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

سالگرہ نمبر

# شامِ رنگِ سیاہ

ایمل رضا

سبین کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ سبین کا باپ قطب الدین چونے کا کام کرتا ہے اور ماں چکی چلاتی ہے۔ سبین کو ان دونوں کاموں سے کو سخت چڑ ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اگر بابا زندگی بھر اسی کام سے نتھی رہتے تو ان کی زندگی بھی آسائشوں سے پر ہو سکتی تھی۔ وہ آتے جاتے بابا اور اماں پر بولتی ہے۔ چونے کی گرد اور خوشبو سے اسے نفرت ہے۔ جبکہ بابا کے لیے یہ فن اس قدر مقدس ہے کہ وہ چونے کو الماس برادہ کہتے ہیں۔ اماں اس کی ناراضی کے ڈر سے کھانا روٹی ساتھ والوں کے گھر جا کر بناتی ہیں۔ اماں ابا دونوں مل اسے خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن گھر کے مسائل، ادھوری خواہشات، نامکمل آرزوئیں، چھوٹی بہن زویا کی خراب دماغی حالت، ماں کی بیماری، بابا کی کمزوری...... یہ سب سبین کو دن بدن چڑچڑا بناتے رہتے ہیں۔

پھر ایک روز ماں کا انتقال ہو جاتا ہے اور ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے سبین ناپسندیدگی کے باوجود اپنے چچازاد رشید سے نکاح کر لیتی ہے۔ جبکہ اس کے دل میں میران ہے۔ (جس سے سبین کی بس ایک بار ملاقات ہوئی ہے۔)۔ ماں کے انتقال کے بعد سبین کے لیے زندگی اور مشکل تر ثابت ہوتی ہے۔ رخصتی سے چند روز پہلے تائی رشید کے نام گھر لگانے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ لیکن گھر پہلے سے ہی بک چکا ہے۔ جس کا کسی کو علم نہیں۔ تائی کو یہ بات مہندی والے دن پتا چلتی ہے اور وہ اسی وقت رشید کے منہ سے سبین کو طلاق دلوا دیتی ہیں۔ سبین جل کر کوئلہ ہو جاتی ہے۔ ساری رات رونے کے بعد وہ اپنی زندگی کو بدل لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ اس نے چونے کے برادے کو الماس (ہیرے) میں کیسے بدل کر رہنا ہے۔

ڈان پیٹرسن دو الگ شناخت کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ پیٹرسن کے نام سے وہ ایک جرائم پیشہ گروپ کا ڈان ہے اور ایڈم راحل کے نام سے وہ ایک مذہبی آدمی بن کر لوگوں کو بہت اچھی طرح بے وقوف بنا رہا ہے۔ پیٹرسن امریکا میں ہوتے بہت سے جرائم کا سرغنہ ہے۔ اب اس کے گروہ کی جڑیں دوسرے ممالک تک بھی پھیلنے لگی ہیں۔ جہاں سے وہ نشہ آور ممنوعہ اشیاء کو امریکا میں اسمگل کرواتے ہیں۔

ناولٹ

سین چونے سے بنے ڈیکوریشن پیس کے ذریعے اسی گروہ کے لیے ممنوعہ اشیاء اسمگل کرنے جا رہی ہے۔
امریکا میں چیری کے باغات میں کام کرنے والی ربیکا کو پاکستان سے آئے ایک خوبرو نوجوان عیسیٰ سے محبت ہو جاتی ہے۔ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ دونوں کے گھر ایک بیٹے میران کی ولادت ہوتی ہے۔ بڑھتے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لیے عیسیٰ پاکستان واپس آکر اپنے چچا سے جائداد میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس پر اس کا چچا اسے قتل کروا دیتا ہے۔ خوش قسمتی سے ربیکا اور میران بچ جاتے ہیں۔ لیکن ربیکا عیسیٰ کی موت کا یقین ہی نہیں کرتی۔ وہ ہر دم یہ ہی کہتی رہتی ہے کہ عیسیٰ زندہ ہے اور وہ واپس ضرور آئے گا۔ عیسیٰ کی جدائی کے غم میں ربیکا نشہ کر کے اپنی زندگی تباہ کر رہی ہے۔
میران اپنی ماں کی گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے پریشان ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے سے وہ ربیکا کو ایک سینی ٹوریم میں داخل کروا دیتا ہے۔ جہاں ربیکا پورا ایک سال قیام کر کے اب گھر واپس آ رہی ہے۔ میران ربیکا کے صحت یاب ہو کر گھر آنے کی وجہ سے بہت خوش ہے۔
سین لوحِ قرآنی کے ڈیکوریشن پیس کے ذریعے اپنی پہلی اسمگلنگ کرتی ہے اور نیویارک آجاتی ہے۔ جہاں اس کی ملاقات میران سے ہوتی ہے۔ دونوں ہی جیسے ایک دوسرے سے ملنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں کی محبت کھل کر واضح ہو جاتی ہے۔

## پانچویں قسط

''سمبل کے درخت میں ایک خاصیت ہوتی ہے۔ یہ جتنا پرانا ہو اس پر اتنے ہی تازہ پھول لگتے ہیں۔ زیادہ نئی خوشبو والے، زیادہ شوخ رنگ والے، زیادہ افادیت والے...... ایسا اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ بہار کے نئے پھول ہوتے ہیں اس لیے شوخ ہوتے ہیں، تازہ خوشبو اور چمکتے رنگوں والے ہوتے ہیں۔ بلکہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ سمبل اپنے ہر سال کے تجربے سے سبق سیکھتا ہے۔ وہ ہر سال اپنی خامیوں کو دور کرتا ہے۔ ہر نئی بہار پر وہ پچھلی بہار سے زیادہ شوخ اور تازہ پھول کھلاتا ہے۔ اس کے بڑھاپے میں اس کے پھولوں کی رونق دیدنی ہوتی ہے۔

لیکن اس خاصیت میں ایک قباحت بھی پوشیدہ ہے۔ اس ساری محنت میں سمبل کی مثال خوش نما پنکھوں والے مور کے بدنما پنجوں جیسی بن کر رہ جاتی ہے۔ گدلے، بے ڈھب اور بے جوڑ پنجے...... چند روزہ زندگی والے شوخ رنگ پھول جب جھڑتے ہیں تو سمبل کی شاخیں بھی بھدی، گندی اور بے وقعت لگتی ہیں۔ خود بوڑھا ہو کر وہ پھولوں کو خوش نما تو بنا دیتا ہے لیکن اپنی اہمیت پیدا نہیں کر پاتا۔

انسانی زندگی اور سمبل میں حد درجہ مماثلت ہے۔ انسان بھی اپنی زندگی سال ہا سال تجربات اکٹھے میں خرچ کر دیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خوش نما بنانا چاہتا ہے۔ اسے مختلف اور بہت سے رنگوں سے سجانا چاہتا ہے۔ اس میں نئی نئی خوشبوئیں بھرنا چاہتا ہے۔ چمک پیدا کرنا چاہتا ہے اور جب وہ سمجھتا ہے کہ اس نے بہت تجربہ اکٹھا کر لیا ہے اور اب وہ اپنی حیات کی ڈالیوں پر سب سے جاذبِ نظر پھول اگا سکتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی دن سے شام، شام سے رات اور رات سے گہری رات میں ڈھل کر اپنا وجود ختم کرنے کے لیے بے قرار ہے۔

سمبل کے پھولوں کو سونگھنے کی اور دیکھنے کی اب کسی کو چاہ نہیں رہی ہے۔''

☆☆☆

سورج کسی ننھے بچے کی طرح کھلکھلاتا ہوا اپنا سفر پورا کر رہا تھا۔ اس کی میٹھی روشنی دھرتی پر شیرینی بانٹتی پھر رہی تھی۔ درختوں کے سایوں کی جھولیاں اس شیرینی سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ ہوا میں اس



قدر مٹھاس گھلی ہوئی تھی کہ ہر سانس لینے میں کھجور کھانے کا ذائقہ حلق میں گھل جاتا تھا۔

سین سب دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اس جگہ سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ آگے چلتے میران کو جیسے بھول ہی گئی تھی۔ جگہ تھی کہ کوئی جادو نگری...... ایسے جیسے چھپن چھپائی کھیل رہی تھی۔ اپنے اندر لاتعداد منظر قید کیے ہوئے جو ہر نئے قدم پر نکل نکل کر سامنے آ رہے تھے۔ وہ جیسے کہہ رہی تھی کہ جتنا تلاش کر لو اتنا تمہارا...... اس کی خوب صورتی کا جیسے کوئی انت ہی نہیں تھا۔

''یہ میری پسندیدہ ترین جگہ ہے۔ جب جب شہر کی فضا سے تنگ آجاتا ہوں۔ یہاں آجاتا ہوں۔''

''یعنی اگر تم کہیں نہ ملو تو یہاں آسانی سے مل سکتے ہو۔'' اس نے اپنے آگے آگے چلتے میران سے کہا۔ جس کے نقش قدم پر پاؤں رکھتی وہ چکنے پتھروں اور بے ڈھب گھاس پر ڈگمگاتی ہوئی اس کی تقلید میں آگے بڑھ رہی تھی۔

''ہاں...... ایسا کہہ سکتی ہو۔ جب جب میں تم سے ناراض ہو جایا کروں گا اور تمہیں کہیں نہیں ملوں گا تو تم مجھے یہاں آ کر ڈھونڈ لینا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہیں میں ناراض کروں گی ہی کیوں......''

سین نے دل میں، دل سے سوچا تھا۔

چلتے چلتے جب وہ تھک گئی تو ایک سنگی بینچ پر بیٹھنے لگی۔ لیکن میران نے اسے فوراً روک دیا تھا۔

''ارے...... ایسا غضب نہ کرو......''

''کیا مطلب......؟''

''بینچ پر نہ بیٹھو...... قدرت کو کھل کر انجوائے کرو...... جو مزا اوس والی گھاس پر بیٹھنے کا ہے۔ وہ مزا سونے کے بینچ پر بیٹھ کر بھی میسر نہیں آ سکتا۔ آزما کر دیکھ لو......'' میران نہ صرف قدرت کا دلدادہ تھا بلکہ وہ اسے اچھی طرح سے پرکھا بھی ہوا تھا۔

ہنستے ہوئے سین بینچ سے اٹھی اور اوس والی گھاس پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اسے بتا نہ سکی کہ وہ اوس کیا کہر والی گھاس پر بھی اپنی راتیں بتا چکی ہے۔ آرٹ کالج کے باغ میں اپنے غم کی راتیں، ماں کی بیماری پر اپنی بے بسی کی راتیں، ان کی موت پر اپنے صدمے کی راتیں، اپنی شادی پر اپنی کم مائیگی کی راتیں اور پھر اپنی طلاق پر اپنی بے توقیری کی راتیں...... لیکن اگر وہ اسے بتانا چاہتی بھی تو اپنے غموں کو، دکھوں کو اس شدت سے نہیں بتا سکتی تھی جس شدت سے وہ اس پر بیت چکے تھے۔ یہاں آنے کے بعد اس کی ہر چیز میں بدلاؤ آ گیا تھا۔ دنیا کو دیکھنے کا اس کا نظریہ ہی بدل گیا تھا۔ پچھلی ساری زندگی اسے بے معنی اور لاعلمی کی زندگی لگنے لگی تھی۔ اپنے ''باعلم'' ہونے کے بعد جو وہ دیکھ رہی تھی وہ سب دلکش ہی دلکش تھا۔

جس حصے میں وہ دونوں بیٹھ گئے تھے وہاں ابھی تک سورج کی تمازت نہیں پہنچی تھی اس لیے اوس اور گھاس کا عارضی رشتہ قائم تھا۔ درختوں کی شاخوں اور پتوں سے چھن چھن کر آتی سورج کی باریک کرنیں میران کے روشن چہرے پر پڑ رہی تھیں اور اسے اور منور کر رہی تھیں۔ وہ باسکٹ میں سے کچھ کھانے کی چیزیں نکال رہا تھا اور سین اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔

''سین تم یہاں......'' اسے سینڈوچ دیتے ہوئے وہ بولتے بولتے رکا تھا۔ اس نے اسے خود کو دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سین جھینپ گئی تھی۔ میران اندر ہی اندر مسکرایا۔

''تو...... تمہارا یہاں کیسے آنا ہوا...... کیا یہاں تمہارے رشتے دار رہتے ہیں۔؟''

''نہیں......''

''تو......؟'' وہ پوچھ رہا تھا اور سین کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔

''اگر تم نہیں بتانا چاہتیں تو اٹس او کے۔''

''نہیں۔ اس میں نہ بتانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل میں یہاں...... یہاں ایک این جی او کے تحت آئی ہوں۔ جن کا کام مختلف مذاہب کے

مانے والوں کے درمیان نفرت اور تعصب کو دُور کرنا ہے۔'' اس نے اس کے سامنے بھی وہ ہی جھوٹ بولا تھا جو وہ ایر پورٹ پر بول کر آئی تھی۔ وہاں تو وہ پولیس سے ڈر رہی تھی۔ جیل جانے سے ڈر رہی تھی۔ یہاں وہ کس سے ڈر رہی تھی۔؟

میران کو لمحے بھر کے لیے بھی شک نہیں ہوا تھا کہ سبین اس کے سامنے جھوٹ بول رہی ہے۔

''تمہارا قیام کتنے دن کا ہے۔؟''

''پندرہ دن.....''

''پھر.....اس کے بعد.....؟''

''اس کے بعد کیا۔؟'' جیسے وہ جانتی ہی تو نہ تھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہ رہا ہے۔

''اس کے بعد تم واپس چلی جاؤ گی۔؟''

''ہاں.....لیکن میں پھر سے آؤں گی۔ مجھے بار بار آنا پڑے گا۔'' وہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں معاہدہ کر چکی ہوں۔''

''کس قسم کا معاہدہ.....؟''

''مطلب این جی او والوں نے مجھے بتا دیا ہے کہ مجھے بار بار یہاں آنا پڑے گا۔''

''تو کیا تم نے نیویارک دیکھا۔؟ کیا تمہارے پاس اتنا وقت ہے۔؟''

''میں ابھی پرسوں ہی آئی ہوں اور صرف سینٹ جین چرچ تک ہی گئی ہوں۔''

''مجھے اپنی والدہ کو لینے سینی ٹوریم جانا ہے۔ اگر تم تنہائی محسوس کر رہی ہو تو.....'' اس نے پوچھا پھر جیسے اسے خود ہی اس کی مصروفیت کا احساس ہوا۔ ''آج تمہیں تو این جی او کے بہت سے کام ہوں گے۔''

سبین کو انکار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی تھی اور اندر ہی اندر اس نے اپنے جھوٹ پر لعنت بھیجی۔

کھانا کھا کر وہ دونوں ایک ایسے حصے میں آ نکلے تھے جہاں ہر طرف سمبل کے درخت تھے۔ نارنجی مائل سرخ رنگ کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت..... سبین نے زندگی بھر بہت سے درخت دیکھ رکھے تھے۔ بہت سے پودے بھی جن پر طرح طرح کے پھول لگتے تھے۔ کتنے درخت، پودے آرٹ کالج کے باغ میں ہی لگے ہوئے تھے لیکن اس نے کسی درخت پر آج تک اس طرح کے خوب صورت پھول نہیں دیکھے تھے۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ پھول صرف پودوں پر ہی لگتے ہیں۔ درخت تو پھلوں کے لیے ہوتے ہیں۔ لیکن سمبل کو دیکھ کر اسے اپنا نظریہ بدلنا پڑا تھا۔ ان پھولوں میں اتنی تازگی اور اتنی جاذبیت تھی کہ سبین انہیں دیکھتی رہ گئی تھی اور ان پھولوں سے لدے درختوں کی چھاؤں میں ایسے گھوم گئی تھی جیسے اپنے بچپن میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ساون میں کٹکلی ڈالا کرتی تھی۔

''آؤ..... تمہیں دائنا سے ملواؤں۔'' میران کہہ کر ایک سمت کی جانب بڑھ گیا۔ سبین بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

آگے چل کر درخت راستوں کو مزید تنگ کر رہے تھے۔ انہی درختوں کے جھرمٹ کے نیچے کین کی ہاتھ سے بنی پیڑھی نما نشست پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی اتنی خوب صورت تھی کہ سبین ایک لمحے کو رک گئی اور اسے یک ٹک دیکھنے لگی۔ لڑکی ہونے کے باوجود بھی اسے دیکھ کر سبین کے دل کی دھڑکنیں چند ثانیوں کے لیے تھم گئی تھیں۔

اس لڑکی کی آنکھیں بڑی بڑی سیاہ، پاک اور روشن تھیں۔ جن میں مقدس پانی کی ندیاں ٹھاٹھیں مارتے ہوئی لگتی تھیں۔ چہرہ سپاٹ اور بے داغ تھا، جہاں جنت کی پرچھائی کا گمان ہوتا تھا۔ بال سونے کی تاروں جیسے سنہری تھے۔ اور ہونٹ..... جیسے زعفران اپنی رعنائی وہاں سے ہی حاصل کرتا ہو۔ سبین کو لگا وہ کسی انسانی مخلوق کو نہیں بلکہ جنت کی کسی حور کو دیکھ رہی ہو۔ کوئی بیک وقت اتنا حسین، اتنا معصوم، اور اپنی ان دونوں خصوصیات سے اتنا غافل کیسے ہو سکتا ہے۔ سبین کو بے اختیار ہی وہ لڑکا یاد آ گیا تھا جسے دو روز سے وہ صبح اپنے کمرے کی کھڑکی سے نیچے بے حد بے نیازی سے ماؤتھ آرگن



بجاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں بھی ایسی ہی عاجزی تھی۔

اس لڑکی کا نام دائنا تھا۔ دائنا نے اس وقت اپنے آگے چار پانچ شیشے کے جار رکھے ہوئے تھے۔ جس میں کچھ عجیب وغریب سی چیزیں تیر رہی تھیں۔ ان سے پرے کھجور کے پتوں کی بے آرام چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ دائنا کی چھوٹی سی دکان تھی۔

''میران یہ کیا ہے۔'' اس نے ماہی آب میں پڑی ہوئی اس عجیب وغریب حشرات طرز کی تیرتی ہوئی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ جونکیں ہیں۔ دائنا یہاں ان کا ہی کام کرتی ہے۔''

''مطلب.....''

''ٹھہرو..... ابھی سمجھاتا ہوں۔'' میران نے کہا اور اگلے ہی پل اپنی شرٹ اُتار کر دائنا کے سامنے بچھی کھجور کی چٹائی پر لیٹ گیا۔ دائنا بڑی معصوم اور چپ چاپ سی لڑکی تھی۔ اس نے خاموشی سے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ماہی آب میں سے جونکیں نکال نکال کر وہ میران کی کمر پر رکھنے لگی۔ سبین بھی وہاں ہی نیچے کھجور کی چٹائی پر میران کے پاس بیٹھ گئی۔

''اس سے کیا ہوگا۔؟''

''فاسد خون صاف ہوگا۔ اب بات سمجھ میں آئی۔؟''

''مجھے سمجھانے کے لیے تمہیں عملی مظاہرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔'' نجانے کیوں اسے دائنا کو دیکھ کر جلن ہو رہی تھی۔ وہ میران کی برہنہ کمر پر جونکیں رکھ رہی تھی۔

''ارے دائنا سے جل رہی ہو..... یہ تو بس اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔'' میران کے پاس بھی جیسے جادو کی کوئی چھڑی تھی۔ اس نے سبین کے دل کی بات پڑھ لی تھی۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔ بڑی معصوم ہے۔ سالوں سے یہاں بیٹھ رہی ہے۔ یہ ہی اس کی دکان ہے۔ پہلے اس کی والدہ بھی بیٹھتی تھیں


بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اُگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

قیمت۔/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف۔/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- /350 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- /500 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- /1000 روپے

**نوٹ:** اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

**منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:**

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

یہاں ..... لیکن اب صرف یہ بیٹھتی ہے۔"

سبین شرمندہ ہوئی۔ اسے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ دائنا بھی شاید دلوں کے حال جان لینے میں ماہر تھی۔ دونوں کی تکرار میں وہ ہلکے سے مسکرا رہی تھی۔

"یہ بولتی ہے۔؟"

"بولتی ہے لیکن بہت کم ..... میں سالوں سے یہاں آرہا ہوں اور میں نے اس کی آواز ایک دو بار ہی سنی ہے۔"

میران نے بتایا تھا۔ سبین کو ایک دم سے زویا یاد آ گئی تھی۔ وہ بھی اپنی مرضی سے بولتی تھی اور سبین اس کے بولنے کی شدت سے منتظر رہا کرتی تھی کہ وہ کوئی بات کرے، کوئی خواہش کرے جسے پورا کرنے کے لیے سبین اپنی سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ لیکن اس گھر کی بہت سی چیزوں کی طرح زویا بھی چپ رہ کر انجانے میں اسے اذیت دینے سے باز نہیں آتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر لگی تھی۔ میران کی کمر پر جہاں جہاں جونکیں رکھی گئی وہاں سے اب خون قطرے کی شکل میں باہر آ گیا تھا۔ مطلب کام اچھے سے ہو گیا تھا۔ دائنا نے ایک ایک کر کے بڑی مہارت سے ساری جونکیں ہٹالی تھیں اور میران کی کمر کو گیلے تولیے سے صاف کر کے پھر خشک کر دیا تھا۔ میران کھجور کی چٹائی سے اٹھا تو سبین نے دیکھا کہ اس کے جسم پر چٹائی کے چکور خانے بڑی ترتیب سے اُبھر آئے تھے

"آج کل تو یہ کام پارلرز میں بھی ہو رہا ہے۔ یہ لڑکی کافی ماہر لگتی ہے۔ پھر یہ کسی پارلر میں اسی کام کی جاب کیوں نہیں کر لیتی ....."

"ٹھہرو میں پوچھ لیتا ہے۔" میران نے کہا اور سبین کا سوال انگلش میں ترجمہ کر دیا۔ دائنا چند لمحے خاموش رہی تھی پھر اس نے درختوں کو دیکھتے ہوئے کوئی جواب دیا تھا۔ جسے سبین میران کے بنا ترجمہ کیے ہی سمجھ گئی تھی۔

"وہ کہہ رہی ہے کہ میں بہت سے پارلرز میں گئی ہوں لیکن وہاں کسی بھی جگہ کیل کا درخت نہیں ہے اور میں یہ کام یہاں بیٹھ کر ہی کر سکتی ہوں۔ کیل کے درخت کی چھاؤں میں ....."

دائنا کے جواب سے اب کی بار سبین کو بابا یاد آ گئے تھے۔ اپنے کام کو لے کر ان کی منطقیں بھی ایسی ہی عجیب ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار سبین نے اماں کو گھر کا فرش پکا کروانے کی بات کی تھی۔ کیونکہ سرخ اینٹوں کا وہ فرش اسے ہمیشہ سے ہی سخت ناپسند رہا تھا۔ لیکن تب بابا نے اس کی مخالفت کی تھی۔

"میں چونے کا کام انہی سرخ اینٹوں پر بیٹھ کر کر سکتا ہوں۔ جب جب میں یہاں اپنے طغروں کو پانی سے دھوتے ہوئے صاف کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ پانی کے ساتھ ساتھ میری پریشانی بھی اینٹوں کی درزوں میں چلی گئی ہیں۔"

"ہونہہ ..... پریشانیاں تو جوں کی توں تھیں۔ پتا نہیں بابا کون سے پانی کو بہاتے تھے اور کون سی پریشانیاں سرخ اینٹوں کی درزوں میں جا چھپتی تھیں۔" اس نے تلخی سے سوچا تھا۔

"کتنے پیسے .....؟"

"جتنے میں آپ کو راحت محسوس ہو ....." دائنا نے مسکرا کر حیازدہ سے لہجے میں کہا تھا۔ سبین ایک بار پھر سے حیران ہوئی تھی اور کسی حد تک شرمندہ بھی۔ دائنا کی ایک ایک بات اسے خود میں جھانکنے پر مجبور کر رہی تھی۔

میران نے اپنی ہپ پاکٹ سے کچھ پیسے نکال کر دائنا کے آگے کیے۔ جو اس نے ہاتھ میں پکڑنے کے بجائے کین سے بنی ایک ٹوکری کے اندر ڈلوا لیے۔ جس میں پہلے سے ہی کچھ پیسے موجود تھے۔ اس کا یہ انداز شاید اس لیے تھا کہ وہ کسی بھی گاہک کی رقم کو دیکھ نہ سکے کہ وہ اسے اس کے کام کی کتنی اجرت دے رہا ہے تاکہ اگلی بار اس کا کام کرتے وقت نہ تو وہ حد سے زیادہ گرم جوشی دکھائے اور نہ ہی سرد مہری .....

"میں کب سے سوچ رہا تھا یہ کروانے کا .....



لیکن میرے خیال سے یہ بالکل ٹھیک وقت رہا۔"

"وہ کیسے .....؟"

"فاسد خون کے ساتھ فاسد خیالات بھی نکل جاتے ہیں۔" اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔

"دیکھو۔ اب میں تمہیں ایسے مل رہا ہوں جیسے کوئی فرشتہ۔ میرے دل میں کوئی برائی نہیں ہے۔" کہہ کر وہ خود ہی ہنسنے لگا تھا۔ سبین بھی مسکرا کر رہ گئی تھی۔

"سبین ..... تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو۔"

"ایک گیسٹ ہاؤس ہے۔ این جی او نے ہی انتظام کیا تھا۔ جگہ کا نام تو مجھے نہیں آتا ....." وہ جان بوجھ کر جگہ کا نام بھول گئی۔

"اگر تم کہتی ہو تو میں تمہیں وہاں چھوڑ آتا ہوں۔ اس طرح تمہاری رہائش بھی دیکھ لوں گا۔"

"نہیں ....." اس نے سختی سے انکار کیا۔ وہ میران کو اپنے امیریکا کے "مشن" کی بھنک بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔ اب شام بھی ہو گئی ہے۔ میرے خیال سے ہمیں نکلنا چاہیے۔ واپسی کا سفر بھی طویل ہے۔"

دونوں نے شہر تک کے لیے ایک ہی ٹیکسی لی۔ پھر میران ایک جگہ پر اُتر گیا۔

"ویسے اگر تم اپنی این جی او سے دو دن کی چھٹی لے سکتی ہو تو لے لینا ..... پھر ہم دونوں ایک ساتھ ممی کو لینے سینی ٹوریم جائیں گے۔" ٹیکسی سے اتر کر اس نے کھڑکی میں سر ڈال کر کہا تھا۔

"بہت مشکل ہے۔ وہ کبھی نہیں مانیں گے۔" اس نے مشکل سے جھوٹ بولا۔

"مجھے کل پانچ بجے نکلنا ہے۔ اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر وہ مان گئے تو ....." میران نے آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ سبین کو پھر سے انکار میں سر ہلانے کے لیے اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرنا پڑیں۔

جس وقت وہ گیسٹ ہاؤس پہنچی دن غروب ہونے کے لیے بے تاب تھا اور سارا عالم جماہیاں لیتا ہوا نیند کی آغوش میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ رات انگڑائی لیتی ہوئی بیدار ہو رہی تھی۔ موسم میں لاجونتی گھلی ہوئی تھی۔ انگ انگ مہکا دینے والی ..... اسی مہک میں ماؤتھ آرگن کا راگ بھی پھیل رہا تھا۔ سبین دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ یہ صبح والا راگ ہی تھا۔ جلد ہی اسے وہ لڑکا اپنے روز کے راستے سے مخالف سمت سے آتا ہوا نظر آیا۔ صبح وہ جا رہا تھا اور اب آ رہا تھا۔ دن بھر لگتا تھا کہ وہ ماؤتھ آرگن ہی بجاتا رہا تھا۔ یہ ہی اس کا واحد کام تھا۔

گیسٹ ہاؤس کے اندر جانے سے پہلے وہ رک گئی۔ لڑکے کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی اسی تب ہی ملا تھا۔ سیاہ گدلی پینٹ پر سلیٹی رنگ کی ٹی شرٹ، سرخ جوتے جو اتنے پرانے ہو چکے تھے کہ اب ان کا اصل رنگ دیکھنے کے لیے آنکھوں کو تھکانا پڑتا تھا۔ سر پر سیاہ ربن، کانوں میں بالی، گردن پر جائینز رسم الخط کا ٹیٹو ..... چھوٹی چھوٹی شفاف آنکھیں، کلی سے پھول میں ڈھلنے والے خدو خال ..... وہ جیسا بھی تھا، اپنی بے فکری اور بے نیازی کی وجہ سے دلکش لگ رہا تھا۔ وگرنہ جو اس کا حلیہ تھا، کسی اور نے یہ سب اپنایا ہوتا تو احساس کمتری کے مارے سر نہ اٹھا سکتا۔

"ہیلو ....." وہ لڑکا اس کے بے حد قریب آ گیا تو سبین نے بڑے پیار سے اسے مخاطب کیا تھا۔ آج وہ اتنی خوش تھی کہ درختوں پودوں سے بھی گھنٹوں باتیں کر سکتی تھی۔ لڑکے کو اس نے اس لیے مخاطب کیا تھا کہ وہ اس کے راگ کی تعریف کرنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ صبح جب وہ بیدار ہونے کے بعد اس کا راگ سنتی ہے تو اسے کتنا اچھا لگتا ہے۔

لڑکے نے شاید اس کے "ہیلو ....." کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ ویسی ہی بے نیازی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سبین کو پھر سے اسے مخاطب کرنا پڑا تھا۔ اس بار لڑکا رک گیا تھا اور ماؤتھ آرگن بجانا چھوڑ کر اس نے سبین کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ سبین نے بہت پیارے لفظوں کا چناؤ کر کے اس کی موسیقی

کی تعریف کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ آج صبح اس کی موسیقی نے اسے کتنی اچھے انداز سے بیدار کیا ہے۔ وہ بے شک ایک سستا سا ماؤتھ آرگن بجاتا ہے لیکن وہ اسے اتنے اچھے انداز سے بجاتا ہے کہ وہ دنیا کا قیمتی ساز لگتا ہے۔

سین کی تعریف پر لڑکے کے چہرے پر کسی طرح کے تاثرات نہیں اُبھرے تھے۔ نہ مثبتی نہ منفی۔ وہ ابھی تک سوالیہ تھا۔ اس کی نظروں میں یہ عکس تھا کہ کیا وہ کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہے۔ سین حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ لڑکے نے جو اشارہ کیا، اس نے سین کے پیروں کے نیچے زمین کھینچ لی تھی۔

اشارے میں اس لڑکے نے سین کو بتایا تھا کہ وہ گونگا ہے اور بہرہ بھی..... نہ سن سکتا ہے اور نہ بول سکتا ہے، اس لیے اسے جو کہنا ہے اشاروں میں سمجھائے۔ سین اس کا اشارہ سمجھ کر دم بخود رہ گئی تھی۔

''اگر یہ گونگا بہرہ ہے تو اتنا اچھا ماؤتھ آرگن کیسے بجا لیتا ہے۔؟'' اپنے کمرے میں پہنچنے تک سین بس یہ ہی بات سوچ رہی تھی

اس گونگے بہرے لڑکے کا نام جائک ہے اور یہ سمبل کے درختوں کے جھرمٹ تلے بیٹھی دائنا کا بھائی ہے۔

☆☆☆

چکنے فرش پر کرسٹل کا گل دان پھولوں سمیت پھینکا گیا تھا۔ مہنگے اور نفیس گل دان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فرش پر کینچوؤں کی طرح دُور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ ایک شور بلند ہوا تھا جو چھناکے کے بعد خاموشی میں بدل گیا تھا اور شور سے زیادہ وہ خاموشی وحشت ناک تھی۔

واقعہ ایسا ہوا تھا کہ پیٹرسن خود کو پرسکون نہیں رکھ پایا تھا۔ جب کہ اسے ''گرینڈ فادر'' کی نصیحتیں ہمیشہ یاد رہتی تھیں کہ ایک فاتح آدمی کو جیت کے ساتھ ساتھ ہار میں بھی ایک فاتح کی طرح کا رویہ اپنائے رکھنا چاہیے۔ بردبار، بارعب اور باوقار.....

پیٹرسن کو ہر صورت پرسکون رہنا تھا کیونکہ اسے ''فاتح'' بننا تھا۔

جیفرسن سمیت باقی سب گول دائرے میں سر جھکائے اس دیوتا پر اپنا ایمان سونپے ہاتھ باندھے پجاریوں کی طرح کھڑے تھے۔ پھر جیفرسن ہی پیٹرسن کے پاس آیا تھا کیونکہ گروپ میں بس ایک اس کی ہی ہمت تھی کہ وہ پیٹرسن کے غصے کو جھیل پاتا۔

''پیٹی..... پرسکون ہو جاؤ.....'' اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا تھا۔

''میں کیسے پرسکون ہو سکتا ہوں جب تک مجھے پتا نہ چل جائے کہ یہ سب کس نے کیا ہے۔'' اس نے غصے سے کہا تھا۔

غصے میں وہ اور زیادہ دلکش لگ رہا تھا۔ اس کے گال سرخ ہو رہے تھے اور کان کی لوئیں بھی..... وہ بالکل اپنے باپ پر گیا تھا۔ اسے بھی غصہ ایک دم سے اور شدید آتا تھا۔ تب اس کے بھی گال اور کان کی لوئیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ پیٹرسن نے ایک چیز اضافی پائی تھی اور وہ تھی آنکھوں کے ڈوروں کا جامنی ہو جانا..... ایسی حالت میں اس پر سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔ وہ انہی لوگوں میں سے تھا جو جب جب غصے میں آتے ہیں تو ان کی کشش دو چند ہو جاتی ہے۔ اور ان کے جسم کی جلد سونے کی طرح تپ کر اپنے حجم سے بڑھ جاتی ہے۔

پیٹرسن کے بدن پر چڑھی سفید شرٹ کے بٹن اس طرح کھنچ گئے تھے کہ اس کا سراپا باہر آنے کو بے تاب نظر آ رہا تھا اور سر کے بالوں کی ایک موٹی لٹ ماتھے پر آ گری تھی۔

''کسی نے کچھ نہیں کیا..... تم غلط سوچ رہے ہو۔''

''نہیں۔ کوئی ہے۔ پہلے برنابی اور اب..... اب کون ہے جو غداری کر رہا ہے۔''

''یہ غداری نہیں تھی۔ یہ محض اتفاق تھا۔''

''یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ یہ مخبری تھی۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ میرے ادارے سے چھپنے



والی کتابوں کی جانچ پڑتال کرے اور مقدس کتابوں کی جانچ کرنے کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر اسی کھیپ کی جانچ کی گئی ہے جس میں چرس اسمگل کی جا رہی تھی۔ باقی کھیپ کو جانے دیا گیا ہے۔ پولیس کو نہ صرف اس کنٹینر کا نمبر معلوم تھا بلکہ ان کارٹن کے بارے میں بھی علم تھا جس میں چرس تھی اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ سب اتفاق تھا۔''

جیفرسن خاموش ہو گیا تھا۔ پیٹرسن کے اندازے درست اعداد و شمار بیان کر رہے تھے۔

''لیکن اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو گا ڈان..... آپ پریس میں وضاحت دے چکے ہیں کہ کوئی ہمارے ادارے کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس لیے اس نے ہمارے ادارے سے شائع ہونے والی مقدس کتابوں کے ذریعے اسمگلنگ کی ہے۔ آپ کے اس بیان نے سب کو مطمئن کر دیا ہے۔''

''لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے جاننا ہے کہ کون ہے وہ؟'' پیٹرسن نے اپنی پینٹ کے ساتھ منسلک گیلس کو کھول کر پرے پھینکا تھا۔ گرینڈ فادر کی ساری نصیحتیں یاد ہونے کے باوجود بھی وہ پرسکون نہیں ہو پا رہا تھا۔

''کارزل میں یہ کام تمہارے ذمے لگاتا ہوں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے جو بظاہر تو میرا دوست ہے لیکن پس پردہ میرا دشمن ہے۔''

''جو آپ کا حکم ڈان.....''

کارزل کے جانے کے بعد ایک ایک کر کے باقی سب بھی نکل گئے تھے۔ صرف ایک جیفرسن وہاں ہی موجود رہا تھا۔

پیٹرسن نے اپنی شرٹ کے بٹن کھول کر اسے اپنے جسم سے الگ کیا تھا۔ پھر خاموشی اور سکون سے وہ ایک اونچے صوفے پر کسی شہنشاہ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ غصہ نکل گیا تھا۔ اب اطمینان سے سوچنے کا وقت تھا۔ اس کے تپے ہوئے گال، سرخ ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آنے لگی تھیں۔ غصے نے جو اس کے خدوخال بے ترتیب کر دیے تھے تو اب وہ دوبارہ سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ رہے تھے۔ اس کی درویشانہ صفتیں ظاہر کرنے والی معصومانہ خوب صورتی واپس لوٹ رہی تھی۔

جیفرسن نے کمال ہوشیاری سے دراز کھول کر وہاں سے ''کنگ آف ڈنمارک'' کے سگار نکالے تھے اور ایک سگار سلگا کر پیٹرسن کو پیش کیا تھا۔ پیٹرسن نے اسے تھام لیا تھا۔ مطلب اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔

''اتنا غصہ مت کیا کرو بھائی..... تم جانتے تو ہے کہ تم میں میری جان ہے۔'' جیفرسن نے پیچھے آ کر ہلکے سے اس کے برہنہ کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور وہاں مساج شروع کر دیا۔ وہ اسے آرام پہنچانا چاہتا تھا۔ پیٹرسن نے بھی ہلکے سے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ گرینڈ فادر کے بعد پوری دنیا میں سب سے زیادہ محبت اسے اپنے اسی چھوٹے بھائی سے تھی۔

''لیکن مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ گروپ میں میرا دشمن کون ہے۔'' تین چار کش لے کر سلیٹی دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے اس نے کہا۔

''میرے خیال سے یہ جوزف کا کام ہے۔ وہ برنابی کا گہرا دوست تھا۔ اور برنابی کی طرح وہ بھی تم سے جلنے اور حسد کرنے کے جذبے میں مبتلا ہے۔''

''اگر یہ کام جوزف کا ہی ہوا تو اسے بھی برنابی کے پاس جانا ہو گا۔''

''فی الحال تم سب بھول جاؤ..... اتنا غصہ تمہارے صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''

''ولیم بھی اسی طرح غصہ کیا کرتا تھا۔ یہ شاید اسی کا اثر ہے۔'' پیٹرسن نے کہا تو جیفرسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے باپ کا ذکر سالوں میں ایک آدھ بار ہی کیا کرتا تھا۔ وہ بھی کسی خاص خاص موقعے پر یا تب جب اس کے ذہن میں کوئی

خاص بات ہوتی تھی۔ آج وہ کیا سوچ رہا تھا۔؟

"تمہیں سکون کی ضرورت ہے پیٹی۔"

پیٹرسن خاموش رہا تھا۔

"تمہیں یاد ہے پیٹی! بچپن میں ہم رش جھیل جایا کرتے تھے۔ وہاں ڈیڈ ایک عورت سے جوتیں لگوایا کرتے تھے۔"

"ہاں..... یاد ہے مجھے۔ اس عورت کی ایک ننھی بچی بھی بیٹھتی تھی وہاں پر..... بڑی بڑی آنکھیں ہوا کرتی تھی اس کی۔"

"اب وہ لڑکی جوان ہو چکی ہے اور اس کی خوب صورتی..... قیامت خیز ہے۔"

"کیا واقعی.....؟"

"یقین نہیں تو خود دیکھ لو....." جیفرسن نے کچھ ایسی ادا سے کہا کہ پیٹرسن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ جیفرسن معنی خیزی سے مسکرا رہا تھا۔ لیکن کیا وہ پیٹرسن کی فطرت سے واقف نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ پیٹرسن کو عورتوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔

"نہیں....." پیٹرسن نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اٹھ کر اپنے کیبرے میں چلا گیا۔ یہ اس کی ناراضی کی واضح علامت تھی۔

جیفرسن منہ لٹکا کر وہاں ہی کھڑا رہا تھا۔ اس نے غلط وقت پر داؤ کھیلا تھا۔

بیڈ پر گرتے ہی پیٹرسن کو ایما یاد آئی تھی۔ جس کے بعد اسے دنیا کی ساری عورتوں سے نفرت ہو گئی تھی۔

ایما..... پیٹرسن کی ماں..... اس کی پہلی بے پناہ محبت اور آخری بے انت نفرت.....

کیونکہ بہت سی برائیوں کے ساتھ ایما میں ایک برائی یہ بھی تھی کہ وہ ایک کال گرل تھی۔

☆☆☆

میران نے اپنا مختصر سا سامان پیک کیا تھا۔ اس نے ربیکا کے لیے ابھی سے بہت سے کھانے بنا کر فریج میں رکھ دیے تھے۔ اس کا کمرہ سجا دیا تھا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پھول بھی ابھی لا کر رکھ دیتا اور موم بتیوں کو بھی ابھی روشن کر دیتا.....

وہ ان دنوں بہت خوش تھا۔ کل تمام دن کی تھکن سے ملاقات نے اسے مزید نہال کر دیا تھا۔ پاکستان سے پہلی ملاقات کے بعد سے وہ اسے بہت تفصیل سے سوچتا رہا تھا۔ ایک گھبرائی گھبرائی سی لڑکی، جو چادر کے کونے میں انگلیاں لپیٹ کر اپنی بے چینی کو دور کرتی ہے۔ ہاں کچھ ملاقاتیں ایسی ہی ہوتی ہیں جن کی یادیں آپ کو ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ وہ دوستوں کو بتاتا رہا تھا کہ کس طرح اس نے ایک لڑکی کے ماڈل توڑ دیے اور پھر آگے کیا کیا ہوا۔ سب ہن کر ہنستے تھے اور وہ یاد کر کے..... کیسا عجیب اتفاق تھا کہ اب وہ ہی لڑکی اس کے شہر میں رہ رہی تھی۔ اس نے کل سین سے پوچھا بھی تھا کہ کیا وہ اس کے ساتھ ممی کو لینے جانے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ سین نے اپنی مجبوریاں بتا کر انکار کر دیا تھا۔ پھر بھی میران کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر سین کو کال کرے، اس سے پوچھے کہ کیا این جی او اسے آف دینے پر رضامند ہوئی کہ نہیں.....؟

پھر اس نے خود ہی یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔ یہ کسی کی زندگی میں حد سے زیادہ مداخلت تھی۔ پھر ابھی ان کی ملاقاتیں ایسی نہیں ہوئی تھیں کہ وہ اس کے ساتھ اتنا لمبا سفر کرنے میں آرام دہ محسوس ہوتی۔

چار بجے کے قریب جب وہ دروازے کو لاک کر کے گھر سے نکلنے والا تھا تب اس کا سیل فون بجا تھا۔

"میں سین بول رہی ہوں میران..... مجھے این جی او نے آف دے دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تم امریکا گھومو..... وہاں موجود مساجد اور چرچ کے تخمینے اکٹھے کرو۔ اگر میں تمہارے ساتھ جانا چاہوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"اعتراض.....؟" میران نے اچنبھے سے پوچھا تھا اور اگلے ہی پل دونوں ہنسنے لگے تھے۔

☆☆☆



پہاڑ رفتہ رفتہ بڑھتے اونچے ہوتے جا رہے تھے۔ سڑکیں پر پیچ اور بل دار..... سفر لمبا تھا اور سین کا دل کر رہا تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو..... فضا میں جیسے ازلی خاموشی تھی۔ کوچ سے باہر درختوں کے پتے اور شاخیں نجانے کون سا راگ گا رہی تھیں کہ تتلیاں اس راگ پر رقص کرتی، لہراتی ہوئی جھنڈوں کی شکل میں وہاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ سین نے یہ تو سنا تھا کہ بنگال میں ایسے جادوگر موجود ہیں جو کہیں بھی بین بجائیں تو وہاں سے سانپ نکل آتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ امریکا کے ایک خطے میں درختوں جیسے بے جان جادوگر بھی موجود ہیں۔ جن کی بین پر تتلیاں لبیک کہتی ہیں۔

کوچ میں کھانا سرو کرنے کے بعد اب سوال و جواب کا سیشن شروع کیا جا رہا تھا۔ پہلا سوال کسی ایکٹر کے بارے میں تھا۔ جس کا جواب میران کو نہیں آتا تھا۔ جس نے اس سوال کا درست جواب دیا تھا اسے ایک ٹیڈی بیئر دیا گیا تھا۔

"مجھے بھی ٹیڈی بیئر چاہیے۔" سین نے بچوں کی طرح ضد کی تھی۔

"او کے..... کوشش کرتا ہوں۔"

آگے مزید دس سوال پوچھے گئے تھے جس میں سے میران کسی ایک کا بھی جواب نہیں دے پایا تھا۔

"میران..... تم میرا ایک چھوٹا سا کام نہیں کر سکتے۔"

"یار تمہیں بازار سے ٹیڈی بیئر لے دوں گا۔" اس نے کہا تھا اور پھر پوچھے جانے والے بارہویں اور آخری سوال کا جواب دے دیا تھا۔

"یہ لو..... آ گیا تمہارا ٹیڈی بیئر..... پتا نہیں لڑکیوں کو ٹیڈی بیئر اتنے پسند کیوں ہوتے ہیں۔ کیوں وہ ان کو اپنے ساتھ ایسے چپکا چپکا کر رکھتی ہیں جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان ہو۔"

"کیونکہ لڑکیوں کو تحفظ پسند ہوتا ہے۔"

"اور یہ تحفظ وہ ٹیڈی بیئر میں ڈھونڈتی ہیں؟"

"ہاں۔" وہ ہنسی تھی اور اس کی ہنسی میں جلترنگ کے سارے سر شامل تھے۔

محبت پھول کے اندر کا زرگل ہے۔ جس کے اندر پورے پودے کی بقا مقید ہوتی ہے۔

میران کو نجانے کب نیند آ گئی تھی۔ اس کا سر سین کے کندھے پر ڈھلک گیا تھا اور سین کا دل چاہا کہ وہ قیامت تک اسی طرح بیٹھی رہے۔ کیا وہ دونوں عالم ارواح سے ایسا ہی گہرا تعلق بنا کر نکلے تھے؟ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ ان سوچوں کو سوچنی لگی تھی جو کبھی گھر کی کھڑکی سے آرٹ کالج کو دیکھتے ہوئے اس کے دماغ میں آتی تھیں۔

محبت اتھاہ گہرائیوں والا چشمہ ہے۔ اس کی آبیاری کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

بابا، زویا، اماں، طغرے، اسمگلنگ، ڈینی..... وہ اس وقت کسی ایک کے بارے میں بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ بس..... سوائے میران کے..... سوچتے سوچتے نجانے اسے بھی کس وقت نیند آ گئی تھی اور اس کا سر میران کے سر کے اوپر آ گیا تھا۔

محبت شہد کی مٹھاس ہے۔ اور اس میں شہد کا بھاری پن نہیں۔

ذہن سوتے وقت بھی وہ ہی غلطیاں کرتا ہے جیسا ہم اسے حکم دیتے ہیں۔ جیسا ہم اسے کرنے کو کہتے ہیں۔ سفر لمبا تھا لیکن اتنا لمبا نہیں جتنا وہ دونوں بند آنکھوں کے پیچھے جاگتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ طے کر رہے تھے۔

محبت شبنم کی اوس ہے۔ پھول کی ہر پتی کے لیے اس کا غسل لازم ہے۔

☆☆☆

ربیکا پہلے سے صحت مند نظر آ رہی تھی اور اس کی رنگت بھی کھلی ہوئی تھی۔ چہرہ شاداب ہو چکا تھا۔ صحت افزا مقام نے اس پر مثبت اثر ڈالا تھا۔ میران کو اس نے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور میران کسی ننھے سے بچے کی طرح رو دیا تھا۔ دونوں کا یہ جذباتی ذاتی سین دیکھ کر سین کو احساس ہوا تھا کہ اسے وہاں نہیں آنا چاہیے تھا، لیکن ربیکا نے جلد ہی

اس کی غفت دُور کردی تھی۔ وہ اس کے بیٹے کی پسند تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی سب جان گئی تھی۔ جلد ہی اس نے سین سے بہت دوستانہ تعلق بنالیا۔

ربیکا یہ جان کر بہت خوش ہوئی کہ وہ پاکستان سے آئی ہے۔

"تم کبھی سرگودھا گئی ہو۔؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔ میران اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا تھا۔ ربیکا نے بھی عین اسی لمحے میران کو دیکھا تھا اور وہ چپ ہوگئی۔ وہ اپنے دکھی بیٹے کو مزید دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

"نہیں....." سین نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مختصر جواب دیا تھا۔ ربیکا نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

سامان بندھا ہوا تھا اور واپسی کی ٹکٹس بھی میران نے جاتے وقت ہی بک کروالی تھیں۔ جلد ہی انہوں نے واپسی کا سفر طے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایسا اس لیے بھی جلدی ہوا تھا کیونکہ ربیکا وہاں ایک لمحہ بھی مزید گزارنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

پورے دو دن بعد واپس گیسٹ ہاؤس آکر سین سوچنے لگی تھی کہ وہ یہاں کس لیے آئی تھی اور کس کام میں گرفتار کردی گئی تھی۔ وہ کس قید سے ڈر رہی تھی اور اب کس قید میں قید ہو جانے کے لیے دعا گو تھی۔ زندگی اس کے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہی ہے۔ آنکھ مچولی یا کوکلا چھپا کی..... آنکھ مچولی جس میں پتا نہیں چلتا کہ آپ کی تھکن زدہ باری کسی اور کو منتقل ہونے والی ہے یا پھر سے آپ کو نئے سرے سے اسے ادا کرنا ہے۔ کوکلا چھپا کی..... جس میں ہر لمحہ ڈر رہتا ہے کہ آپ کو پیچھے سے ایک دھپ نہ پڑ جائے۔ وہ دونوں ہی کھیلوں سے ڈرتی تھی۔ پیچھے سے دھپ پڑنے سے بھی اور نئے سرے سے تھکن زدہ باری کو ادا کرنے سے بھی.....

شام میں اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے گھر کال نہیں کی، جبکہ بابا نے اسے کہا بھی تھا کہ وہ ہر روز نہیں تو ہر دو دن بعد انہیں لازمی کال کر کے اپنی خیریت کے بارے میں بتاتی رہے۔

"سلام بابا....." اس کی خوش کن آواز سن کر بابا جیسے پل بھر میں مطمئن ہوگئے تھے۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو، خوش ہو؟"

"جی۔ بہت خوش ہوں بابا!" اس نے چہکتے ہوئے بتایا تھا۔

"کام ٹھیک سے سیکھ رہی ہو؟" معصوم بابا نے معصوم سوال کیا تھا۔

"جی....." اور اگلے ہی پل اس کی آواز دھیمی ہوئی تھی۔

☆☆☆

اس نے اپنے نیویارک قیام کا آخری ڈنر میران کے گھر میں کیا۔ ربیکا کی دعوت پر..... وہاں ہی ربیکا کے بارے میں اسے پتا چلا۔ خود ربیکا کی زبانی اور کچھ کچھ میران کے ذریعے..... پاکستان سے ایک خوبرو نوجوان کی آمد، ربیکا کا اس کی محبت میں مبتلا ہونا، پھر دونوں کی شادی اور عیسیٰ کی غیر یقینی موت..... ربیکا نے پرانی تصویریں نکال کر سین کو بھی دکھائیں، جنہیں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ میران اپنے والد پر دس فی صد بھی نہیں گیا تھا۔ پشمینے میں لپٹا عیسیٰ تو کوئی ولی لگتا تھا۔ ولی بھی ایسا جو اپنے عہدے اور عہد دونوں سے بے نیاز ہو۔

میران خوش تھا۔ ربیکا بہت اچھے انداز میں عیسیٰ کا ذکر کر رہی تھی۔ اور وہ عیسیٰ کے باتوں میں "تھا" کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ مان چکی تھی کہ عیسیٰ مر چکا ہے۔ کھانا بے حد پر تکلف ماحول میں کھایا گیا۔ سین نے کھانے کے بعد میران کے ساتھ مل کر برتن دھلوائے۔ ربیکا نے پہلے تو منع کیا لیکن میران نے ربیکا کو دیکھ کر آنکھ ماری اور ربیکا مسکرا کر اپنی جگہ پر ہی چپکی رہی۔ میران کی یہ حرکت سین نے بھی دیکھ لی۔ شرم سے وہ کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں رہی۔

"کل صبح کتنے بجے کی فلائٹ ہے تمہاری؟" میران برتن دھو دھو کر سین کو پکڑا رہا تھا اور وہ ان پر خشک کپڑا مار کر ایک طرف رکھتی جا رہی تھی۔



"کل صبح کی دس بجے کی۔"

"پھر کب آؤ گی؟"

"جب حکم ہوگا۔"

"مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔"

"مجھے خود..... دوبارہ یہاں آنے کا....."

"سین.....؟"

"بولو میران.....؟"

"میں ان دنوں زندگی میں پہلی بار اتنا خوش ہوں۔"

"عجیب اتفاق ہے۔ میں بھی....."

"کیا تمہارے پاس بھی دو وجوہات ہیں۔ میرے پاس تو دو ہیں۔ ایک ممی کی صحت یابی اور دوسری....."

"میرے خیال سے مجھے اب چلنا چاہیے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" جلدی سے اس نے کپڑا ایک طرف رکھ دیا تھا۔

"تمہیں دیر نہیں ہو رہی..... تم ہچکچا رہی ہو اپنا نام سنتے ہوئے۔"

"کیونکہ میں سب کچھ ابھی نہیں سننا چاہتی میران..... میں پھر سے ملاقات کے لیے بھی کچھ رکھنا چاہتی ہوں۔ سب ایک ہی ملاقات میں ختم نہیں کر دینا چاہتی، کچھ اُدھار بھی رکھنا چاہیے، باتوں میں، ملاقاتوں میں اور تقدیروں میں..... کیونکہ تقدیر خود پر ادھار رکھتی ہے نہ احسان..... وہ جلد سے جلد ان دونوں چیزوں سے مبرّا ہونا چاہتی ہے۔ ہم اپنی ملاقات میں کچھ ادھار رکھیں گے تو ہماری تقدیر ہمیں پھر سے ملوانے کی کوشش کرے گی تاکہ تب ہم سارے حساب کتاب بے باق کرلیں۔"

میران نے سین کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ سمجھ دار بھی تھی۔

"مجھے جانے دو میران..... مجھے جانا ہے اور جا کر پھر سے آنا ہے۔؟"

"میں ہر پل تمہارا انتظار کروں گا۔" میران نے جذب سے کہا تھا۔ سین جو پہلے سے ہی اس کی محبت میں موم بنی ہوئی تھی اس گرم لہجے سے پگھل کر رہ گئی۔

☆☆☆

ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ سینی ٹوریم میں رہ کر آنے کے بعد ربیکا اب پھر سے اس ماحول میں جذب ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ عیسیٰ کی خوشبو کو وہ لمحہ بہ لمحہ پھر سے اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ اس بات پر یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ عیسیٰ مر چکا ہے۔ یہ صرف اس کی خوشبو ہے۔ جو زندہ ہے اور صرف اس کے لیے زندہ ہے تاکہ وہ اپنی زندگی میں عیسیٰ کی کمی کو محسوس نہ کرے۔ وہ قدرت کی اس فیاضی کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہی تھی۔

میران دیکھ رہا تھا کہ ربیکا شاید ٹھیک تو ہوگئی ہے لیکن ٹھیک سے زیادہ خاموش ہوگئی ہے۔ وہ اس کے ساتھ مختلف جگہوں پر جانے کے پروگرام بنانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتا تھا لیکن ربیکا اس کے ہر پروگرام کو یہ کہہ کر رد کرتی جا رہی تھی کہ اس کا کہیں بھی گھومنے پھرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ بس گھر میں رہنا چاہتی ہے۔

میران اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیلی کی بے کلی سمجھا تھا۔ خود میران کو بھی سین کے جانے کے بعد پھر سے اپنی روٹین میں واپس آنے میں بہت وقت لگا تھا۔ پندرہ دنوں کی ان ملاقاتوں میں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تو اپنے بچپن سے سین نامی دوست کا عادی رہا ہے۔ اب وہ چلی گئی تھی تو اسے عجیب بے کیفی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ پھر سے آئے گی۔ لیکن کب آئے گی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ آئے گی بھی کہ نہیں..... تو کیا اس صورت میں اسے پاکستان جانا پڑے گا۔؟

گھر کی خاموشی میں ربیکا بھی خاموش تھی۔ ساتھ ایک دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ پھر سے پرانی روش پر نہ چل پڑے۔ میران نے اس کی حرکتوں پر نظر رکھنی شروع کردی تھی۔ نتائج فی الحال

ثبت ہی تھے۔ ابھی تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ لیکن اکثر اوقات کلب سے واپسی پر اسے گھر میں سگریٹ کی تیز خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک ایک چیز کی جانچ کرتا تھا لیکن سگریٹ کا کوئی سراغ نہیں لگا پاتا تھا۔ پھر وہ سر جھٹک کر اپنے شکوک رفع کرتا تھا۔ شاید یہ سب اس کی غلط فہمیاں تھیں، اس کے وسوسے تھے، وہم تھے۔

سب حقیقت تھی۔ وہ کیسے جان پاتا.....

"ممی مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ وہ عادتیں پھر سے نہیں اپنائیں گی۔"

"تمہیں اس کام کے لیے وعدے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بس آپ نہیں جانتیں۔ ڈاکٹرز نے آپ کے بارے میں مجھے کیا کیا ہدایات دی ہیں۔ آپ وہاں بہت عرصہ ایک ہجوم میں رہی ہیں۔ اب مجھے کام کرنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس گھر کی تنہائی میں آپ پھر بری عادتیں اپنالیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" ربیکا سپاٹ انداز میں بولی تھی۔

"میں نہیں چاہتا کہ میں آپ پر پابندیاں لگاؤں، آپ کو گھر سے باہر نہ جانے دوں، آپ کے پاس پیسے نہ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی کا اس طرح ہی مزا لیں جیسے دوسرے لوگ لے رہے ہیں۔ جیسے آپ کی دوستیں لے رہی ہیں۔ آپ برے لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیں کیونکہ اگر آپ ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے تو وہ آپ سے آپ کا ضمیر چھڑوا دیتے ہیں۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ ہم اس گھر میں بہت ہنسی خوشی زندگی گزاریں..... ہمیں کسی طرح کا کوئی غم نہ ہو....." وہ بولتا جا رہا تھا۔ ربیکا کا سرد اور سپاٹ انداز اسے ایک بے چین سے تجسس میں مبتلا کرتا جا رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو آپ مجھے بتائیں..... پلیز آپ مجھے آپ پر اعتماد کرنے کا موقع دیں۔ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ پھر سے بری چیزوں کے قریب نہیں جائیں گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" میران نے اپنا ہاتھ آگے کیا تھا۔ ربیکا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

سینی ٹوریم نے اس کا علاج ہی نہیں کیا تھا۔ اسے پتھر کا بھی کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ واپس آ گئی تھی، ایک بار پھر سے جانے کے لیے..... وہ انتظار میں تھی، بے تاب تھی، اور بات پر چھک رہی تھی۔

بابا اور زویا نے حیرت سے اس کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھا تھا۔ کیا پندرہ دن کے لیے کراچی جانا اسے ایسا ہی سرشار کر سکتا تھا؟ بابا کو علم ہوتا تو وہ کب کا اسے کراچی بھجوا چکے ہوتے۔ پندرہ دنوں کی غیر حاضری کے بعد وہ جیسے کسی اور ہی سبین سے مل رہے تھے۔ پرانی جون کو وہیں کراچی میں چھوڑ آئی تھی اور جو نئی بدل کر آئی تھی وہ خوش گوار حیرت کا سبب بن رہی تھی۔ بابا نے اس کی خوشی کو نوٹ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے بال چونے سے سفید نہیں کیے تھے لیکن وہ مطمئن تھے کہ چلو وہ تو خوش ہے ناں..... طلاق کے بعد انہیں لگا تھا کہ وہ سنبھل ہی نہیں پائے گی اور نہ ہی انہیں سنبھلنے دے گی۔ وقتی طور پر وہ بھول گئے تھے کہ وہ آج کل کچھ کچھ باغی ہو گئی ہے۔ انہوں نے اس کی ضدوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

سبین بابا اور زویا سے ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے زندگی بھر میں اس کی وہ ہی تو دونوں سہیلیاں بنی ہوں بس.....

زویا بھی اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی پہلی والی سبین آپی پھر سے لوٹ آئی تھی، جو اس کے ساتھ مل کر گھر کے سارے کام کرتی تھی۔ اس کے



بال بناتی تھی، اسے لے کر بازار جاتی تھی۔ جس کے ساتھ دوپہر کی گرمیوں میں اس نے سٹے اور آلو ابال کر کھائے تھے اور سردیوں میں بڑے شوق سے گڑ کی چکی اور چاول کی پنیاں بنائی تھیں۔

ڈینی نے سبین کو پیسے دے دیے تھے۔ لیکن ایک چوتھائی..... جیسا کہ "زبانی معاہدے" میں طے کیا گیا تھا۔ وہ کچی گولیاں کھیلنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ سبین کا استعمال آگے بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اب تو وہ سبین کو پورے پیسے دے دیتا تو سبین نے تب بھی امریکا جانے کے لیے اسے انکار نہیں کرنا تھا۔ سبین کو نہ صرف ابھی مزید پیسے چاہیے تھے بلکہ اسے ہر صورت باہر بھی جانا تھا۔ میران سے ملنے کے لیے۔

وہ ایک چوتھائی پیسے بھی اتنے زیادہ تھے کہ انہیں تھام کر سبین کو کتنی دیر یقین ہی نہیں آیا تھا کہ اس نے "چونے" سے اتنے پیسے کما لیے ہیں۔ رقم اس کے ذہن میں تو تھی لیکن جب تک وہ اس کے ہاتھ میں نہیں آ گئی وہ بے یقینی کا ہی شکار رہی..... اسے لگتا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے گا۔ ڈینی بنا پیسے دیے ہی بھاگ جائے گا۔ کہیں گم ہو جائے گا یا وہ ہی مر جائے گی، پر وہ اتنے پیسے نہیں کما سکے گی اور "چونے" سے تو ناممکن..... اب ان ہی پیسے کو ہاتھ میں پکڑ کر وہ ایسے مسرت سے کھل رہی تھی جیسے آرٹ کالج کے باغ میں گل داؤدی کے پھول کھلا کرتے تھے۔ چچا رشید غلط کہتے تھے کہ اس کے نازک ہاتھ ڈائی نہیں چلا سکتے..... ان ہی نازک ہاتھوں نے ڈائی چلائی تھی اور ایسے چلائی تھی کہ اردگرد کے سارے کارخانوں کے منافع کو مات دے دی تھی۔

ان پیسوں سے سب سے پہلے اس نے زویا کے ساتھ مل کر گھر میں تبدیلیاں کرنے کا آغاز کیا تھا۔ معمولی نوعیت کی تبدیلیاں..... اس نے گھر میں نیا رنگ کروایا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے بدلے تھے۔ کمروں میں کارپٹ بچھایا تھا۔ اپنے اور زویا کے پلنگ سے دیسی روئی والے گدے ہٹا کر ان پر فوم والے میٹرس رکھے تھے۔ باہر صحن کی اجڑی کیاری میں طرح طرح کے پھول دار پودے لگوائے تھے، طرح طرح کے گملے بھی لا کر رکھے تھے، بطخوں اور راج ہنس کی شکلوں والے، فرنیچر جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اسے بھی بدلنے کو بابا کو کہہ دیا تھا۔ وہ دونوں آئے دن بازار جا رہی تھیں اور سامان کے ساتھ لدی ہوئی واپس گھر آتی تھیں۔ کھانا پکانے کا اس کا دل نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ بھی زیادہ تر بازار سے ہی آ رہا تھا۔ جبکہ بابا اسے دبے لفظوں میں کئی بار کہہ بھی چکے تھے کہ ان سے بازار کی روٹی نہیں کھائی جاتی، چلو سالن تک تو بات ٹھیک ہے۔

"کل آٹا گوندھ کر گھر میں روٹی بنا دوں گی۔ آج کھا لیں۔" اور بابا کو کل کا انتظار کرتے پورے دس دن ہونے کو آئے تھے۔ ڈھیٹوں کی طرح وہ بازار کی خمیری روٹی، جو ہوا لگتے ہی سخت ہو جاتی تھی، کو دانتوں تلے چبا چبا کر کھاتے رہتے تھے۔ سبین سے بار بار اس لیے نہ کہتے تھے کہ نجانے کراچی میں کام کر کر کے کتنا تھک چکی ہو۔

"اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟" ایک دن بابا نے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔ اور بابا کا یہ سوال اسے واپس اس کے حواس میں لایا تھا۔ وہ کراچی کام سیکھنے گئی تھی۔ کمانے کے لیے نہیں..... اسے یہ تاثر ہرگز نہیں دینا تھا کہ اس کے پاس کافی پیسے آ گئے ہیں۔ بابا کی نظر میں بھی ابھی وہ ہی خریداری تھی جو اس نے گھر کے لیے کی تھی۔ جو ظاہر تھی، اگر وہ زویا اور سبین کی الماری کھول کر چیک کرتے تو دیکھتے کہ وہاں کیا کیا کچھ نہ بھرا ہوا تھا۔ کپڑے، جوتے، جیولری، بیگز.....

"وہ میرے کام سے بہت خوش ہوئے ہیں۔ میں نے سیکھنے سے زیادہ وہاں کا کام کیا ہے۔ انہوں نے جاتے ہی مجھے وہاں مانیٹر (نگران) بنا دیا۔ یہ سب اسی کے پیسے ہیں۔" وہ آج کل بہت اطمینان سے جھوٹ بولنے لگی تھی۔ ایئر پورٹ کی کھردری جلدوں والی انتظامیہ کو وہ بے وقوف بنا کر آ

رہی تھی۔ سیدھے سادے بابا کیا چیز تھے اب اس کے آگے۔ انگریزی کے گہرے لفظوں میں بابا کو الجھا کر وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا جھوٹ سچ مان لیا جائے گا۔

"اتنے سارے.....؟" بابا اس کی بات پر کیسے یقین کرتے..... انہیں خود یہ کام کرتے ہوئے سالوں گزر چکے تھے۔ آخر ان کی بیٹی نے پندرہ دن میں وہاں کس قدر کام کر لیا تھا کہ اس کے پیسے ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ سبین کو اندازہ ہوا کہ اس کے بابا ایئر پورٹ کی کھردری ساخت والوں سے زیادہ بے وقوف تو ہو سکتے ہیں لیکن پس ماندہ نہیں۔ پھر سب سے بڑی بات..... وہ اس کے بابا تھے۔

"اتنے بھی نہیں ہیں۔ یہ پردے تو میں لنڈے سے لے کر آئی ہوں، اور یہ کارپٹ بھی کوئی عورت غلط کٹوا بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے سستے داموں خرید لیا۔"

بابا کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ کہ وہ مطمئن ہو جاتے یا خاموش ہو جاتے۔

بقیہ کی ساری خریداری اس نے بہت چپکے چپکے سے کی تھی۔ اپنی بوریت کا حل اس نے بازار میں پھر کر خریداری کرنے سے خوب نکال لیا تھا۔ وہ زویا کو ساتھ لے کر انارکلی بازار چلی جاتی۔ دونوں وہاں بے مقصد گھومتی رہتیں..... چاٹ کھاتیں، دہی بھلے، آئس کریم، گول گپے..... کبھی وہ بھی لڑکے لڑکیوں کو بازاروں میں اسی طرح بیٹھ کر پیسے کی فکر سے بے نیاز کھاتے ہوئے، خریداری کرتے ہوئے دیکھتی تھی، اور ان سب کو دنیا کے خوش قسمت لوگ جانتی تھی۔

آج وہ بھی ان جتنی ہی خوش قسمت تھی۔ چیزیں جو جو اسے پسند آتی جارہی تھی وہ انہیں خریدتی جارہی تھی۔ سلے ان سلے سوٹوں کا تو اس کی الماری میں ڈھیر لگ چکا تھا۔ چونکہ ساری زندگی غربت میں گزاری تھی اور سستے سوٹ، جوتے ہی پہنے تھے تو اب اسے پسند بھی وہی آرہے تھے۔ مہنگی دکانوں کے پھیکے رنگوں والے جدید سوٹ تو اسے بوڑھی مائیوں کے پہناوے لگ رہے تھے۔ زویا بھی نت نئے چمڑی کے دوپٹے اوڑھ کر خوش ہوتی رہتی تھی۔

ایسے ہی کسی دن انارکلی بازار میں گھومتے ہوئے رشید کی اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ رشید اسے دیکھ کر ساکت ہو گیا تھا۔ سبین پہلے سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی، اور اس سے بڑی قیامت خیز بات..... وہ سچے دل سے مسکرا رہی تھی۔ رشید کو کرنٹ لگنا تو بنتا ہی تھا۔

سبین نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اس رشید نامی لڑکے پر جو بدقسمتی سے اس کا تایا زاد تھا تھوک دے، جو اپنے سے زیادہ اپنی ماں کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ جس کی اپنی ریڑھ کی ہڈی نہیں تھی۔ لیکن سبین نے ایسا نہ کیا..... اس نے اس تھوک کو بھی اہمیت دی کہ وہ کیوں اسے ایک غلیظ شخص پر پھینک کر گندا کرے۔

زندگی نے اسے اپنے رنگ دکھائے تھے۔ پورے بیس سال..... اب وہ چاہتی تھی کہ زندگی بھی دیکھ لے کہ انسان کیا کیا رنگ رکھتا ہے۔ کیا کیا رنگ اپنا سکتا ہے۔ وہ کیسے اپنے پرانے رنگوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ سب اسے زنگ آلود لگنے لگتا ہے اور یہ سب نیا..... خواہ وہ پیتل ہی کیوں نہ ہو اور اس نے بہت جلد زنگ سے بھی کریہہ صورت کیوں نہ اختیار کر لینی ہو۔ وہ سب اسے سونے، ہیرے کی طرح کا دمکتا ہوا لگتا تھا۔

وہ جو پچھلے تیئس سالوں سے اس گھر میں رہ رہی تھی۔ پندرہ دن ایک لگژری گیسٹ ہاؤس میں گزار کر آنے کے بعد اس کا اس گھر میں دم گھٹنے لگا تھا۔ پنکھے کی رفتار اسے کم، بہت کم لگنے لگی تھی۔ درو دیوار اسے گندے ترین لگنے لگے تھے۔ گھر میں اپنی پسند کی تبدیلیاں کر لینے کے باوجود بھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس گھر میں اب مزید نہیں رہ سکتی۔

☆☆☆

موم کی شفاف بوندوں جیسے بارش کے ننھے ننھے قطرے بڑے منظم انداز میں زمین پر گر رہے



تھے۔ رات کی تاریکی میں شہر کی برقی روشنیاں اس موم کی آنکھ میں دیا سلائی جلاتی تھیں۔ لیکن وہ نظرے اپنے وجود میں اتنے کم حیثیت اور اپنے سفر میں اتنے عجلت پسند واقع ہوئے تھے کہ بھڑکنے سے پہلے ہی دھرتی کی سطح سے ٹکرا کر بھس ہو جاتے تھے۔

لوگ بارش سے بچتے ہوئے اپنی اپنی منزلوں کو پہنچ رہے تھے۔ میران بھی کلب سے باہر نکل کر اپنے لیے کوئی ٹیکسی دیکھنے لگا تھا۔

پیر کا دن تھا۔ کلب جلدی ہی بند ہو گیا تھا۔ جیسا کہ پیر والے دن عموماً ہی ہوتا تھا۔ میران نے ربیکا سے کہا تھا کہ وہ گھر میں آج رات کے کھانے کے لیے کچھ نہ بنائے۔ وہ آتے وقت آج باہر سے کھانا لے کر آئے گا۔ لیٹ ہی سہی لیکن وہ دونوں اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ ایک عرصے سے وہ اکیلے کھانا کھا کھا کر تنگ آچکا تھا، اب ہر کھانا اپنی ماں کے ساتھ کھانا چاہتا تھا۔

جیکٹ کی زپ کو گردن کے اوپر تک بند کر کے وہ آگے بڑھ رہا تھا جب اس نے سڑک کے عین درمیان میں ایک تماشا لگا ہوا دیکھا۔

کچھ سیاہ ہپی ٹائپ کے لڑکے زمین پر گری کسی لڑکی یا عورت کو ٹھوکریں مار رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اسے گالیاں دیتے ہوئے دفع ہو جانے کو بھی کہہ رہے تھے۔ عورت خود پر پڑتی لاتوں کے باعث دہری ہو رہی تھی۔ ارد گرد لوگ تھے۔ میران اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جس وقت وہ ہجوم کے قریب پہنچا، ہپی لڑکے اس پر تھوکتے ہوئے جا چکے تھے۔ ہجوم بھی اس سے کوئی سروکار نہ رکھتے ہوئے چھٹ گیا تھا۔ وہ عورت نیم زخمی حالت میں وہاں گری ہوئی تھی اور کراہ رہی تھی۔

میران بھاگ کر اس عورت کے پاس پہنچا اور اس نے اس کا ڈھلکا ہوا سر اوپر اٹھا کر اپنی ران پر رکھا۔

ربیکا نیم بے ہوش تھی اور اس کے سر سے خون نکل رہا تھا۔

☆☆☆

"آپ وہاں کیوں گئی تھیں ممی..... آپ وہاں کیوں گئی تھیں۔" میران بری طرح سے ربیکا پر چلایا تھا۔ کیونکہ چلانے کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دماغ اس بری طرح سے کھول رہا تھا اگر وہ پھٹ جاتا تو آتش فشاں کے لاوے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا۔ وہ ساری محنت جو اس نے ربیکا کے علاج پر کی تھی اس سب کی تھکن جیسے اسے آج ہوئی تھی۔ قرض کی ادائیگی کی پریشانیاں جو علاج پر اس نے جھیلی تھیں وہ ساری کی ساری پھر سے اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھیں۔ سارا قرض ادا کر چکنے کے بعد جیسے اسے الہام ہوا تھا کہ وہ سود ادا کرنا تو بھول ہی گیا ہے۔ جو قرض سے سوگنا زیادہ تھا۔ اس کے سارے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اس کا دماغ چیخنے لگا تھا۔ ربیکا سے یہ پوچھنا کہ وہ وہاں کیوں گئی تھی اس سے زیادہ وہ خدا سے پوچھ رہا تھا کہ یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں.....؟

ربیکا ماتھے پر پٹی کیے کمرے کی کرسی پر شرمسار سی بیٹھی تھی۔ بارش کے باعث شہر کی سڑکیں گیلی ہو چکی تھیں اور ربیکا جو انہی سڑکوں پر لوٹ پوٹ ہو کر آئی تھی اب اپنے گندے لباس کے ساتھ ہی وہاں میران کو چلاتے ہوئے سن رہی تھی۔ پتھر بت کے آنسو بہہ رہے تھے۔ باقی اس کا سارا وجود بے حس ہو چکا تھا۔ میران ربیکا کو دیکھ کر پگھلا تھا۔ ماتھے پر خون، آنکھوں میں آنسو، ٹھوکروں سے درد کرتا جسم، دنیا سے عاجز، زندگی سے گھبرائی ہوئی، وسوسوں سے ڈرتی ہوئی یہ عورت آخر کیا چیز تھی۔

"کیا کر رہی تھیں آپ ممی وہاں پر....." کمرے میں لاحاصل گشت کرتا وہ رکا۔ جو وہ پوچھ رہا تھا وہ جانتا تھا۔ پھر پوچھ کیوں رہا تھا۔ ربیکا کو اس اعتراف کے آنے والے لمحے کھانے لگے تھے۔

"میں وہاں حشیش لینے گئی تھی۔" اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا۔ میران اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔ اسے اس ڈھٹائی سے جواب ملنے کی

توقع نہیں تھی۔ اسے لگا تھا کہ ربیکا جھوٹ بولے گی، لیکن اس کی صاف گوئی نے اسے طیش دلایا تھا۔ غصہ میران کی سرخ ہوتی گردن اور کنپٹیوں سے عیاں تھا۔

"کیوں.....؟"

"میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی، بلکہ میں نے تمہیں کئی بار بتایا بھی ہے کہ میں عیسیٰ کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی..... تم جتنی مرضی کوشش کر لو لیکن میں یہ کوشش نہیں کروں گی..... میں اسے بھولنا چاہتی ہی نہیں تو میں کوشش بھی کیوں کروں۔ سینی ٹوریم میں میں نے علاج بھی اسی لیے کروایا تھا کہ میں واپس اس گھر میں آسکوں جہاں ہر طرف عیسیٰ موجود ہے۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ علاج کروائے بنا میری واپسی ناممکن ہے۔ تم مجھے کبھی بھی گھر واپس نہیں لے کر جاؤ گے اور وہ لوگ مجھے آنے نہیں دیں گے۔ میں نے اسی لیے اپنا علاج کروایا ہے۔ لیکن میں تو پہلے بھی ٹھیک ہی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نشے کی کوئی عادی عورت ہوں۔ میں اپنے پورے ہوش و حواس میں نشہ کرتی ہوں۔ اور نشہ کرنے کے بعد بھی پورے ہوش میں ہی رہتی ہوں۔ بس یہ ہوتا ہے کہ پھر میرے پاس عیسیٰ آجاتا ہے۔ تم مجھے پاگل کہہ لو یا کچھ بھی کہہ لو..... مجھے اب ایسے ہی زندگی گزارنی ہے۔ بہتر ہے کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو..... اور اپنی زندگی ویسے گزارو جیسے تم چاہتے ہو۔"

ربیکا نے کہا تھا۔ میران کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ اسے اپنے سے زیادہ ترس اس ہستی پر آیا جس نے ایک آدمی کے ساتھ بمشکل پچیس ماہ گزارے تھے اور اپنے پچیس سال تباہ کر لیے تھے۔ کیا محبت ایسی ہی چیز ہے۔ یہ ایک بار چپک جاتی ہے اور پھر تباہ کر کے ہی چھوڑتی ہے۔ کیا یہ دیمک ہے جو سب چاٹ جاتی ہے۔ یا یہ ناسور ہے جو ہمیشہ رستا رہتا ہے اور اندر ہی اندر سب ختم کر دیتا ہے۔

"میں اس کی لاش کو بھی دیکھ لیتی تو کبھی یقین نہ کرتی..... پھر اب تو اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ آئے گا۔ اس فقیر نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ جا کر انتظار کرو..... عیسیٰ کی آمد ہوگی۔"

"انہوں نے پیغمبر عیسیٰ کی آمد کی بات کی تھی۔ ان کا انتظار کرنے کو کہا تھا کہ وہ آئیں گے تو آپ کے درد پر مرہم رکھیں گے۔ جیسے انہوں نے کوڑھیوں پر دست شفا رکھا تھا۔ کسی انسان عیسیٰ کی بات نہیں کی تھی۔ اور بابا انسان تھے کوئی پیغمبر نہیں....."

"وہ پیغمبر نہیں تھا لیکن وہ پیامبر تھا۔ محبت کا..... مجھے امید ہے کہ....."

"کیسی امید ہے یہ ممی! جو نہ پوری ہوتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ پچیس سال ہو گئے ہیں آپ کو ان کا انتظار کرتے ہوئے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اب تک آجاتے۔ آپ خود سوچیں..... اگر وہ زندہ ہوتے تو اب تک کون سی رکاوٹ ایسی تھی جسے وہ ان سالوں میں عبور نہ کر سکتے تھے۔ آپ کی اس امید نے مجھے زندگی سے مایوس کر دیا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔"

"تم کچھ بھی کہہ لو..... تم مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔ تم جانتے ہی نہیں ہو کہ اس کا وعدہ میرے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا تو سوچو جھوٹا وعدہ کیسے کر سکتا ہے۔ وہ آئے گا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ میں تمہاری گناہ گار ہوں، لیکن تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو..... میں تم سے تو غافل ہو سکتی ہوں لیکن عیسیٰ کی یاد سے نہیں۔"

"جب کہ اندر سے آپ بھی جانتی ہیں کہ وہ مر چکے ہیں۔ انہوں نے آپ سے ملنے کا وعدہ عالم برزخ میں کیا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے مان لیتی ہوں کہ وہ مر چکا ہے۔ پہلے میں نے اس کی جدائی کے دکھ کو سینے سے لگا کر رکھا۔ اب تمہارے کہنے پر اس کی موت کا غم منا لیتی ہوں۔ سمجھوں گی میں اس کی موت کا صدمہ جھیل رہی ہوں۔"

"تو کیا ان کی موت کا غم منانے کا یہ ہی ایک طریقہ ہے۔ کیا آپ اس ہی طرح سے ان کی موت



کا صدمہ جھیلیں گی۔"

"میں اپنے بس میں نہیں رہ گئی ہوں۔ میں نے کہا ناں میں کوئی عادی نشہ ور نہیں ہوں۔ صرف اپنے غم کو بھولنے کے لیے ایسا کر رہی ہوں۔"

میران ان کی شکل دیکھنے لگا۔ اتنے ٹھوس جواز انہوں نے کہاں سے اکٹھے کر لیے تھے۔

"تم مجھے کسی اولڈ ہوم میں چھوڑ آؤ..... میں نے تمہیں ساری زندگی بہت تنگ کیا ہے اب اور نہیں کرنا چاہتی....."

"اور آپ انہیں یاد کرنا نہیں چھوڑ سکتیں۔"

"جب اپنی سانسیں چھوڑ دوں گی تب اس کی یاد کو بھی چھوڑ دوں گی۔ لیکن تمہیں میں جلدی ہی چھوڑ دوں گی۔ میں کسی دن خود ہی کسی اولڈ ہوم میں چلی جاؤں گی۔" ربیکا کی اس بات نے اس کی باقی کی ساری تلخی بھی ختم کر دی تھی۔ ربیکا سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کسی دن ایسا ہی کرتی، وہ جانتا تھا۔ آگے تھا ہی کیا اس کی زندگی میں..... بورڈنگ کے بعد بھی اس نے تنہائی ہی دیکھی تھی۔ ربیکا کی موجودگی میں بھی اور اس کی غیر موجودگی میں بھی..... اب وہ بھی اسے چھوڑ کر جانے کی بات کر رہی تھی۔ ربیکا کے قریب بیٹھے ہوئے اس نے اس مسئلے کا حل سوچ لیا تھا۔

"وہ لوگ آپ کو کیوں مار رہے تھے۔؟"

"میرے پاس پیسے نہیں تھے اور میں زبردستی ان سے چرس (حشیش) چھین رہی تھی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ میران کے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔ اس کی نظروں میں پھر سے وہ منظر گھوم گیا تھا جب اس نے ربیکا کو لڑکوں سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس منظر کی دردناکی ایسی تھی کہ اسے اب کئی راتوں نیند نہیں آنے والی تھی۔

اس نے ربیکا کا نرم ہاتھ اپنے مضبوط مردانہ ہاتھ میں تھام لیا۔ ربیکا چونکی تھی۔ ایک جوان بیٹے کی ماں متعجب ہوئی تھی۔ ربیکا کو جیسے ابھی ابھی ادراک ہوا تھا کہ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ پچیس سال کے بعد کسی مردانہ ہاتھ نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اور یہ کون تھا۔ عیسیٰ کا ہی بیٹا..... اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچا..... نہیں وہ صرف عیسیٰ کی امانت تھی، اس کے بیٹے تھی بھی نہیں..... نہ محبت میں، نہ چاہت میں.....

جھٹکے سے ہاتھ جدا ہونے پر میران ربیکا کو دیکھنے لگا تھا۔

"آئندہ کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔ آپ کو چرس چاہیے۔ میں آپ کو لا کر دوں گا۔ میں آپ کو نشے سے مرتا ہوا تو دیکھ سکتا ہوں لیکن اس طرح سڑکوں پر لوگوں کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔" اٹھتے ہوئے اس نے بات ختم کر دی تھی۔

☆☆☆

چرس بیچنے والے کہاں نہیں تھے۔ ان کے ٹھکانے پوشیدہ تھے اور عیاں بھی۔ شہر کا وہ کون سا شخص تھا جسے یہ نہیں پتا تھا کہ یہ ممنوع چیزیں کہاں سے ملتی ہیں۔

وہ شہر کے ایک پر رونق علاقے میں گیا۔ جو پر رونق بھی تھا اور بدنام بھی..... جہاں ہر ناجائز کو جائز کیا جاتا تھا۔ سمجھا جاتا تھا۔ چوک پر کچھ سیاہ فام لڑکے کھڑے تھے۔ جو ایسے ہی کاموں کے ڈیلر سمجھے جاتے ہیں۔ مڈ مین..... ایک سے دوسرے تک رسائی کروانے والا..... دونوں کی ضروریات پوری کرنے والا..... وہ جانتا تھا کہ اسے یہاں سے ہی چرس ملے گی اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک لڑکے نے دور سے پہلے اسے نظروں ہی نظروں میں تولا تھا اور پھر اس کے قریب آیا تھا۔

"کسے ڈھونڈ رہے ہو ہینڈسم.....؟" بات معنی خیزی سے پوچھی گئی تھی۔ کچھ لڑکے کی زنانہ آنکھوں جیسی چمک نے اسے مزید معنی خیزی فراہم کی تھی۔

"میں یہاں کسی ڈیلر کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"کس طرح کے ڈیلر کو..... لڑکی..... یا....."

لڑکا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ میران کی صحت اس بات کی غماز نہ تھی کہ وہ کوئی ایسی ویسی چیز استعمال کر سکتا۔

"سنیے آور چیز والے کے ڈیلر کو۔" اس نے لڑکے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ لڑکے نے اوپر سے میران کو دیکھتے ہوئے اپنی پینٹ کی ہپ پاکٹ سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال کر میران کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"بہت مہنگے ہو......" اور اس کے گال پر ایک ہلکی سی چٹکی بھری۔ میران نے چھپی ہوئی نفرت سے منہ موڑ لیا۔

"کتنے پیسے......؟"

"پچاس ڈالر......" سن کر میران کے ہوش اڑے۔ اسے نہیں پتا تھا کہ بنیادی کھانے کے علاوہ کھانی والی یہ غیر ضروری چیز اس قدر مہنگی ملتی ہے۔ اس نے ادائیگی کر دی تھی۔ اس دوران وہ لڑکا اسے مسلسل ایک ایک انچ سے دیکھتا رہا تھا۔

"میرا نام جیڈن ہے۔ امید ہے آئندہ بھی ملتے رہو گے۔ کیونکہ یہ اسٹائل سے شروع ہوتی ہے۔ پھر قبر میں اُتار کر جان چھوڑتی ہے۔" عجیب بات تھی، ایسی چیزوں کا ڈیلر بھی اس کے خلاف بات کر رہا تھا۔ یعنی وہ اپنے ہی کاروبار کے خلاف تھا۔

میران کو جو چاہیے تھا وہ اسے مل گیا تھا۔ اس نے جیڈن کی کسی بات پر توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب اسے بار بار ان جیسے لوگوں سے ہی ملنا تھا۔

"یہ لیں...... اسے استعمال کریں اور اپنے عیسیٰ کو یاد کریں۔" گھر آ کر اس نے پیکٹ ربیکا کے آگے پھینکا تھا۔ اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا تھا۔ ربیکا ایک ٹک اسے اور پھر نیچے گرے پیکٹ کو دیکھتی رہی۔ میران پلٹ کر اپنے کمرے میں جانے لگا تھا۔

"مجھے معاف کر دو میران......" ربیکا اس کی ٹانگ سے لپٹ گئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔

"اس سے بہتر تھا کہ تم میرے لیے گلے کا پھندا لے آتے......"

"پھندا ہی تو لے کر آیا ہوں۔ کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا۔ یہ دیکھیے میری گردن کے گرد لپٹا ہوا ہے۔"

"تم اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو میران! میں اف تک نہیں کروں گی۔"

"میں نہیں کر سکتا۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا بھی نہیں گھونٹ سکتا۔ خدا نے مجھے بہت سے دکھوں کے ساتھ ساتھ یہ معذوری بھی عطا کی ہے۔"

وہ دنیا کا بدقسمت ترین بیٹا تھا جو اپنی ماں کے لیے ان کی موت کی چیزیں خرید کر لایا تھا۔

کھڑکی سے باہر ہوا سرگوشیاں کر رہی تھی، جو سازشی لہجوں سے مزین تھیں۔ ربیکا یک ٹک پیکٹ کو دیکھ رہی تھی۔ میران سے بھی واپس اپنے کمرے میں نہیں جایا جا رہا تھا۔

"میں تم سے معافی مانگنے کے لائق بھی نہیں رہی...... میں نے عیسیٰ سے کیا وعدہ توڑا ہے۔ میں تمہارا اچھی طرح سے خیال نہیں رکھ سکی۔"

"تو رکھیے ناں...... کس نے روکا ہے۔ کیا آپ کو نہیں اندازہ کہ مجھے آپ کی کتنی ضرورت ہے۔" لہجے اگر انسانوں کو پگھلا سکتے تو اس وقت ربیکا صرف اس ایک لہجے سے ہی پگھل کر زمین میں ضم ہو چکی ہوتی...... وہ خود کہاں تھی اور اس کا بیٹا کہاں تھا۔ کس کی حالت کا کون ذمہ دار تھا۔

"پچیس سال ہو گئے۔ خدا نے میری ضرورت پوری نہیں کی اور میں کسی اور کی ضرورت پوری کرنے کے قابل نہیں رہی...... خدا نے مجھے دو غم دیے۔ عیسیٰ کی موت کا اور میرے دیوانے ہو جانے کا...... میں کیا کروں میران...... میں نے بہت بار خود کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ تم سمجھتے ہو گے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں لیکن یہ سچ ہے۔ میں نے چوری چوری ڈاکٹر الیگزینڈر سے اپنا علاج بھی کروایا۔ میں نے عیسیٰ کی موت پر یقین کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن...... لیکن یقین کرو...... تب ہی میرے سارے فرشتے مجھے خبردار کرتے تھے کہ وہ آئے گا۔ میں اسے بھولنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ ضرور آئے گا۔ تم خود



ہی بتاؤ میں ڈاکٹر الیگزینڈر کی بات پر یقین کرتی یا اپنے فرشتوں کی بات پر...... میں کیسے اپنے فرشتوں کو جھوٹا کہہ دوں۔ میں کیسے عیسیٰ کے وعدے کو جھوٹا ہونے کی سند دے دوں۔"

"اب تو مجھے بھی انتظار ہے اس بات کا کہ فرشتے جھوٹ بولتے ہیں یا سچ......"

"ہاں...... یہ فرشتے اسے میرے پاس لے آئیں گے۔ تم دیکھنا...... یا مجھے اس کے پاس لے جائیں گے۔" ربیکا کی بات سے وہ تڑپ کر رہ گیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ جیسے فرشتے ابھی سے یہ کام کرنے لگے ہوں۔

"میں تمہاری گناہ گار ہوں میران...... تم مجھے برداشت کر لو...... یا مجھے کسی کوڑے دان میں پھینک دو۔"

"آپ شرمندہ نہ ہوں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ کی ہر ناجائز خواہش پوری کرنے کو بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔" اس نے ربیکا کو پیار کیا اور جلدی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آج کمرے میں بند ہو کر تکیوں میں منہ چھپا کر رونے کی باری اس کی تھی۔

☆☆☆

ساری محنت اکارت گئی تھی۔ ربیکا کے ایک سال کے علاج پر میران پر کتنا ہی قرض چڑھ گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح وہ ایک خوش حال گھرانہ بن جائیں گے۔ جیسا کہ اس کے باقی دوستوں کے گھرانے تھے۔ وہ بھی ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے کھایا کریں گے۔ گھر میں اپنے دوستوں کی دعوت کر سکے گا۔ اس کی ماں اس کے دوستوں کو اچھے اچھے کھانے کھلائے گی۔ اچھے انداز سے ملے گی۔ اچھی اچھی باتیں کرے گی۔ جیسا وہ اپنے دوستوں کے گھروں سے مرعوب ہو کر آتا تھا ویسے ہی اس کے دوست اس کے گھر سے مرعوب ہو کر جایا کریں گے۔

تنہائی اور سوگواریت نے اس کے اندر ایسے گڑھے ڈالے ہوئے تھے کہ اسے اس کے دوستوں کے عام سے گھرانے بھی کسی دوسری دنیا کی ان دیکھی جنت کی طرح کے لگتے تھے۔ اس نے زندگی بھر ایسا ماحول دیکھا ہی کب تھا۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ ہنس ہنس کر اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے والی ماں کسی کسی کو ملتی ہے۔ جو خدا کے بہت ہی خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں۔ پھر بڑھنے، پرکھنے اور جانچنے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ سب عام تھے۔ ہاں وہ ضرور خدا کا نزدیکی بندہ تھا جو آزمائش میں ڈالا گیا تھا۔

وہ ربیکا کے لیے نشہ آور اشیاء خرید کر لایا تھا۔ یہ ایسی گھٹیا بات تھی کہ اگر اس کے دوستوں کو پتا چلتی تو وہ اس سے شاید پھر کبھی بات کرنا پسند نہ کرتے۔ وہ ایک بدقسمت بیٹا نہیں تھا تو اپنے اس اقدام سے اب بن ضرور گیا تھا۔

ایسی پریشانی میں بس ایک سبین کی فون کال ہی تھی جو اسے جذباتی سہارا دے سکتی تھی۔

"نیویارک کا موسم کیسا ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"میں نے تمہارے جانے کے بعد باہر نکل کر بھی اندر کی آنکھ نہیں کھولی کہ موسم کا اندازہ لگا سکتا۔" اس نے ہلکے سے کہا تھا۔ اس ہلکے پن میں پیار کی وزنی وزنی گہرائیاں تھیں۔ کسی چاہنے والے کے یہ لفظ کیسا عجب اثر ڈالتے ہیں۔ سبین اپنے پلنگ پر بیٹھی بیٹھی جیسے اچانک سے محبت کے رتھ پر سوار ہو گئی تھی۔

"تم پھر کب آؤ گی۔؟"

"جب بھی آؤں گی تمہیں بتا دوں گی۔"

"میں انتظار میں ہوں۔"

"اور مجھے کہیں قرار نہیں......"

کمرے کا دروازہ ایک دم سے کھلا تھا۔ سامنے بابا کھڑے تھے۔ سبین جھینپ گئی تھی۔ وہ ایسا بھی ظاہر کر سکتی تھی جیسے وہ اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی ہے۔ لیکن ظاہر کرنے کا وقت فوراً سے پھسل گیا تھا۔ کیونکہ جو سچ میں ظاہر تھا وہ باطل ظاہر کو ہیچ کر رہا تھا۔ پھر جو جگنو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ وہ

یقیناً بیٹی کے ساتھ بات چیت کے وقت نہیں چوک سکتے تھے۔ بابا خاموش ہو گئے تھے۔ بوڑھے شیر نے نئے شیر کے لیے علاقہ ہی خالی نہیں کیا تھا بلکہ اب جنگل ہی چھوڑ دیا تھا۔ پھر جب سے وہ کراچی سے ہو کر آئی تھی اور گھر کو اپنے خرچے سے چلا رہی تھی۔ پہلے سے چپ اور بے ضرر بابا مزید درویش ہو گئے تھے۔ ان پر بین کا رعب چڑھ گیا تھا اس کی آمدنی کا۔

''یہ ماڈل دے آنا کریم کو......'' بابا نے اگلی صبح اس سے کہا تھا۔ کل رات میں شاید وہ یہ ہی کہنے اس کے کمرے میں آئے تھے اور پھر کہہ نہیں سکے تھے۔

بین تو جیسے بھولی ہوئی تھی کہ وہ یہ کام کرتے ہیں۔ چونے کا کام...... اور وہ مزدوروں کی طرح تانگے پر سامان لاد کر مارکیٹ لے کر جاتی ہے۔

''رہنے دیں۔ نہ ہلکان ہوں آپ۔ مت بنایا کریں اب یہ۔ گھر چل تو رہا ہے اس کے بنا بھی......''

''کیا اس کام کے وہ تمہیں لگاتار پیسے دیں گے؟''

''امید تو ہے کہ اب وہ مجھے لگاتار ہر ماہ پیسے دیا کریں گے۔ پھر ابھی تو کم ہیں لیکن آگے زیادہ ملنے لگیں گے۔'' اس نے گھڑ گھڑ کر جھوٹ بولا تھا۔ چلو چونے کے تاج محل بنانے کا اسے ایک یہ فائدہ تو ہوا تھا کہ وہ ماڈل نہ سہی...... لیکن جھوٹ بولنا بڑی مہارت سے سیکھ گئی تھی۔

''میں اس کام کے بنا نہیں رہ سکوں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ اس لیے تم اپنا کام کرتی رہو اور مجھے میرا کام کرنے دو......'' بابا رکھائی سے بولے تھے۔ اس نے دل میں بابا کی عادت پر نفرت کا اظہار کیا۔ کیا بابا کوئی شاہکار بنانا چاہ رہے تھے۔ کیا وہ جانتے نہ تھے کہ شاہکار تو اماں بنا چکی تھیں۔ انتہائی قلیل آمدنی میں انہوں نے دو بیٹیوں کو جوان کیا تھا۔ یہ شاہکار کیا کم تھا۔ چونے کے ایسے شاہکار سے تو بہتر تھا جس نے نہ زندگی کو شاہکار بنایا نہ قسمت کی دسترس میں کوئی شاہکار رہنے دیا۔

''یہ ماڈل دے آؤ'' اگلے دن بابا نے پھر انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ منہ موڑ کر کچن میں جانے لگی تھی۔

''اگر تم نہیں جا سکتیں تو مجھے بتا دو۔'' کتنی بار انہوں نے ایسے لہجے میں کہا تھا کہ اگر اب وہ ان کے کام کرنے کے قابل نہیں رہی یا خود کو کوئی بہت بڑی معرکتہ الآرا چیز سمجھ رہی ہے تو بے شک بتا دے۔ بین شرمندہ ہو گئی تھی۔ اس گھر میں کب دیواریں بن گئی تھیں، اسے تو پتا ہی نہ چلا۔ وہ ایسا تو ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

چادر اوڑھ کر وہ ایک بار پھر سے چچا کریم کو مال دینے چلی گئی تھی۔ تانگے کے بجائے اب کی بار اس نے پک اپ کروائی تھی۔ تانگے میں بیٹھنا اسے ایک دم سے ہی گھٹیا اور نیچ پن محسوس ہونے لگا تھا۔ گھر آ کر اس نے کم مال ہونے کے باوجود ایک معقول رقم بابا کو دی تھی۔

''یہ کیا ہے۔ یہ پیسے تو میرے خیال سے زیادہ ہیں۔ بلکہ بہت زیادہ ہیں۔''

''ساری چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں اب۔ چچا کریم نے خود اضافی پیسے دیے ہیں۔ گھر میں راشن پانی سب موجود ہیں۔ یہ پیسے آپ رکھ لیں۔ اپنے لیے کچھ خریدنا ہو تو خرید لیجیے گا۔'' اس نے اسے ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ بابا کو اس پر یقین کرنا ہی پڑا تھا۔ جبکہ وہ حقیقت جان ہی نہ پائے تھے کہ بین دراصل چچا کریم کے پاس گئی ہی نہ تھی۔ ساری رقم اس نے خود اپنے پاس سے بابا کو دی تھی۔

عام ماڈل تو اس نے راستے میں ایک کوڑے والے کو دے دیے تھے اور اسلامی ماڈل ایک فقیر کو تھما دیے تھے۔

یہ بدلہ تھا۔ ابا کے فن سے...... اور خود سے...... نجانے کس کس ستم کا......

☆☆☆

تیسرا باب:



تال کی کائی
پہلے گدلے پانی پر ڈھال بنائی
کائی میں ساری شفافیت چھپائی
تعفن کی آنچ جب سمٹ نہ پائی
تو پھٹتے پھٹتے بکھر گئی، تال کی کائی

مہنگے سگار سے نکلتے کثیف دھوئیں کے مرغولے بند کھڑکی کے شفاف شیشے سے ٹکرا ٹکرا کر اسے دھندزدہ اور سیاہ کر رہے تھے۔ شیشے کے پار کے سرسبز مناظر فریب نظر کے باعث جل جل کر بجھتے ہوئے دکھتے تھے اور ان سب میں ایک راگ بھی اپنے سُر اٹھا رہا تھا۔ ایک اداس اور روتا ہوا سا راگ...... جو شاید ماؤتھ آرگن سے نکل رہا تھا اور بہت ہی بے ڈھب انداز سے نکل رہا تھا۔ پیٹرسن کو کوفت ہوئی۔ کیا بجانے والا خود نہ سن سکتا تھا کہ اس کا راگ کس قدر کوفت زدہ اور سماعتوں کے لیے مہلک ہے۔ شاید بجانے والا خود بہرہ تھا۔ ورنہ وہ یقیناً اس راز تک پہنچ جاتا کہ اس کا راگ بہت سے کانوں میں سیسہ انڈیلنے کا کام کر رہا ہے۔

ایک گہرا کش لے کر پیٹرسن نے دھواں اس انداز سے چھوڑا کہ دھوئیں کے بہت سے چھوٹے بڑے کھوکھلے دائرے ایک کے اوپر ایک اس کے منہ سے نکلتے چلے گئے تھے اور وہ ساری کاریگری انسانی نہیں بلکہ میکینکلی لگتی تھی۔ پیٹرسن نے مسکراتے ہوئے ان لچھوں کو دیکھا تھا۔ بڑی محنت کے بعد وہ اس کرتب میں کامیاب ہو پایا تھا۔ سراسر بازاری اور بے معنی کرتب میں...... جو سڑکوں پر پھرنے والے آوارہ ہپیوں کی سستی شعبدہ بازی سمجھی جاتی تھی۔

جیفرسن نے کئی بار اسے اس حرکت سے منع کیا تھا۔

''تمہاری شخصیت کو یہ مناسب نہیں لگتا پیارے بیٹے......''

پیٹرسن کو جیفی کی بات سے اتفاق تھا لیکن اس کے باوجود وہ اکثر اوقات خود کو یہ حرکت کرنے سے روک نہیں پاتا تھا۔

اسے بہت اچھی طرح سے یاد تھا کہ یہ لچھے اس نے پہلی بار کہاں دیکھے تھے۔ بچپن کی یادیں اتنی جلدی ذہن سے محو نہیں ہوتیں، یہ آخری سانس تک انسان کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ ان لچھوں کی یاد کے ساتھ ہی ایک آواز بھی اس کے کانوں میں اُتری تھی۔

''گھٹیا عورت...... تم نے دوبارہ گھر سے باہر قدم نکالا تو میں تمہیں قتل کرنے میں ایک منٹ کی دیر بھی نہیں کروں گا۔ یہ سوچ بنا کہ پھر مجھے کیا سزا ملتی ہے۔'' دور کہیں ولیم چنگھاڑتا ہوا کہہ رہا تھا۔

پیٹرسن نے اب کے ایک کش لے کر دھواں آئینے میں نظر آتے اپنے ہی عکس پر چھوڑا تھا۔ ان یادوں کی چبھن ایسی تھی کہ وہ خود سے بھی نظریں نہیں ملا پاتا تھا۔

☆☆☆

سرخ رنگ کی لوئیں بھڑک بھڑک کر ٹھنڈی پڑ رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے آتش دان میں جلتی ننھی ننھی باریک لکڑیوں سے کمرے میں گرمی پیدا نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس لیے پیٹرسن اپنے کھلونے وہاں ہی لے کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے کھلونے پر مشتمل اس کا کل اثاثہ لیگو باکس کا وہ ڈبا تھا جو ولیم نے اسے مہینہ بھر پہلے ایک فلی مارکیٹ (لنڈے بازار) سے لا کر دیا تھا۔ چونکہ لیگو باکس کا ڈبا پرانا تھا اس لیے اس کے اوپر اس کا وہ تشہیری لیبل بھی منسلک نہیں تھا جس پر کمپنی کے نام کے ساتھ ساتھ بہت سی تصویریں بھی بنی ہوتی ہیں۔ جس کو دیکھ دیکھ کر بچے ان کی کاپی کرتے ہیں۔ لیگو باکس کے پرزوں سے ویسے ہی کل پرزے بناتے ہیں۔

پیٹرسن کے پاس کوئی تصویر نہیں تھی۔ اس لیے اسے سب خود سے ہی بنانا پڑ رہا تھا۔ ظاہری بات ہے کہ جو زیادہ اچھا نہیں بن پا رہا تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی مثال نہیں تھی۔ لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا وہ اپنے واحد کھلونے سے ابھی تک بور نہیں ہوا تھا۔

ڈور کھڑی ایما چھوٹی سی میز پر کھانے کے برتن

بچاری تھی، اور کھلونوں سے کھیلتے پیٹرسن کو دیکھتے ہوئے ساتھ ساتھ نفرت سے منہ بھی بنا رہی تھی۔ وہ کبھی ماں بننے کی خواہش مند نہیں رہی تھی لیکن ولیم کے کہنے پر اسے فیملی بنانی پڑی تھی۔ وہ بھی تب جب وہ سمجھتی تھی کہ وہ اپنی جوانی کے عروج پر ہے اور یہ دن صرف مسرت سے گزارے جانے کے قابل ہیں، نہ کہ ایک بچہ سنبھالنے کے......

پیٹرسن ایما کے اندرونی جذبات کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ایما کی بے پناہ سختیوں اور پھٹکار کے باوجود بھی اسے ایما سے محبت تھی اور ولیم سے نفرت...... کیونکہ وہ مزاج کا اکھڑ تھا۔ پیار سے بات نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت غصے میں رہتا تھا اور ایما کو مارتا پیٹتا بھی تھا۔

اس وقت ایما نے تنگ جینز پر کھلی ڈلی سی موٹی ٹی شرٹ پہنی رکھی تھی۔ جس کو اس نے اپنی کمر سے ایک بے حد خوب صورت براؤن بیلٹ سے کس رکھا تھا۔ اس طرح سے کہ شرٹ نے بیلٹ کے اوپر اور نیچے بے حد شکنیں ڈال دی تھیں اور ان شکنوں میں گھری وہ موٹی گڑیا بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ پتا نہیں ولیم کو وہ کیوں اتنی ناپسند تھی۔ جو بات بات پر اسے پیٹنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ ورنہ یہ بات تو پیٹرسن کے دوست بھی کہتے تھے کہ پوری بلڈنگ کے بچوں میں سے پیٹرسن کی ممی سب سے زیادہ پیاری ہیں اور حقیقتاً ایما اس اعزاز کی مستحق بھی تھی۔ وہ ہر لباس میں خوب صورت لگتی تھی۔ اس پر ہر چیز جچتی تھی۔ جینز، ٹی شرٹ اور اونچی ہیل جو اسے شروع سے ہی پسند رہی تھی جس کو پہنے ہوئے وہ اس اتراہٹ سے چلا کرتی تھی کہ اطالوی ماڈلز کو مات دیا کرتی تھی۔ اسکرٹ، آف شولڈر بلاؤز اور فلیٹ جوتوں میں کسی اسکول کی سینئر اور انتہائی قابل ٹیچر لگا کرتی تھی۔ پونی ٹیل باندھ لیتی تو ایسے لگتا جیسے ٹینس کی ماہر کھلاڑی ہو...... لیکن قباحت یہ تھی کہ نہ تو وہ ماڈل تھی، نہ ٹیچر اور نہ ہی ماہر کھلاڑی...... بلکہ وہ کسی حد تک اناڑی کھلاڑی تھی۔ جو اپنی زندگی کا کھیل بہت برے طریقے سے کھیل رہی تھی۔

گھر کے باہری دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی تو ایما چوکنی ہو گئی۔ کچن سے چاول سے بھری ڈش لا کر اس نے جلدی سے ٹیبل پر رکھا اور باقی کے لوازمات لینے بھی اندر دوڑی...... پیٹرسن نے اپنے کھلونوں سے توجہ ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں اب ولیم کھڑا تھا۔ پیٹرسن مسکرایا، لیکن ولیم نے حسب عادت نہ پیٹرسن کو دیکھا اور نہ ہی مسکرایا۔ وہ ایما کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو ٹیبل پر ہی پلیٹ میں رکھے چھلے ہوئے کھیرے کو بے سلیقہ پن سے گول قتلوں کی صورت کاٹ رہی تھی۔

"آج جلدی آ گئے۔" ایما نے گردن موڑ کر مسکرانے کی اداکاری کی اور ولیم آفس کیس کو سائڈ پر رکھ کر ایما کے سامنے ہوا۔ پیٹرسن نے اپنے لیگو باکس چھوڑ دیے۔ روز کا تماشا شروع ہونے جا رہا تھا۔ ایسے میں اسے کھیل سے زیادہ دونوں کا "شو" دیکھنے میں دلچسپی ہوا کرتی تھی۔

"آج کہاں گئی تھیں تم......" ولیم پیار سے پوچھ رہا تھا۔ لیکن ایما اور پیٹرسن دونوں ہی جانتے تھے کہ اگلے ہی پل اب یہ آواز ایسی کرخت ہونے والی ہے کہ دو کمروں کے پورے گھر میں پھیل کر گونجے گی۔

"کب...... کہیں بھی نہیں...... میں تو گھر پر ہی تھی۔" ایما نے کندھے جھٹک کر جواب دیا تھا اور پیٹرسن اپنی ماں کے اس جھوٹ پر دنگ رہ گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ولیم کو اس جواب سے فریب دیا جا رہا ہے۔ ایما اسے سکول سے لانے کے فوراً بعد باہر کہیں چلی گئی تھی اور شام کو ولیم کے آنے سے ذرا پہلے ہی واپس آئی تھی۔ کھانا وہ بازار سے لیتی ہوئی آئی تھی۔ جسے آتے ہی اس نے گھر کے کھانے پکانے کے برتن میں ڈال کر گرم کر لیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس نے کھانا گھر میں بنایا ہے۔ اب تو پیٹرسن اس کی ایسی طویل غیر موجودگیوں کا اس قدر عادی ہو چلا تھا کہ جس دن ایما باہر نہ جاتی اسے



دو کمروں کے گھر میں آج اس کی آزادی ختم ہو گئی

"میں نے خود دیکھا ہے تمہیں سٹی اسکوائر پر۔" ولیم نے چیختے لہجے میں کہا۔ بات نجانے کتنی بڑی تھی۔ نہ تو اس نے لباس بدلا تھا اور نہ ہی شوز اتارے تھے۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بس اب اپنی بیلٹ اتارے گا اور اسے روز کی طرح ایما کی کمر پر پے در پے مارنا شروع کر دے گا۔

"اوہ...... اچھا...... سچ یاد آیا...... گھر میں سبزی ختم ہو گئی تھی۔ وہ ہی لینے گئی تھی۔ بوجھو تو آج میں نے تمہارے لیے کیا بنایا ہے۔" ایما چہک کر بولی۔

"سٹی اسکوائر میں کوئی ایک بھی سبزی کی دکان نہیں ہے۔" ایما چپ کر گئی تھی۔

"پھر سبزی پاس سے بھی مل جاتی ہے۔ تمہیں اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی اور یہ...... یہ کیا ہے۔" اس نے ڈش کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔ "چاولوں میں کوئی ایک بھی سبزی موجود نہیں ہے۔"

ایما اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

"مجھے کچھ میک اپ لینا تھا۔ میں بڑے عرصے سے گھر کے خرچے سے پیسے پس انداز کر رہی تھی۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں میک اپ پسند نہیں...... لیکن میں ایک عورت ہوں میرا دل چاہتا ہے بننے سنورنے کو......"

"تم وہاں کسی آدمی کے ساتھ تھیں۔" ولیم کا ہاتھ اس کی بیلٹ تک گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے مسلسل مکر کیا جا رہا ہے۔

"وہ میری سہیلی کا بھائی تھا۔ مل گیا تو بات کر لی...... اس میں کیا برا کیا۔"

"اس کا ہاتھ تمہاری ننگی گردن پر تھا۔ اور وہ فحش قہقہے لگا رہا تھا۔"

ایما کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب وہ مزید جھوٹ نہیں بول سکتی۔ ولیم نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑا تھا۔ ایما کا منہ دوسری طرف کروٹ بدل گیا تھا۔ ولیم نے اگلے ہی پل اپنی بیلٹ اتار کر ایما کی کمر پر پے در پے وار کرنے شروع کر دیے تھے۔ پیٹرسن اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا رہا تھا۔ یہ کھیل اب اتنا پرانا ہو چکا تھا کہ اسے ازبر ہو چکا تھا۔ پھر بھی ہر بار اس سے اپنی دہشت پر قابو پانا مشکل ہو جاتا تھا۔

آتش دان کی آگ بھڑک رہی تھی۔ سرخ رنگ سیاہی میں تبدیل ہو رہا تھا۔

مار کھاتی ایما ولیم سے بچتے ہوئے ایک کونے میں رکھے صوفے کی پشت کے پیچھے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"تنگ آ گئی ہوں میں اس زندگی سے...... اس سے بہتر میں مر جانا چاہتی ہوں۔" درد اور اذیت سے وہ چلائی تھی۔

"تو مر جاؤ...... تمہیں مرنے سے روکا کس نے ہے۔"

"اپنے بچے کو تم جیسے تنگ نظر آدمی کے پاس چھوڑ کر کیسے مر جاؤں......"

"بچے کا خیال ہے تمہیں؟"

"تم سے زیادہ ہے۔ چند کھلونے لا کر دے دینے سے تم سمجھتے ہو کہ تم نے باپ ہونے کا فرض پورا کر دیا۔" ایما نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ غصے اور لڑائی کی حالت میں بھی وہ اپنے پورے ہوش حواس میں ہوتی تھی۔ بات کا رخ پیٹرسن کی طرف موڑ دینے سے اس کا مقصد یہ ہی تھا کہ ولیم اس موضوع سے ہٹ جائے۔

"تم اپنے ماں ہونے کے فرائض بخوبی نبھا رہی ہو......"

"پوچھو پیٹرسن سے...... تم سے زیادہ خیال ہے مجھے اس کا...... تمہیں تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ تم نے اسے پیار کی نگاہ سے آخری بار کب دیکھا تھا۔"

"اور تم تو اس کا وجود ہی نہیں چاہتی تھیں۔"

ایما لاجواب ہو گئی تھی۔

"بہت سمجھایا تھا مجھے میرے دوستوں نے......

اس گند کو اپنی زندگی میں نہ لاؤ..... مجھے ہی خبط تھا گند صاف کرنے کا....."

"میری سہیلیوں نے بھی کہا تھا کہ یہ تنگ نظر آدمی تمہاری زندگی اجیرن کردے گا۔"

"میں تنگ نظر ہوں یا تم بدکردار..... تمہیں اجازت دوں کہ تم باہر دنیا کے مردوں کو لبھاؤ..... انہیں اپنی اداؤں سے خوش کرو....."

"ایسے گھٹیا انداز میں تم ہی باہر کی دنیا کو دیکھ سکتے ہیں۔"

"جس انداز میں تم دیکھتی ہو وہ میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" ولیم برابر چلایا۔ دونوں ایک دوجے پر پھنکار کر اب ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ ایما نے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگالیا۔ یہ انداز خاص ولیم کو چڑانے کے لیے ہوتا تھا کہ اب بھونکتے رہو..... مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔

"گھٹیا عورت..... تم نے دوبارہ گھر سے باہر قدم نکالا تو میں تمہیں قتل کرنے میں ایک منٹ کی دیر بھی نہیں کروں گا۔ یہ سوچے بنا کہ پھر مجھے کیا سزا ملتی ہے۔" ولیم چنگھاڑتا ہوا کہہ کر اندر اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گیا۔

ایما نے اب بڑے اطمینان سے ایک گہرا کش لے کر دھواں اس انداز سے چھوڑا تھا کہ دھویں کے بہت سے چھوٹے بڑے کھوکھلے دائرے ایک کے اوپر ایک اس کے منہ سے نکلتے چلے گئے تھے اور وہ ساری کاریگری انسانی نہیں بلکہ مشینی لگتی تھی۔ پیٹرسن اسے مرعوبیت سے دیکھنے لگا۔ اسے ایما کی یہ ادا بڑی پسند تھی۔ اس کا بڑا دل کرتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح سگریٹ پیے اور اس کے دھویں کے چھلے بنائے۔ لیکن ولیم کے ڈر کی وجہ سے ابھی وہ سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔

ایما اب مسکراتے ہوئے ان لمحوں کو دیکھ رہی تھی۔ بڑی محنت کے بعد وہ اس کرتب میں کامیاب ہو پائی تھی۔ سراسر بازاری اور بے معنی کرتب میں..... جو سڑکوں پر پھرنے والے آوارہ لڑکوں کی سستی شعبدہ بازی سمجھی جاتی تھی۔

☆☆☆

اس دن کے بعد سے گھر میں تالا لگنے لگا تھا۔ ولیم نے ایما کے باہر جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس نے گھر کی ضرورت کی ایک ایک چیز گھر میں لا کر رکھ دی تھی۔ ایما کو کسی بھی ضرورت کے لیے گھر سے باہر جانے کی اس نے ضرورت ہی نہیں رہنے دی تھی۔ پیٹرسن کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اسکول سے خود ہی اکیلا یا دوستوں سے کے ساتھ گھر آئے اور جائے گا، اور دروازے کے بجائے وہ گھر میں کھڑکی کے راستے داخل ہوگا۔ پیٹرسن کو گھر کی چابی نہیں دی گئی تھی تاکہ اس چابی سے ایما "فائدہ" نہ اٹھا سکے۔ وہ کھڑکی اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں سے بس پیٹرسن ہی گزر سکتا تھا۔ ایما نہیں..... لیکن ولیم، ایما کی صلاحیتوں کو شاید اچھی طرح سے جانتا نہیں تھا۔ جب ایما نے کچھ کرنا ہوتا تھا تو وہ کر گزرتی تھی چاہے حالات کتنے ہی ناگزیر کیوں نہ ہوں۔

ماضی کی بات کی جائے تو ایما "کال گرل" کے پیشے سے منسلک تھی اور ولیم ایک چھوٹی سی نیشنل کمپنی میں معمولی سی جاب کرتا تھا اور بے داغ ماضی رکھتا تھا۔ دونوں میں نجانے کہاں محبت ہوئی تھی اور کب اتنی پروان چڑھ گئی تھی کہ ایما ولیم کی خاطر اپنا گھر بار تک چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے ولیم سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ ولیم کو جب پتا چلا تھا کہ ایما "کال گرل" رہ چکی ہے تو بہت سے دن ذہنی کشمکش میں گزارنے کے بعد بالآخر اس نے ایما سے شادی کر لی تھی۔ وہ اسے گندگی دنیا سے باہر لانا چاہتا تھا۔ تب ایما بھی ایسا ہی چاہتی تھی۔

ولیم بنا ماں باپ کے تھا اور ایما نے اس شادی کے لیے اپنے سارے خاندان کو چھوڑ دیا تھا۔ تھوڑا عرصہ تو خوشی خوشی گزرا تھا۔ پیٹرسن کی پیدائش ہوئی۔ دونوں میاں بیوی خوش باش جوڑوں کی طرح رہ رہے تھے لیکن پھر گھر کے اخراجات بڑھنے لگے تو دونوں میں تلخ کلامی پیدا ہونے لگی۔



ایما نے کبھی اپنے گھر میں پیسے کی تنگی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اگرچہ اتنے امیر گھرانے سے نہیں تھی لیکن اتنی غریب بھی نہیں تھی کہ ایک ایک چیز کو ناپ تول کر خرچ کرتی..... اس نے ولیم سے کہا تھا کہ وہ اسے بخوشی اجازت دے دی تھی لیکن ایما کی مڈیاں فیکٹری میں ہوتے سخت کام کے لیے بنی ہی نہیں تھیں اور نہ ہی کسی ریسٹورنٹ وغیرہ میں کام کرنے کے لیے..... یا وہ کسی بھی طرح کے مشقت طلب کام کے قابل نہ رہی تھی۔ اسے خود نہ پتا چلا کہ وہ کب اور کیسے پرانی روش پر پھر سے چلنے لگی تھی۔

ولیم کو ابھی ایما پر صرف شک ہی ہوا تھا جس کے بنا پر گھر میں آئے دن لڑائی ہونے لگی تھی اور اس نے ایما کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی تھی۔ اگر اس کا شک یقین میں بدلا ہوتا تو وہ ایما کو جان سے مار دیتا۔ ولیم نے اپنے پڑوس کے دوستوں سے بھی کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ ایما کو گھر سے باہر نکلتا دیکھیں تو اسے لازمی بتایے۔

ایما کے دل میں چور نہیں تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے اسے گھر میں قید ہونا پڑا اور گھر سے نکلنے کی کوششیں بھی ترک کرنی پڑیں..... ایما دو کمروں کے اس چھوٹے سے گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے کہیں باہر آ جا نہیں سکتی تھی۔ اس سیاری صورت حال نے اس کے اندر تلخی ہی تلخی بھر دی تھی۔ گھر میں ایک ایک روپے کی بچت نے اسے نیم پاگل کر دیا تھا یا شاید اس کے جسم کی خراب عادتوں نے..... وہ غصہ ہوتی تھی تو پیٹرسن کو مارا کرتی تھی۔ کیونکہ اپنا غصہ اتارنے کے لیے اس کے پاس اس گھر میں کوئی روئی سے بنا بھالو تک موجود نہیں تھا اور گھر میں کراکری کی بھی اتنی فراوانی نہیں تھی کہ وہ انہیں پھینک پھینک کر توڑتی جاتی اور اپنی تلخی کو رفو کرلی جاتی۔

وہ ولیم سے طلاق بھی نہیں چاہتی تھی اور اس کے ساتھ بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ تو بس پیسے کی فراوانی چاہتی تھی۔ آسائشوں سے بھری زندگی چاہتی تھی۔ جس کی اسے عادت تھی۔

☆☆☆

اسکول سے واپس آ کر پیٹرسن نے بیگ کو سائڈ پر ڈالا۔ یونیفارم تبدیل کیا اور پھر اپنے لیگو باکس اٹھا کر آتش دان کے پاس آ بیٹھا۔ اس سارے وقت کے دوران فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی تھی۔ پیٹرسن کو اجازت نہیں تھی کہ وہ فون سنے..... فون سننے کی ڈیوٹی صرف ایما کی تھی کیونکہ فون آتا بھی اسی کے لیے تھا۔

ایما واش روم صاف کر رہی تھی۔ گھر اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ واش روم میں فون کی آواز نہ سن سکتی۔ کھلتے ہوئے پیٹرسن کو گھنٹی کی آواز سے کوفت ہونے لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فون اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی اس حرکت سے اس کو تو کوئی آنچ نہیں آنی تھی لیکن ایما کی جان ضرور چلی جانی تھی۔ ولیم کے ہاتھوں.....

فون کوئی پانچویں بار بند ہو کر دوبارہ بجنا شروع ہوا تھا جب ایما بڑے اطمینان سے واش روم سے باہر نکلی تھی اور پھر اتراتی ہوئی فون تک آئی تھی۔ اس کی چال، اس کی حرکات میں کسی قسم کی تیزی نہیں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کال کس کی آ رہی ہے۔

ولیم کی عادت تھی وہ دن کے اوقات میں وقفے وقفے سے فون کر کے چیک کیا کرتا تھا کہ ایما گھر پر موجود ہے کہ نہیں..... ایما کے "ہیلو" کہتے ہی فون بند کر دیا جاتا تھا۔ اپنے زندگی کے دوسرے بہت سے کاموں کی طرح یہ کام بھی سرانجام دینا ایما کے لیے نفرت انگیز تھا جو اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتا تھا کہ اسے فون کر کے چیک کیا جائے کہ وہ گھر پر ہے کہ نہیں.....

یہ کام ولیم کے لیے بھی کوئی کم اذیت ناک نہیں تھا کہ وہ اپنی ہی بیوی کو فون کر کے چیک کر رہا ہے کہ آیا وہ گھر پر موجود ہے یا کسی اور مرد کے ساتھ تو باہر

گھومنے نہیں نکلی ہوئی..... ایما فون اٹھانے میں دیر کرتی تھی تو وہ آ کر اس سے باز پرس کرتا تھا۔ کبھی کبھی اسے مارتا بھی تھا۔ مارنے کی عادت ولیم کو بھی ہوتی جا رہی تھی اور پٹنے کی ایما کو..... اب وہ جان بوجھ کر فون سننے میں دیر کرتی تھی۔ ولیم آتے ہی اسے مارنا شروع کر دیتا تھا کہ وہ دن بھر کہاں رہی ہے۔ جبکہ ایما کے گھر سے باہر جانے کے آثار معدوم ہوتے تھے۔

یہ دونوں کا انتشار تھا جسے ولیم مار اور ایما چڑچڑاہٹ کے ذریعے باہر نکال رہی تھی۔ ولیم کی ٹھوکروں میں ایما ہنستی رہتی اور ولیم غصے سے مزید پاگل ہوتا رہتا تھا۔ پیٹرن دور سہما کھڑا رہتا تھا۔ اپنے لیگو باکس کی طرح ادھورا سا..... جس سے وہ کبھی کوئی شبیہہ اُبھار ہی نہیں سکا تھا۔

"ہیلو....." ایما نے فون کان سے لگا کر بڑی ادا سے کہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ آگے ولیم ہی ہوگا۔ جو ابھی وہاں ہی سے اس پر چلانا شروع کر دے گا یا شام کو گھر آ کر..... وہ آگے سے گالیاں سننے کے پورے پورے موڈ میں تھی۔ لیکن نجانے آگے سے اسے کیا کہا گیا تھا کہ اندھی اندر چہکتی ایما لمحے بھر میں گم صم ہو گئی تھی۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا تھا اور وہ پتھر کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔

"ممی کیا ہوا....." پیٹرن بھاگ کر ایما کے پاس پہنچا تھا۔ اس نے ایما کو اپنے نازک ہاتھوں سے جھنجوڑا تھا۔ ایما چونک کر بھی بت بنی رہی تھی۔

"ولیم ایکسیڈنٹ میں مر چکا ہے۔" ایما نے نہایت اطمینان سے اسے بتایا تھا۔ ولیم کو دی جانے والی اس کی بہت سی بددعاؤں میں سے کسی ایک کو من لیا گیا تھا۔ وہ اس احساسِ جرم کے احساس تلے خاموش تھی یا روز روز کی مار نے دونوں کی محبت کو پتھر کر دیا تھا جس کے باعث ایما کے ساکن وجود میں ارتعاش ہو کر بھی کچھ برآمد نہ ہوا تھا۔

پیٹرن سمجھ نہ سکا کہ اسے رونا چاہیے یا ایما کی طرح مطمئن ہو کر چپ بیٹھے رہنے چاہیے۔

"ہمیں آج ہی یہ گھر خالی کرنا ہوگا۔ تین دن بعد نئے ماہ کا آغاز ہے۔ ہم اس گھر کا کرایہ نہیں دیں سکے گے۔ میرے پاس بہت کم پیسے ہیں۔ میں نے کل ہی کچھ جوتے خرید لیے ہیں۔ مجھے ان کی اشد ضرورت تھی۔ میرے پرانے جوتے پھٹ گئے تھے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں کیسے گھر میں ان گھسے پٹے جوتے میں اُلجھتی پھرتی تھی۔ پھر بازار گئی تو وہاں آف سیزن سیل لگی ہوئی تھی۔ سب جوتوں کے پرائز گر گئے تھے۔ اس لیے میں نے بہت سے لے لیے اور ساری بچت ختم ہو گئی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں پیٹرن..... مال والوں کو آف سیزن سیل نہیں لگانی چاہیے تھی، یا کم از کم اس دن تو ہرگز نہیں جس دن مجھے وہاں جانا تھا۔" ہذیان بکتی ایما منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی اور پھر اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ یعنی وہ ولیم سے ابھی بھی محبت کرتی تھی۔

بہت سے لمحے بہت اچھی طرح رو لینے کے بعد پھر وہ آنکھیں صاف کرتی ہوئی ایک عزم سے اُٹھی تھی۔

"اپنا سامان سمیٹ لو پیٹی..... ہمیں "گرینڈ فادر" کے گھر جانا ہوگا۔" ایما نے فیصلہ کن کہا تھا۔

سیاہ چہرے پر نیلی اور نشیلی آنکھوں والا "گرینڈ فادر" پہلے سے ہی ان دونوں کی آمد کا منتظر تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ام ہانی

# میری لالہ

ماما نے کیا کر دیا تھا یہ وہ نہیں جانتی تھیں، جان ہی نہیں سکتی تھیں کہ انہوں نے انجانے میں ہی سہی میرا کتنا بڑا نقصان کر دیا تھا اور شاید میں بھی کبھی نہیں جان پاتا اگر میں نے اتفاق سے انہیں کھڑکی سے باہر جاتے دیکھ نہ لیا ہوتا۔ تب ہی میرے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

"لالہ نے سب سن لیا تھا۔" اور یہ انکشاف مجھے توڑ گیا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے ماما کی باتوں نے لالہ کو توڑ ڈالا تھا۔

☆☆☆

لالہ میری چھوٹی خالہ تھیں۔ ماما سے پانچ سال چھوٹی، آمنہ خالہ جنہیں میں پیار سے خالہ کہنے کے بجائے لالہ کہتا تھا۔ ماما سے زیادہ میں ہمیشہ سے لالہ کے قریب رہا تھا۔ شاید یہ ایک دلی وابستگی تھی، جو مجھے ان سے عجیب طریقے سے باندھے ہوئے تھی۔

میری پیدائش میری ماما کی شادی کے چھ سال بعد ہوئی تھی۔ پھر میرے دو سال بعد عروہ اور پھر ثمرہ۔ لیکن میری بات ہی الگ تھی کہ ایک تو میں ماما کا اکلوتا بیٹا تھا اور دوسرا بڑی منتوں مرادوں کے بعد اس دنیا میں آیا تھا۔ میری پیدائش سے پہلے جتنی دعا میرے لیے میری ماما کرتی تھیں، اتنی ہی میری لالہ کرتی تھیں۔ انہوں نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ سے ماما کے لیے مجھے مانگا تھا۔ جب ماما پریگننٹ تھیں تو ان کی پریگننسی میں بہت سے مسائل تھے۔ ماما بہت پریشان تھیں اور لالہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ جتنا روتی تھیں لالہ اس سے بھی زیادہ روتی تھیں۔ انہوں نے میری سلامتی کے لیے بہت صدقہ کیا، بہت منتیں مانگیں، نوافل پڑھے، دعائیں کیں۔

میں جب دنیا میں آیا تو لالہ بے حد خوش تھیں، وہ پہلی بار خالہ نہیں بنی تھیں، ماما سے بڑی بھی ہماری ایک خالہ تھیں، تہمینہ خالہ جو فرانس میں ہوتی تھیں لیکن ان سے اور ان کے بچوں سے دوری کے سبب وہ لگاؤ نہیں تھا جو لالہ کو مجھ سے تھا۔ میری پیدائش پر انہوں نے اپنی کم آمدن کے باوجود بے حد خرچ کیا تھا۔ ماما سے زیادہ مجھے گودوں میں لے کر سلایا تھا، کھلایا تھا، پلایا تھا۔ راتوں کو

ماما کو سلا کر میرے لیے وہ جاگی تھیں۔ ان کی صبح مجھے دیکھ کر ہوتی اور رات بھی۔ ماما تو ایک ورکنگ لیڈی تھیں اسی لیے میں جب ایک ماہ کا ہوا تو ماما کسی میڈ کے بجائے لالہ کے پاس چھوڑ کر چلی جاتیں۔ نانو بیمار تھیں اسی لیے وہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ نوکری کے بجائے انہوں نے گھر رہنے کو ترجیح دی تھی۔ سویوں میں اپنی لالہ کی گود میں پلا بڑھا تھا۔

میری تربیت میں میری لالہ کا بڑا دخل تھا۔ مجھے ان سے ماما کی اور ماما سے ان کی خوشبو آتی تھی۔ ماما کے بعد میں کسی کی گود میں باآسانی چلا جاتا تھا تو وہ لالہ ہی تھیں۔ میں کسی کے ہاتھوں کھانا کھانے پر آمادہ ہوتا تو لالہ کے، میں کسی کے پاس سوتا تو لالہ کے۔ لالہ میری دوسری ماں تھیں یا شاید وہی میری پہلی ماں تھیں۔

میں چار سال کا تھا جب لالہ کی شادی ہوئی تھی۔ لالہ کی شادی کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ انکل اطہر کے ساتھ بھی میری اسی طرح جذباتی وابستگی تھی جیسی کہ لالہ سے تھی۔ اب نانو کے گھر جانے کے بجائے میں لالہ کے گھر جایا کرتا تھا، ان سے ملنے، ان کے پاس رہنے۔

میں نے اپنے بچپن کا بڑا عرصہ تو دور لڑکپن بھی لالہ کے ہاں گزارا تھا۔ ان کے ساتھ سے مجھے ایک عجیب سی خوشی ملتی تھی، جو بیان سے باہر ہے لیکن جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا ماما کو میرا لالہ کے ہاں جانا اور ان سے ملنا کچھ کھلنے لگا تھا۔

"جنید! اب تم بڑے ہو گئے ہو، تمہارا یوں بن بلائے منہ اٹھائے آمنہ کی طرف جانا کسی طور بھی ٹھیک نہیں ہے۔" اس روز میں لالہ کے ہاں سے ڈنر کر کے لوٹا تو ماما میرے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔

"کم آن ماما! وہ میری لالہ ہیں۔ میں نے کبھی آپ میں اور ان میں فرق نہیں کیا اور ان کا گھر ہمیشہ سے میرا گھر ہی رہا ہے۔" میں نے ماما کی بات پر کچھ خاص غور نہیں کیا۔

"لیکن اب تمہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ تمہاری خالہ اور میں تمہاری ماں۔ دونوں میں فرق کرنا سیکھو۔" میں کچھ حیران ہوا کہ ماما کو یکسر اتنے سالوں بعد یہ فرق یاد دلانا کیسے یاد آ گیا۔

"اس کی بیٹیاں اب جوان ہو رہی ہیں اور تمہارا اس طرح ان کے ہاں آئے دن جانا اور وہاں وقت بتانا کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔" میں اب بھی ماما کے دماغ میں چلتی ہوئی کھچڑی کی بو نہیں سونگھ پایا تھا۔

"وہ میری بہنیں ہیں، جیسے نمرہ اور ثمرہ۔ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"وہ تمہاری کزنز ہیں، بہنیں نہیں۔ یہ بات جتنی جلدی سمجھ لو، اتنا اچھا ہے۔" لیکن میں یہ بات جلدی تو کیا دیر سے بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

☆☆☆

جس دن میرا ماسٹرز مکمل ہوا، اس دن ماما بہت خوش تھیں اور اتنی ہی خوش لالہ بھی تھیں۔ انکل اطہر اور لالہ ہمارے ہاں مبارک باد دینے آئے تھے۔ ماما کا نجانے کیوں ان لوگوں سے رویہ کچھ سرد مہری لیے ہوئے تھا۔ لالہ کی موجودگی میں ہی ماما نے میرے اور لاریب کے رشتے کی بات چھیڑ ڈالی۔ یہ سب جتنا میرے لیے غیر متوقع تھا اتنا ہی لالہ کے لیے بھی۔ نجانے کیوں مجھے لگا تھا کہ لالہ کا چہرہ یک دم بجھ گیا ہے۔ لالہ کے جانے کے بعد میں نے ماما سے استفسار کیا تھا۔

"آپ مجھے بتائے بغیر کیسے میری لاریب سے شادی کی بات کر سکتی ہیں۔" لاریب تہمینہ خالہ کی بیٹی تھی، جس سے بہ مشکل میں تین مرتبہ ہی ملا تھا۔

"لاریب سے شادی کی صورت میں تمہارا مستقبل بہت اچھا ہوگا۔ تم کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گے۔" میری ماں ایک میٹر یلسٹک عورت تھیں۔ وہ اب بھی اپنا مفاد دیکھ رہی تھیں، جب جس بہن سے انہیں فائدہ ہوا انہوں نے اسی سے رشتہ مضبوط کر لیا اور دوسری کو چھوڑ دیا۔

"آپ کو یہ بات مجھے بتانا چاہیے تھی۔ لالہ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔"

"مجھے کیوں اس سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔



ہوں بھی وہ کیوں چاہنے لگی کہ میں کہیں اور تمہاری شادی کر دوں۔ وہ بھلا تمہیں کیوں کھونے لگی۔ دیکھا نہیں تھا کہ کیسے اس کا چہرہ اتر گیا تھا تمہارے رشتے کا سن کر۔ وہ تم سے نہیں اس رشتے سے پیار کرتی ہے جو اسے اپنی بیٹیوں کے لیے تمہاری صورت میں دکھائی دیتا ہے۔" اور ماما کی اس بات نے مجھے حیران کیا تھا۔ اس وقت وہ ایک بیٹے کی ماں تھیں جو ایک بیٹیوں کی ماں کی تذلیل پر اتر آئی تھیں۔ ہر بیٹے کی ماں جیسے زعم ان کے انداز میں دکھ رہا تھا۔

اور تب ہی میں نے دروازے سے لالہ کو بلکتے دیکھا جو گھر کی چابیاں یہیں رہ جانے پر انہیں لینے آئی تھیں اور نجانے کب سے ہماری باتیں سن کر اب یک دم پلٹی تھیں۔

لالہ نے سب سن لیا تھا۔ یہ میرے لیے ماما کی باتوں سے بڑی قیامت تھی۔ میں ان کے پیچھے نہیں گیا۔ میں نے انہیں جانے دیا۔ میں کیا کرتے ان کے پیچھے جاتا کہ جو آگ ماں منہ سے نکال چکی تھیں، اس میں ان کا خلوص جل چکا تھا۔ میں اب ایسا پانی کہاں سے لاتا جو اس آگ کو بجھا پاتا؟

"آپ ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتی ہیں ماما؟ لالہ مجھے تب سے ماں جیسا پیار کرتی ہیں جب ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد اولاد نہیں تھی تو بھی ان کے پیار میں رتی بھر کمی نہیں آئی اور اولاد ہو گئی تو بھی وہ اتنا ہی مجھے چاہتی رہیں جتنا کہ پہلے۔ آپ ان کے خلوص کی ایسی قدر کریں گی میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"یہ سب اس نے اس لیے کیا کہ میں بھی اس سے بدلے میں بڑھ چڑھ کر کرتی تھی۔ اس کی معاونت کرتی تھی، اس کی مالی معاونت کرتی تھی۔ کوئی احسان نہیں کیا۔" ماما نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"اگر بات صرف پیسے کی ہی تھی تو اتنا ہی پیسا دے کر آپ میرے لیے کوئی میڈ رکھ لیتیں لیکن آپ نے مجھے لالہ کے پاس اس لیے چھوڑا کیونکہ آپ جانتی تھیں کہ جتنا خیال وہ میرا کر سکتی ہیں، کوئی میڈ نہیں کر سکتی۔ اگر سچ سننا ہی چاہتی ہیں ماما تو سنیں۔ آپ نے نہیں، انہوں نے مجھے پالا ہے۔ انہوں نے میری تربیت کی ہے۔ انہوں نے اپنا وقت، اپنی جان اور اپنا پیار مجھ پر قربان کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے میری گندگی دھوئی ہے۔ خود بے آرام ہو کر مجھے آرام پہنچایا ہے۔ وہ قربانیاں جو ایک ماں اپنی اولاد کے لیے دیتی ہے، وہ آپ نے نہیں لالہ نے میرے لیے دی ہیں۔ اگر مجھ پر کسی کا حق ہے تو آپ سے زیادہ لالہ کا ہے۔"

"جنید....." وہ غصے سے چلائی تھیں۔

"اگر لالہ میری شادی اپنی کسی بیٹی سے کروانے کا سوچ بھی رہی ہیں تو اس میں برائی کیا ہے؟ مجھ پر اتنا کیا اس سے زیادہ کا حق وہ رکھتی ہیں۔ کیا ان کی حیثیت آپ کے نزدیک ایک میڈ کی سی تھی کہ جس نے مجھے پالا تو لیکن جب میرا رشتہ طے کرنے کی باری آئی تو آپ کو وہ کم حیثیت لگنے لگیں۔ آپ ان سے رشتہ جوڑنے کا سوچنا بھی نہیں چاہتیں کیونکہ آپ کے سامنے آپ کی ایک اور بہن ہے، جو بہت امیر ہے حالانکہ اس نے کبھی ہمیں پوچھا تو نہیں لیکن بیٹی بیاہنے کے لیے اب وہ پاکستان کا رخ کرنا چاہتی ہیں اور ایسے میں انہیں میں ایک بہترین آپشن دکھائی دے رہا ہوں۔ مجھے ایسی مادیت پرستی سے سخت چڑ ہے ماما۔"

"یہ سب میں تمہارے لیے کر رہی ہوں۔ تمہاری بہتری اور خوش حالی کے لیے۔" وہ مجھے ساتھ لگانے، پیار کرنے آگے بڑھیں تو میں پیچھے ہٹ گیا۔

"اگر میرے لیے کچھ کرنا ہی ہے ماما تو یہ کریں کہ میرا رشتہ لالہ کی کسی بیٹی سے کر دیں۔ ان کے خلوص کی اس سے بڑی قدردانی نہیں ہوگی۔" میں نے چابیاں اٹھائیں اور لالہ کی طرف چلا گیا۔ اس آگ کو اپنے آنسوؤں کے پانی سے بجھانے جو میری ماں نے لگائی تھی اور ان کو بتانے کہ میں ان کا بیٹا تھا اور ان ہی کا بیٹا بن کر رہوں گا۔ پہلے بھانجے کی صورت میں اور اب داماد کی۔

☆☆

سالگرہ نمبر



نادیہ احمد

# انمول گھڑی

''بس ایک کام کہا تھا آپ سے۔ آپ نے وہ بھی نہیں کیا۔'' صوفہ پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے چاندنی نے زوٹھے پن سے کہا۔

اب اتنے دن سے گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پھوپھو کو تو یوں بھی ادھر ادھر کی گپ شپ کرنے کا موقع اللہ دے۔ اب تو ہر کونے میں ایک نئی داستان کہی جا رہی تھی وہ بھلا کہاں ہاتھ آنے والی تھیں۔ کمال پھرتی سے کبھی ایک تو کبھی دوسری ٹولی میں ٹرانسفر ہوتیں کہ بادل ناخواستہ زبان کو زنگ نہ لگ جائے۔ اللہ اللہ کر کے صبح سب مہمان اپنے گھروں کو گئے اور ان کے نکلتے ہی دونوں چھوٹی چاچیاں اپنے اپنے میکے کے ٹور پہ نکل کھڑی ہوئیں۔ مرد حضرات کام کاج پہ نکل چکے تھے لہٰذا اس وقت پھوپھو کو آڑے ہاتھوں لینے کا عظیم موقع تھا۔

''ہر وقت ہتھیلی پہ سرسوں نہیں جمائی جاتی۔ ایسی کون سی فوج سرحد پار کر گئی جو اتنا واویلا مچا رہی ہے۔'' چائے کا مگ میز پہ پٹختے پھوپھو نے دایاں ہاتھ زور سے بائیں ہتھیلی پہ مارتے تیز لہجے میں جواب دیا تھا۔ اب اپنی غلطی ماننے والے دن تو ان کی ولادت ہوئی ہی نہیں تھی لہٰذا کھسیانی کھمبا نوچ رہی تھی۔ کانوں میں البتہ نئے بندے سجا رکھے تھے جو ان پہ سچ بھی خوب رہے تھے۔

''اچھا یعنی آپ کے حساب سے کچھ ہوا ہی نہیں خالہ؟'' انمول بھی شکوہ کیے بنا رہ نہیں پایا تھا۔ وہ ابھی چاندنی کے بلانے پہ بھاگم بھاگ گھر پہنچا تھا تاکہ پھوپھو سے بات کر سکے۔

''لے میرا بچہ، میرے لاڈلے۔ کیوں اتنا لال پیلا ہو رہا ہے۔ ارے میں ہوں نا۔ دیکھنا سب ٹھیک کر دوں گی۔'' وہ یک دم دھیمی ہوئیں اور لہجے میں بے تحاشا مٹھاس بھر کر انمول کا گال پکڑے تسلی دینے لگیں۔

''اچھا اور یہ سب ٹھیک کیسے ہوگا؟'' وہ اس میٹھے لہجے سے پہلے ہی دھوکا کھا چکا تھا اب تو کسی صورت اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ خفگی سے ہاتھ پرے کرتے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

''ارے تو کاہے کو اتنا سوچ رہا ہے۔ خواہ مخواہ کی ٹینشن لے کر سر پہ بچے چار بال بھی گنوا دے گا۔ پہلے ہی اس موئی فوج کی نوکری میں آدھا سر گنجا کر چکا ہے۔'' بھانجے کو بدظن ہوتے دیکھ پھوپھو نے یک دم پینترا بدلا اور بات کہیں سے کہیں جا نکلی۔

چاندنی نے بمشکل اپنی ہنسی چھپائی ورنہ دل تو اس وقت زمین پہ بیٹھ کر لوٹ پوٹ ہونے کو کر رہا تھا۔

''اوہو خالہ کیا بولے جا رہی ہیں۔ اچھے بھلے تو



ہیں میرے بال۔'' انمول نے بجل ہوتے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرتے چاندنی کے ہنسی دباتے چہرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

''ارے کیا خاک اچھے بھلے ہیں۔ تمہاری عمر میں تمہارے خالو کے سر پہ یہ لمبا لمبا موٹا بال ہوا کرتا تھا۔'' اب وہ دردانہ پھوپھو ہی کیا جو مان جائیں۔ ہاتھ کا گز بناتے اشارے سے بے چارے پھوپھا کے بالوں کو ہیما مالنی کی زلفیں بنا ڈالا تھا۔

''کچھ کم کر دیں پھوپھو اللہ کو جان بھی دینی ہے۔'' پاس بیٹھے چاندنی نے کھنکارا لیکن وہ یہ بھول گئی تھی اس وقت پھوپھو کے برابر بیٹھی انتہائی آسان ہدف ہے۔

''دفع دور۔ ایک تو اس گھر میں سب کو بس میرے ہی جان دینے کی فکر ہے خود تو جیسے یہ آب حیات پی کر بیٹھے ہیں نا۔'' جل کر کہتے ایک زور کی دھپ اس کی نرم و نازک کمر پہ رسید کی گئی تھی۔

''آپ سب باتیں چھوڑیں خالہ آپ نے تو کہا تھا کہ ہماری منگنی نہیں ہونے دیں گی۔'' انمول نے بات کا رخ بدلتے دیکھ کر ایک بار پھر ٹریک پہ واپس لانے کی کوشش کی۔

''فکر مت کرو شادی سے پہلے تڑوا کر دم لوں گی۔'' سامنے پڑا چائے کا مگ اٹھا کر منہ سے لگاتے انہوں نے تسلی دلائی۔

''ہونہہ۔ دیکھ لیا آپ کا دم۔ دیکھنا یہاں



ناولٹ

شادی بھی کروادیں گے سب مل کر ہماری۔" چاندنی اب تک اپنی کمر سہلا رہی تھی۔

"تو میں ہوں نا۔ طلاق کروادوں گی ان شاء اللہ۔" پھوپھو نے روانی میں جواب دیا۔

"خالہ ہوش کے ناخن لیں۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ!" سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھا انمول بے اختیار اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ واقعی ان سے تو کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

"یہاں منگنی کروا کے راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے اور آپ شادی سے طلاق تک پہنچ گئی ہیں۔" چاندنی منہ بسورتے معصومیت سے بولی۔

"تو میں کون سا تم سے منگنی کے بعد بھنگڑے ڈال رہا ہوں۔ میرا تو اپنا فکر کے مارے برا حال ہے۔" اس سے پہلے کہ پھوپھو کوئی وضاحت دیتیں انمول چڑ کر بولا تھا۔ اب جس سانحے سے چاندنی اتنی دل برداشتہ تھی وہ اس کے لیے بھی کم صدمہ کا باعث تو نہیں تھا نا۔

"تمہیں کون سا بھنگڑا ڈالنا آتا ہے۔ تم وہی لڈی ڈانس کردینا جو تم نے غضنفر چاچو کی شادی پہ کیا تھا چمچے بجا کر۔" چاندنی نے چہک کر بولتے انگلیوں کے اشارے سے باقاعدہ نقل اتاری۔

"دیکھ رہی ہیں آپ خالہ۔ کیا ہوسکتا ہے اس جنگلی بلی کے ساتھ میرا گزارا؟" انمول نے پھوپھو کا بازو ہلاتے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ پھوپھو حیرت زدہ سی کبھی چاندنی تو کبھی انمول کو دیکھے گئیں۔

"پتا نہیں یہ امی اور نانی کو کیا سوجھی مجھے اس کے پلو ڈال دیا۔" وہ سر جھٹکتے مزید بولا تھا۔

"اوہ ہیلو۔ پلے تو مجھے باندھا جارہا تمہارے اور خبردار جو تم نے مجھے ایک بار بھی جنگلی بلی کہا تو ورنہ منہ نوچ لوں گی میں تمہارا۔" وہ چٹکی بجاتے تھوڑا آگے ہوئی اور دوٹوک انداز میں تنبیہہ کی تھی۔

"کہوں گا۔ سو بار کہوں گا۔ تم ہو جنگلی بلی اسی لیے تو منہ نوچنے کو آرہی ہو۔" وہ قہقہہ لگاتے باقاعدہ چڑانے لگا تھا۔

"انمول تم..... تمہیں تو میں اب بتاتی ہوں۔" بے اختیار آگے بڑھ کر چاندنی نے انمول کے فوجی کٹ بالوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا تھا۔ انمول اور پھوپھو، دونوں ہی اس حملے کے لیے ذہنی طور پہ تیار نہ تھے۔ بال چھڑوانے کو انمول جھٹ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تو وہیں صوفہ پہ بیٹھی پھوپھو گھبرا کر اچھلیں۔

"ارے رکو۔ پاگل ہوگئی ہے کیا چاندنی۔ ارے انمول۔" پھوپھو چائے کا کپ میز پہ رکھ کر ریفری بن کر دونوں کے درمیان کودیں لیکن وہ سنے والے تھے۔ چاندنی سے اپنے بال چھڑوانے کے بجائے انمول نے الٹا اس کی چوٹی پکڑ کر نوچنا شروع کردی تھی۔

"کیا ہورہا ہے یہ کس لیے اتنا واویلا مچا رکھا ہے یہاں؟" غضنفر چچا کی غصیلی آواز پہ سب نے ایک ساتھ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی چچی کو میکے چھوڑ کر گھر آئے تھے اور اندر داخل ہوتے بیٹھک سے آتی چیخ وپکار پہ وہاں پہنچے اور اب اندر ہورہی دھینگا مشتی پہ قہر آلود نظروں سے کھڑے دونوں کو گھور رہے تھے۔

"چاچو وہ..... ماموں وہ....." وہ دونوں ہی منمنائے تھے۔

"کیا چاچو..... ماموں لگا رکھا ہے؟ تمیز اور عقل نام کی شے یا نہیں؟"

انہیں غصہ کم ہی آتا تھا اور انمول سے تو یوں بھی ان کی گہری دوستی تھی لیکن اس وقت انہیں واقعی ان دونوں کی کم عقلی پہ خوب غصہ آیا ہوا تھا جو ان کی شخصیت پہ اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا۔

"میں تو خود دیکھ کر حیران ہوگئی ہوں غضنفر دیکھو تو دونوں کیسے لڑ رہے ہیں۔ بھلا ان کا ایک ساتھ گزارا ہوسکتا ہے۔ ابھی ہاتھا پائی پہ اتر آئے ہیں شادی کے بعد تو چھریاں چاقو چل جائیں گے۔" پھوپھو نے بے اختیار لقمہ دیا تھا۔ اتفاق سے یہ ایک بہترین



موقع تھا جلتی میں تیل ڈال کر بات بڑھانے کا۔

"ہائے میں تو کہتی ہوں میرے بھائی ان دونوں کی منگنی ختم کروادو۔ ان کا کہاں گزارہ ہونے والا ہے ایک ساتھ۔ طبیعت نہیں ملتی ان کی۔" بھائی کا ہاتھ تھامے پھوپھو نے چال بازی سے کہا۔

"طبیعت نہیں ملتی ان کی۔" غضنفر چچا نے حیرت سے پھوپھو کی طرف دیکھتے جملہ دہرایا۔

"مذاق ہے کیا منگنی ختم کروانا۔ تو تبھی ان بچوں کے ساتھ بچہ بن گئی دردانہ!" پھوپھو کا ہاتھ جھٹکتے چچا تیز آواز میں بولے۔

"عقل ہے یا گھاس چرنے نکل گئی۔" وہ مستقل انمول اور چاندنی کو گھور رہے تھے جو چپ چاپ سر جھکائے شرمندہ ہورہے تھے۔

"ارے ہٹ۔ تجھ سے تو زیادہ عقل ہے مجھ میں کم بخت۔ دیکھ نہیں رہا ان دونوں میں اتنی سی بھی ذہنی مطابقت نہیں الٹا رقابت ہے۔ ایسے ہوتی ہیں کیا شادیاں؟ کل کو طلاق سے تو بہتر ہے ابھی منگنی ٹوٹ جائے۔" پھوپھو کے تیور بھی بدلے تھے۔

انہیں بیٹھے سے کڑوا ہونے میں کون سا وقت لگتا تھا۔ اب سوچا تو یہی تھا بندوق غضنفر چچا کے کندھے پہ رکھ کر وار ہوجائے لیکن انہیں ہاتھ نہ آتا دیکھ کر وہ بھی جھٹ سیدھی ہوگئی تھیں۔

"در فٹے منہ تیرا دردانہ۔ تیرے جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو کسی کا گھر بستا نہیں دیکھ سکتیں۔" چچا سچ میں تلملا اٹھے تھے۔ وہ بات جو گھر میں کوئی خواب میں نہیں سوچ سکتا تھا پھوپھو پورے وثوق سے دہرا رہی تھیں تو غصہ تو آنا ہی تھا۔

"غضنفر! میں کہہ رہی ہوں چپ کر جا ورنہ بہت برا ہوگا۔" لو جی ہمیشہ کی طرح پھوپھو اور چچا کے درمیان ڈبلیو ڈبلیو ایف شروع ہونے والا تھا۔

"ارے تجھ سے زیادہ برا ہمارے ساتھ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔" چچا نے باقاعدہ پھوپھو کے انداز میں ہاتھ نچاتے بدلہ چکایا تھا۔

"اور تم دونوں۔ خبردار جو آئندہ تم دونوں کو لڑتے دیکھا تو۔ سمجھ آئی؟" اس سے پہلے کہ پھوپھو کوئی جواب دیتیں انہوں نے فوراً ہی انگلی اٹھا کر وارننگ کے سے انداز میں سامنے کھڑے انمول اور چاندنی کو سختی سے کہا اور ان کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر کمرے سے باہر نکل گئے۔

"ہائے کیسے ایک منٹ میں اتنی باتیں سنا گیا مجھے کمینہ۔" پھوپھو کا تو جیسے اس وقت خون کھول رہا تھا۔ جوابی جملہ جو حلق میں اٹک گیا تھا۔ بہرحال اب تو بات ان کی ساکھ پہ بن آئی تھی اس لیے ہر حال میں انہیں یہ چیلنج پورا کرنا تھا۔

"تم دونوں بالکل فکر مت کرو میرے بچوں۔ میں بھی دیکھتی ہوں یہ منگنی چار دن سے زیادہ کس طرح چلتی ہے ورنہ میرا بھی نام دردانہ نہیں۔" دونوں کو سینے سے لگاتے پھوپھو نے ایسے تسلی دی تھی جیسے کوئی چھوٹے بچوں کو آئس کریم نہ ملنے پہ دیتا ہے۔

کچھ بھی تھا کھیل شروع ہوچکا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں کیا لگتا ہے انمول؟" چاندنی نے سیڑھیوں پہ بیٹھے ناخن چباتے اپنی الجھن سلجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے تو سردی زیادہ لگتی ہے۔" اس سے ایک اسٹیپ اوپر بیٹھے انمول نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔

"پاگل ہوگئے ہو کیا۔ میں تو پوچھ رہی ہوں تمہیں کیا لگتا ہے پھوپھو ہماری منگنی ختم کروادیں گی۔" چاندنی نے پلٹ کر ایک چپت انمول کے گھٹنے پہ ماری۔

"تو ایسے پوچھو نا۔ ادھورے سوال پوچھو گی تو جواب بھی ویسا ہی ملے گا۔" ایک تو پہلے ہی پریشانی سے دماغ سن ہورہا تھا۔ سیدھی باتیں بھی الٹی ہی سمجھ میں آرہی تھیں۔

"یار میرا تو خیال ہے خالہ کو ایک چانس دینا چاہیے۔ خاصا ڈیڈلی کمبینیشن ہیں وہ۔" اسی مسلسل

میں اس نے مزید کہا تھا۔
"ایک چانس تو پہلے ہی دے چکے ہیں۔ تم بھول رہے ہو یہ دوسرا چل رہا ہے اور اگر یہ چانس مس ہوا تو بات شادی تک چلی جائے گی انمول اور میں تم سے شادی مر کر بھی نہیں کر سکتی۔" پریشان لہجے میں کہتے چاندنی پلٹے بنا اوپر بیٹھے انمول کے برابر خالی جگہ پہ جا کر بیٹھ گئی تھی۔
"اور جیسے میں تو جی ہی تم سے بیاہ رچانے کے لیے رہا ہوں۔" انمول نے بدلہ چکایا تھا۔
"اُف..... ایک تو تم فوجی ہر وقت مسلح رہتے ہو لڑائی جھگڑا کرنے لیے۔" چاندنی نے بے ساختہ ماتھا پیٹ لیا۔
"دیکھو فوج کو کچھ مت کہنا۔ یہ فوج ہی ہے جس کے سر پہ تم سویلین چین کی نیند سو رہے ہو۔" انمول نے انگلی اٹھائے تنبیہہ کی تھی۔
"تم اپنی بات کرو۔ اس وقت تمہاری وجہ سے میں تین دن سے سو نہیں سکی ہوں۔" وہ کون سا بدلہ رکھنے والوں میں سے تھی۔
"تو کیا میں واقعی اتنا ہینڈسم ہوں جس نے تم جیسی نک چڑھی کی نیندیں چرا لی ہیں۔" انمول نے مزید چڑاتے کمینی ہنسی ہنسی تھی۔
"اخ تھو۔ تم اور ہینڈسم؟" وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
"اللہ کی دین ہے محترمہ کبھی غرور جو نہیں کیا۔" اپنی پولو شرٹ کے کالر درست کرتے وہ اترایا۔
چاندنی کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔ بجائے جواب دینے کے وہ نیچے اترنے لگی۔ ایک تو ٹینشن اس پہ انمول کی دل جلانے والی باتیں۔ حالانکہ اس واقعہ سے پہلے دونوں میں اچھی بھلی دوستی تھی لیکن جب سے اس کی منگنی انمول سے ہوئی تھی پتا نہیں کیوں وہ اسے شدید زہر لگنے لگا تھا۔
"دیکھو چاندنی۔ لڑائی جھگڑے سے صرف ہم کمزور ہو سکتے ہیں۔ اگر اس محاذ پہ دشمن کا مقابلہ کرنا ہے تو مل کر یہ جنگ لڑنی ہو گی۔" انمول نے خفگی سے نیچے جاتی چاندنی کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا اور ایک بار پھر اپنے برابر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔
"جنگ؟ محاذ؟ یہ دشمن کون ہے اور کہاں سے آ گئے؟" سیڑھی پہ بیٹھتے چاندنی نے منہ بنایا۔ اس کے واقعی سر پہ سے گزر گیا تھا انمول کا فلسفہ۔
"ارے یار! میں بھی کس احمق کے ساتھ سر کھپا رہا ہوں۔" اس بار سر پیٹنے کی باری انمول کی تھی۔
"دشمن کا مطلب دوسری پارٹی۔ یعنی ہمارے خاندان والے بدھو۔" وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ سب گھر والوں سے چھپ کر وہ دونوں چھت کی سیڑھیوں پہ بیٹھے اپنے مسئلے کا حل تلاش کر رہے تھے۔
"تو ایسے بتاؤ نا۔ جنگی چالیں تو یوں سکھا رہے ہو جیسے ہم انڈیا سے جنگ کرنے والے ہوں۔"
اب کہنے کو تو دردانہ پھوپھو نے خوب تسلی دے دی تھی کہ وہ کسی بھی قیمت پہ ان دونوں کی شادی نہیں ہونے دیں گی لیکن ان پہ اعتبار کر کے پہلے ہی پھنس چکے تھے۔ اب تو بس اسی سوچ میں سر جوڑے بیٹھے تھے کہ آخر اس مسئلے کا کیا حل ہو اور کس طرح اس مشکل سے جان چھوٹے، وہ بھی اس صورت جب پورا خاندان خوشی منا رہا ہے۔
"دیکھو مجھے خالہ پہ زیادہ بھروسا نہیں ہے۔ وہ اگر چاہیں تو بازی الٹا سکتی ہیں لیکن پھر وہی بات۔ میری یا تمہاری امی نے گھڑی یا انگوٹھی دے دی تو وہ سب بھول بھال ہماری شادی کے گیت گانے لگیں گی۔" وہ انتہائی مدبرانہ انداز میں بولا تھا لیکن بھول گیا تھا کہ سامنا چاندنی سے ہے۔
"تو پھر ہم کیا کریں گے انمول۔ پھوپھو کی تو آواز بھی سب سے بری اور سب سے اونچی ہوتی ہے۔ بنا سر، لے اور تال کے اتنا زور زور سے گاتی ہیں وہ کہ ساتھ بیٹھتے ہوئے کان کا پردہ ہی پھٹ جائے۔" اس نے منہ بنائے بے حد سنجیدگی اور بے تحاشا پریشانی سے انمول کا شانہ ہلاتے جواب دیا تھا۔ انمول سب کچھ بھول بھال بس اس کا منہ ہی



دیکھتا رہ گیا۔
"ابے چپ۔ اس خاندان کی تو لگتا سب عورتیں پاگل ہیں۔ کہاں پھنس گیا میں یار۔ اب خود ہی کچھ سوچنا پڑے گا۔" وہ تقریباً چیختے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور تن فن کرتا نیچے اتر گیا۔
پیچھے چاندنی حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہی۔ اسے انمول کے غصے کی وجہ سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی آخر اس نے تو سچ ہی بولا تھا پتا نہیں پھر کیوں انمول برا مان گیا۔ سر جھٹکتے وہ بھی اٹھ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔

☆☆☆

وہ جلا بھنا نیچے پہنچا اور بنا رکے صحن سے ہوتا دروازے کی طرف بڑھا۔ موڈ اتنا خراب تھا کہ وہ کسی سے بھی ملے بغیر بس گھر واپس جا رہا تھا لیکن پیچھے سے غضنفر چچا کی آواز سن کر اسے مجبوراً رکنا پڑا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے متانت سے چلتے وہ بے حد سنجیدہ چہرے کے ساتھ انمول کا جائزہ لیتے اس کے قریب پہنچے۔
"کیا چل رہا ہے یہ سب؟" کسی جاسوس کے سے انداز میں سوال کرتے انہوں نے ابرو اچکائے۔
"کدھر؟" وہ اچھی طرح جانتا تھا چچا کا اشارہ کس طرف ہے پھر بھی جان کر انجان بنتے معصومیت سے سوال کیا۔
"ہاں وہ شاید پڑے کمرے میں ٹی وی چل رہا ہے۔" کچھ سوچ کر چٹکی بجاتے وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا لیکن غضنفر چچا کے چہرے پہ ہنوز سنجیدگی قائم تھی۔
"بیٹا استادوں سے..... استادی؟" انمول کے گرد چکر کاٹتے وہ بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولے تھے۔
"کیوں لڑ رہے تھے تم دونوں، ہیں؟" اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے سوال کیا۔
"ماموں آپ کو تو پتا ہے چاندنی کی زبان کیسی ہے۔ سوچ کر کھن آتی ہے۔" اچانک اس کے دماغ نے بتی جلائی۔ اس نے منہ لٹکائے بے بسی سے کہا۔
"ہیں؟" غضنفر چچا نے سر کھجایا۔ "ارے وہ گولیاں ٹافیاں کھاتی رہتی ہے نارنگ برنگی۔ اسی وجہ سے ہو گئی ہو گی زبان گندی۔" ہاتھ پہ ہاتھ مارتے انہوں نے انمول کو تسلی دی تھی۔
"ماموں میں اس کی بدتمیزیوں کا کہہ رہا ہوں آپ کہاں پہنچ گئے۔" وہ تنک کر بولا۔
"بدتمیز تو نہیں ہے یار، وہ بس شرارتی ہے۔" غضنفر چچا نے محبت سے بھتیجی کی طرف داری کی تھی۔
"اچھا تو آپ اسے شرارت کہتے ہیں؟ وہ نانی اور امی کے متعلق پتا ہے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔" کیوں نہ غضنفر چچا کے ذریعے ہی معاملہ ختم کروا لیا جائے۔ اب کچھ تو سین بنانا ہی پڑے گا غلط فہمیوں کا آغاز کرنے کے لیے۔ پھوپھو نہیں تو چچا ہی سہی۔ چھٹکارا جو پانا تھا اس رشتے سے۔
"کیا؟" چچا بھی یک دم چوکنے ہوئے۔
"یہی کہ امی ہر لحاظ سے نانی کی کاربن کاپی ہیں۔" انمول نے مزید رازداری برتی اور چچا کے کان میں کہا۔
"تو ماں بیٹیاں جو ہوئیں۔" وہ پوری بتیسی نکالے ہنسے تھے۔
"نہیں ماموں۔ وہ کسی اور ریفرنس میں یہ سب کہہ رہی تھی۔" انمول نے وضاحت دی۔
"کیا مطلب؟" چچا نے چندھیا کھجاتے سوال کیا۔ اچانک انہیں اس معمے میں دلچسپی ہوئی۔
"مطلب وہ چالاکیوں میں کہہ رہی تھی اور مجھے پورا یقین ہے اسے یہ بات ممانی نے ہی کہی ہو گی۔"
"دیکھ بھئی۔ یہ گھر کی عورتوں کی باتوں کو نا، ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینا چاہیے۔ گر کی بات بتا رہا ہوں تجھے میں آج کے بعد دوبارہ نہیں بتاؤں گا۔" چچا نے انمول کا کندھا تھپکتے شانِ بے نیازی سے کہا تھا۔
"اور ہاں ایک اور بات۔ دردانہ سے جتنا

ہو سکے دور رہنا۔ کل کو کوئی مسئلہ ہوا تو میں نہیں بچاؤں گا، بتا رہا ہوں۔" دونوں ہاتھ اٹھا کر محتاط کرتے وہ بہت سنجیدگی سے بولے۔

"یار ماموں آپ کی بہن ہیں وہ۔" اس نے یاددہانی کرائی۔

"اسی لیے تو پہلے بتا دیا ہے۔" چاہنوز سنجیدہ صاف گوئی سے کہتے اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ انمول کندھے اچکائے گھر کی طرف چل پڑا۔ ایک طرح سے اس کی چھوٹی سی کوشش بے کار ہی گئی تھی۔ یہ چچا تو کسی بھی طرح اس کی مدد کرنے والے نہیں تھے۔

☆☆☆

وہ بہت دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی انہیں دھلے ہوئے کپڑوں کو تہ لگاتے دیکھ رہی تھی۔ ایک دو بار انہوں نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، ان کا خیال تھا وہ کچھ بات کرنا چاہتی ہے لیکن وہ خاموش رہی تو انہوں نے بھی نظر انداز کر دیا۔

"امی ایک بات کہوں؟" وہ واقعی اتنی دیر سے بیٹھی لفظوں کو تول رہی تھی۔ جو دل میں تھا اسے زبان سے ایک بار کہہ کر تو دیکھ ہی چکی تھی۔ نتیجہ صفر تھا اور انہوں نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ پھر جب بات سیدھے طریقے سے نہیں بن رہی تو انگلی ٹیڑھی کرنے میں حرج ہی کیا تھا یہی سوچ کر اس نے بیٹھے بیٹھے ایک پلان بنایا تھا۔

"ہاں بولو۔" اس بار اس کی طرف دیکھے بنا انہوں نے جواب دیا۔

"نہیں رہنے دیں آپ شاید ناراض ہو جائیں گی۔"

"اب بول بھی دو۔ کیوں بلاوجہ کا سسپنس پھیلا رہی ہو۔" کپڑے سمیٹ کر بیڈ کے کونے پہ رکھتے وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"وہ باہر دردانہ پھوپھو اور نانی باتیں کر رہی تھیں۔" اس نے ناخن کھرچتے کن انکھیوں سے ماں کو دیکھا۔

"ہاں تو اللہ نے زبان دی ہے بات تو کریں گی اب کیا منہ سی لیں۔" وہ تنک کر بولیں۔

"امی آپ نے اگر یہ فیصل آبادی جگتیں ماریں ہیں تو میں آپ کو کچھ نہیں بتاتی۔" چاندنی معصومی خفگی سے کہتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی جیسے کمرے سے جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

"زیادہ ڈرامے نہ کر۔ جیسے میں نہیں جانتی جب تک تم مجھے بتاؤ گی نہیں پیٹ میں درد سے تڑپتی رہو گی۔ چلو اب بولو، کیا بات کر رہی تھیں وہ۔" کمر پہ ایک زور کی دھپ مارتے انہوں نے اسے کھینچ کر واپس بٹھایا اور حکمیہ انداز میں کہا۔

"ان سے شاید بڑی پھوپھو نے کہا تھا وہ جو منگنی پہ آپ نے انہیں سامان گفٹ میں دیا تھا۔ انہیں بالکل پسند نہیں آیا۔" سر جھکائے اس نے جھوٹ بولا۔

"تو یہ باجی نے تمہاری دادی کو بتایا۔" حسب توقع تیر ٹھیک نشانے پہ لگا تھا۔ ٹھوڑی پہ ہاتھ جمائے وہ سوالیہ نظروں سے چاندنی کو دیکھ رہی تھیں جس نے انتہائی معصومیت کا مظاہرہ کرتے اثبات میں سر ہلایا۔

"اللہ کی پناہ یہ تو سارا خاندان ہی منافقوں کا ہے منحوس۔ دیکھو میرے سامنے کیسے زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے تھے۔ ہائے میری تو نندوں کو جوڑے اتنے پسند آئے۔ میرے تو سسرال میں ناک اونچی ہو گئی تم نے اتنا شاندار انتظام کیا تھا اور اب دیکھو ماں بہن کے کان میں کیا زہر انڈیل رہی ہیں۔"

ان کو پتنگے لگنا ایک طرح سے درست ہی تھا۔ ایک تو گھر میں پہلا خوشی کا موقع، اس پہ نند پہ دھاک بٹھانے کے چکر میں انہوں نے ایک ایک چیز عمدہ اور بڑے دھیان سے لی تھی کہ جس نے دیکھی تعریف ہی کی۔ خود نند صاحبہ نے بھی کئی بار اس بات کا تذکرہ کیا تھا اور اب ایسا انکشاف۔ بہر حال اتنا تو انہیں یقین تھا کہ ان کی سسرال اندر کی گانٹھ ہے تو ضرور یہ بات



ہوئی ہو گی البتہ ایک بار بھی اس کی تصدیق کا خیال دل میں نہیں آیا تھا۔

"خیر کریں جو کرنا ہے۔ میں بھی شادی پہ جوڑا چھوڑ رومال بھی نہیں دوں گی ان منافقوں کو۔ پھر روئیں، رونے سچے والے۔" چاندنی کو اگر لگتا تھا ماں اس بات پہ ردعمل کرتی کوئی جھگڑا کھڑا کریں گی تو اسے مایوسی ہوئی تھی۔ وہ تو آگے کی پلاننگ کرنے لگی تھیں۔

"ہاں تاکہ شادی کے بعد وہ مجھے طعنے دے دے کر مار ڈالیں۔" اس کا دل چاہا دھاڑیں مار مار کر روئے۔ آخر یہ لوگ کیوں اس کی شادی انمول سے کرنے پہ تلے تھے۔

"کسی کی ہے مجال جو میری بیٹی کو طعنے مارے۔ میں دیکھ لوں گی ان سب کو تو۔" چاندنی کا گال تھپتھپاتے تسلی دی تھی۔

"ایسی جنگ و جدل والی جگہ شادی کرنی ہی کیوں ہے۔ میں تو کہتی ہوں گولی ماریں اس رشتے کو میرے لیے بھلا لڑکوں کی کوئی کمی ہے۔ ایک چھوڑو ہزار مل جائیں گے۔" اس نے ماں کا ہاتھ تھامے سمجھایا۔

"اچھا جی۔ آپ کیا پی ایس ایل فائنل کا ٹکٹ ہیں جسے بلیک میں لینے ہزاروں کا مجمع جمع ہو گا۔" ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا گیا تھا۔

"اوقات میں رہ اور شکر کر۔ اچھا بھلا لڑکا ہے ایسا پیارا، صاحب روزگار۔ سب سے بڑھ کر باپ کی طرح ہمیشہ دب کے رہے گا۔" اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑے ہوتے انہوں نے مزید کہا۔

"زیادہ دبنے سے تو ٹوٹ جائے گا نا امی۔" ہائے یہ ماؤں کی حسرتیں۔ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"بکواس بند کر اور یہ کپڑے استری کر اور ابا کے سوٹ کو اچھی طرح استری کرنا ایک بھی شکن نہ ہو۔" تہ شدہ کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے انہوں نے غصے سے کہا اور خود کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

پچھلے ایک ہفتے سے وہ دونوں گھر کے کسی نہ کسی فرد کو ایک دوسرے کے متعلق ایسی ہی کوئی جھوٹی داستان سنا کر ہمدردی بٹورنے میں مصروف تھے لیکن نتیجہ صفر تھا۔ ان کی بات کی تصدیق کیے بغیر سب ان کے ساتھ تھے، ان کے دکھ درد میں شریک تھے لیکن اس بات پہ ہرگز رضامند نہیں تھے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پہ یا آپس کے اختلاف میں الجھ کر اس رشتے کو ختم کیا جائے۔ پھر چاہے وہ غضنفر چچا ہوں یا دادی۔ یہاں تک کہ چچی بھی اس معاملے میں بڑوں کی ہی ہم خیال تھیں۔ ایک بس دردانہ پھوپھو تھیں جو اس دن غضنفر چچا سے منہ ماری کے بعد سے گھر آئی تھیں نہ ہی کسی سے کوئی رابطہ کیا تھا۔ یوں تو سب پرسکون تھے کہ چلو کسی بہانے چار دن گھر پہ تو ٹکیں لیکن مسئلہ تو انمول اور چاندنی کا تھا جن کی آخری امید بس اب پھوپھو ہی تھیں۔

"کچھ بات بنی؟" فون کی بیل کب سے بج رہی تھی اور سب ہی کان لپیٹے اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے مجبوراً فون چاندنی کو ہی اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف انمول تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اس نے بلا جھجک سوال کیا تھا۔

"ابھی تک تو نہیں۔" چاندنی نے برا سا منہ بنایا۔ اب تو خیر بنانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی کہ جب جب شادی کے متعلق سوچتی منہ اپنے آپ برا ہی بن جاتا تھا۔

"ڈونٹ وری۔ سب سیٹ ہو جائے گا میں خالہ سے کہتا ہوں امی سے بات کریں۔" وہ خاصا مطمئن لگ رہا تھا جیسے طے کر چکا ہو اب کیا کرنا ہے۔

"ویسے تو میں خود بھی انہیں انکار کر سکتا ہوں لیکن بس میں ان کی دل آزاری نہیں چاہتا۔" یہی تو مسئلہ تھا۔ وہ خود اتنے دن سے سوچ رہی تھی کہ ابا سے بات کر لے۔ ایک وہی ہیں جو اس کی خوشی کی خاطر دو ٹوک فیصلہ لے سکتے ہیں لیکن بات وہی کہ ان دنوں بہن سے ایک نیا رشتہ جوڑ کر وہ خود بڑے

مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے اور ایسے میں انہیں تکلیف دینا ایسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا، ہاں ماں کی بات اور تھی۔ ان سے تو روز ہی کوئی نہ کوئی منہ ماری ہوتی رہتی تھی اور پھر چار باتیں سن کر ذلیل ہو کر وہ منہ بسورتی وہی کرتی جو ان کا حکم ہوتا۔

"میں نے تو انکار کر کے بھی دیکھ لیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔" چاندنی کارڈلیس ہاتھ میں تھامے بڑے کمرے کے چھوٹے صوفہ پہ جا بیٹھی۔

"ہمارے گھر والے بھی کتنے عجیب ہیں نا۔ انہیں خاندان جوڑنے کی پڑی ہے لیکن اس بات سے کوئی غرض نہیں ہم اس رشتے میں جڑنا چاہتے ہیں یا نہیں۔" انمول نے تبصرہ کیا۔ اس کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں لیکن وہ یہ کھاتہ بند کیے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے جو کچھ ہونا تھا ابھی ہو جانا ضروری تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم ان سب کو بس اپنی فکر ہے۔ ہماری خوشی سے تو کسی کو کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"چاندنی ایک بات پوچھوں؟" انمول نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"پوچھو۔"

"تم کسی کو پسند کرتی ہو؟" اس نے محتاط سے انداز میں پوچھا تھا۔

"میں؟ ہاں نا۔ مجھے وہ..... فواد خان بہت پسند ہے۔" وہ بیٹھے بیٹھے شرما گئی ایسے جیسے فواد خان اسے ہی تاڑ رہا ہو۔

"اس سے بھی پوچھ لینا تھا وہ تمہیں پسند کرتا ہے یا نہیں۔" انمول نے جل کر جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

"دماغ کا دہی کر دیا میں بھی کس احمق سے بات کرنے لگا تھا۔" پتا نہیں اب یہ غصہ فواد خان پہ تھا یا چاندنی پہ، بہر حال وہ اندر تک جل کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

"کیا کہہ رہی ہے تو دردانہ؟" پھوپھو کی سرگوشی سن کر ان کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"دیکھو باجی جو دیکھا سنا وہی بتا رہی ہوں۔ اب تم میرا نام لے کر مجھے گندامت کروا دینا۔" بہن کا ہاتھ دباتے انہوں نے مزید ہیجان پیدا کرنا چاہا تھا۔ "پھر ہے تو اپنے گھر کی بیٹی کا ہی معاملہ۔"

وہ بس ان کی شکل ہی دیکھے گئیں جو بہن کی نظروں کی تاب نہ لا کر آنکھیں چرانی چائے کے مگ میں منہ دیے سڑوپ سڑوپ پینے لگی تھیں۔ مگر حرکت بھی تو کچھ ایسی کر دی تھی۔ آخر

"بیٹی کا معاملہ ہے تو کیا آنکھ بند کر کے بیٹھے رہیں اور یہ بھابھی نے تو لگتا واقعی ہی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ جوان لڑکی ہاتھ سے نکلی جا رہی اور یہ اللہ جانے کون سی مستیوں میں مگن ہیں۔" وہ تڑپ کر بولیں۔ غصہ زیادہ اس دھوکے پہ تھا جو ان سے بات چھپا کر انہیں دیا گیا تھا لیکن وہ بے چاری کون سا اندر کی بات جانتی تھیں۔

"ارے چھوڑنا باجی۔ دو تین مہینوں کی تو بات ہے۔ انمول سے شادی ہو گئی ایک بار تو پیچھے مڑ کر کون دیکھتا ہے بھلا۔" کندھے پہ ہاتھ مار تے دی گئی تسلی نے انہیں اور بھی سیخ پا کر دیا تھا کہ وہ تنک کر بولیں۔

"لو بھلا ان قیافوں کی بنیاد پہ اپنا اتنا ہونہار بیٹا داؤ پہ لگا دوں؟" پھوپھو کا تیر درست نشانے پہ لگا تھا۔ اس دن غضنفر چچا سے ہوئی لڑائی کے بعد انہوں نے بھی ٹھان ہی لیا تھا کہ اب بس ایک ہی وار سے یہ کام تمام کرنا ہے۔ اسی لیے تو اتنے دن سے غائب تھیں کہ سب کو ہی تشویش لاحق ہو گئی تھی اور پھر کل رات ہی ڈرامہ دیکھتے معصوم ہیروئن کے دو معاشقوں کا علم ظالم سسرال والوں کو ہونے کے بعد ٹوٹنے والے رشتے کے سین نے ان کے بھی دماغ کو بجلی فراہم کی تھی لہٰذا بمشکل رات گزار کر اگلے دن سواری بہن کے گھر پہنچی اور آتے ہی یہ کارنامہ سر انجام دیا تھا۔

"ان دونوں کو پہلے بیٹی سے اس کی مرضی تو پتا



کر لینی چاہیے تھی۔ وہ اگر راضی نہیں تھی تو میرے گھر کیوں ہاتھ ڈالا۔" ہونے والی بہو کا محلے دار سے چل رہا ہے چکر سن کر ان کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ انہوں نے کہاں سوچا تھا کہ چار گھر چھوڑ کر بچپن سے نظر کے سامنے رہنے والی بھتیجی کا ایسا کوئی چھپا قصہ بھی ہو سکتا ہے۔

"محلے کے لڑکوں اور ہمارے انمول میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ گھر کا لڑکا، جانا پہچانا، بے عیب۔ باہر بیٹی بیاہنے سے تو اچھا گھر میں ہی یار لگا دی جائے۔" لوہا گرم دیکھتے دردانہ پھوپھو نے ایک اور وار کیا تھا۔

"کیا مذاق سمجھ رکھا ہے بھائی جان نے؟" اس قدر وثوق سے بہن کی کہی بات پہ یقین کرنے کے سوا اب چارا ہی کیا تھا پھر جس انداز میں انہوں نے مرچ مسالا لگا کر بتایا تھا ان کی برداشت جواب دینے لگی تھی۔

ہمیں بدگمان ہونے میں بس ایک ہی پل لگتا ہے چاہے حقائق آنکھوں کے سامنے کیوں نہ ہو۔ وہ اس لیے کہ ہمارا جھکاؤ ہمیشہ منفی خبروں پہ ہی رہتا ہے۔ انہیں بھی بنا تصدیق بس ایک ہی پل لگا تھا بہن کی بات کو سچ ماننے میں۔

"ابھی جا کر کرتی ہوں بات دوٹوک۔ میرا ہی بچہ ملا تھا کیا بلی کا بکرا بنانے کو انہیں۔ بلکہ جا کر ہی کیوں۔ فون پہ ہی رشتہ ختم کرتی ہوں میں۔" وہ جیسے کوئلوں پہ لوٹ رہی تھیں فون اٹھایا اور بھاوج کا نمبر ملا دیا۔

"ہاں بھابھی۔ حال احوال کو چھوڑیں مجھے یہ بتائیں جب محلے میں عشق کی پینگیں ڈالی گئی تھیں تو گھر کے بچے کو جھولے میں کیوں ڈال دیا اور کچھ نہیں تو بیٹی کی خوشی سمجھ کر ہی اس آوارہ نکھٹو ہمسائے کو داماد بنا لیں۔ بہر حال داماد بنائیں یا گدھا آپ کے گھر کا معاملہ ہے بس میری طرف سے تو رشتہ ختم سمجھیں۔ خدا حافظ۔" فون بند کر کے انہوں نے اپنی کب کی رکی سانس بحال کرتے دردانہ پھوپھو کو دیکھا۔ جس کام کے لیے انمول اور چاندنی دس جتن کر چکے تھے بس ایک ہی نشست میں دردانہ پھوپھو کی بدولت ہو گیا تھا وہ بھی اس قدر کھڑاک کے ساتھ۔

"کیا ہوا امی۔ سب خیریت ہے نا اتنا ہائپر کیوں ہو رہی ہیں؟" ٹھیک اسی وقت انمول کمرے میں داخل ہوا اور ماں کے چہرے کی پھولی رگیں اور سرخ رنگت جو اس وقت نان اسٹاپ بولنے اور غصہ کرنے سے ہو رہی تھی دیکھ کر تھوڑا گھبرا سا گیا۔ وہ خود تو خاموش رہیں لیکن دردانہ پھوپھو کیوں خاموش رہتیں۔ وہ تو دل ہی دل میں اس وقت خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے انمول کو آنکھ کے اشارے سے اپنی جیت کا عندیہ دیا جسے وہ بھی فوراً ہی سمجھ کر مطمئن ہو گیا تھا۔

"ہائے دیکھو تو کتنا معصوم ہے ہمارا انمول۔ شکل سے ہی اللہ میاں کی گائے لگتا ہے اور ایک وہ لڑکی۔" دلار سے اس کا ہاتھ تھامے اپنے اور بہن کے درمیان خالی جگہ پہ کھینچ کر بٹھاتے وہ بہن کو مزید مرچیں لگا رہی تھیں جو سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ لیکن دردانہ پھوپھو کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا کیونکہ انمول کے پیچھے چاندنی بھی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ انمول کے ساتھ ہی آئی تھی۔

"السلام علیکم پھوپھو!" اس کی آواز پہ بڑی پھوپھو نے یک دم سر اٹھایا۔

"تم کیا کر رہی ہو یہاں؟" غصے سے سوال کرتیں وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"یہ امی نے کڑھی بھیجی ہے آپ کے....." چاندنی نے ہاتھ میں پکڑا باؤل انہیں دکھاتے اپنی آمد کی وجہ بتانی چاہی لیکن جملہ حلق کے اندر ہی گھٹ گیا تھا کیونکہ بڑی پھوپھو کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔

"نہیں چاہیے کڑھی۔ ہمیں کھانی ہو گی تو خود پکا لیں گے۔ لے جاؤ یہ سب اور خبردار جو آئندہ میرے گھر پیر بھی ڈالا تو۔" تلخی سے کہتے انہوں نے اسے وہاں سے جانے کا حکم دیا تھا۔

"امی! کیا ہوگیا ہے آپ کو، یہ کس طرح بات کر رہی ہیں آپ چاندنی سے۔" انمول اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں کے درمیان چلا آیا تھا۔

"اس جیسی لڑکیوں سے جس انداز میں بات کرنی چاہیے بالکل اسی انداز میں کر رہی ہوں۔" انہوں نے انمول کو ہاتھ سے پرے دھکیلا اور چاندنی کی طرف دیکھتے طنزیہ انداز میں بولیں۔

"پھوپھو! کیا کیا ہے میں نے جو آپ.....؟"

اس نے آج تک کبھی بڑی پھوپھو کو خود سے اس انداز میں ہم کلام ہوتے سنا تھا، نہ ہی ان کا ایسا نفرت آمیز رویہ دیکھا تھا بلکہ وہ تو سب سے ہی بہت نرم لہجے میں گفتگو کرتی تھیں۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

"دیکھو لڑکی! میں نے تو یہ سوچا تھا میرا اپنا خون ہے۔ بس اسی اپنائیت میں اپنے نیک سیرت بیٹے سے تمہیں منسوب کرنا چاہ رہی تھی میں لیکن اب اتنا بھی میرا دماغ سٹھیا نہیں گیا جو ایک بدکردار لڑکی کو بہو بنالوں۔" بڑی پھوپھو کی بات پہ حیرت زدہ سے انمول نے گھوم کر پیچھے بیٹھی دردانہ پھوپھو کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

"باجی۔" دردانہ پھوپھو نے تھوک نگلتے بہن کو ٹوکنا چاہا لیکن وہ اس وقت ہوش و حواس میں ہوتیں تو سنتی نا۔

"تم چپ رہو دردانہ! میرا خون کھول رہا ہے اس کے کرتوت سن کر۔ پتا نہیں وہ کون سی بری گھڑی تھی جب میرے بھائی کے گھر ایسی اولاد نے جنم لیا۔" بہن کا منہ بند کرتے وہ مسلسل اپنی بھڑاس نکال رہی تھیں۔ چاندنی کے بدن میں اس وقت کاٹو تو لہو نہیں تھا۔ اس نے بے یقینی سے انمول کو دیکھا جو خود سر پہ ہاتھ رکھے ششدر کھڑا تھا۔

"امی! یہ کیا بولے جا رہی ہیں آپ.....! آپ کو پتا بھی ہے یہ سب چاندنی کے بارے میں کہہ رہی ہیں۔" انمول کی برداشت ختم ہوگئی تھی۔ یہ رشتہ ختم کرنا ان دونوں کی خواہش تھی لیکن کسی کے کردار پہ کیچڑ اچھال کر ایسا کوئی اقدام ہو یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"تو کیا غلط کہہ رہی ہوں۔ پوچھو اس سے۔ مجھے ابھی دردانہ نے بتایا۔ بھابھی تک کو یہ بات معلوم ہے کہ اس کا ساتھ والوں کے لڑکے سے کھلے عام چکر چل رہا ہے۔" بیٹے کو چاندنی کی طرف داری کرتا دیکھ انہوں نے اسے بھی کھڑے کھڑے وہ سب باتیں بتانا شروع کیں جو ابھی کچھ دیر پہلے دردانہ پھوپھو ان کے کان میں انڈیل چکی تھیں۔

"اور تو اور اس کے ساتھ چھت پہ باتیں کرتے کل رات خود اسے دردانہ نے دیکھا ہے۔" چاندنی کا یہ حال تھا کہ زمین پھٹے اور اس وقت وہ اس کے اندر سما جائے۔ اسے ہرگز یقین نہیں آرہا تھا یہ الفاظ اس کے متعلق کہے جا رہے ہیں۔

"خالہ آپ بھی نا....." انمول نے دانت پیستے ایک بار پھر دردانہ پھوپھو کو دیکھا۔

"ہاں..... وہ..... میں..... بیٹا انمول۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ اتنا تو اندازہ ہوگیا تھا کہ کام غلط ہی کر چکی ہیں اور اب بھانڈا پھوٹا ہی پھوٹا کیونکہ بھانجے کے تیور میں بغاوت نظر آرہی تھی۔

"امی ایسی کوئی بات نہیں ہے، خالہ جھوٹ بول رہی ہیں۔" اس نے دوٹوک کہتے ماں کو حیرت میں مبتلا کیا تھا۔

"خالہ آپ سے منگنی ختم کروانے کی بات کی تھی، آپ تو خونی رشتوں میں دراڑ ڈال رہی ہیں وہ بھی چاندنی پہ اتنا گھٹیا الزام لگا کر۔" اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ اسے واقعی یہ امید نہیں تھی کہ معاملہ اتنا سنگین بھی ہوسکتا ہے۔

"لو بھلا اب میں اور کیا کرتی، تم نے جو چاہا وہ ہوگیا۔ باجی نے کر تو دیا رشتہ ختم۔" وہ بھی ایک دم سیدھی ہوگئی تھیں۔

"باجی جب یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو میں....." بڑی پھوپھو حیران



پریشان ان سب کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ کیا چل رہا ہے انمول؟"

"امی! خالہ سے ہم دونوں نے ہی کہا تھا کہ وہ منگنی ختم کروانے میں ہماری مدد کریں لیکن ان سے تو کسی اچھے کی امید ہی فضول ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ساری بات ماں کو بتادی جسے سن کر ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"چاندنی کی کردار کشی پہ اتر آئیں آپ یہ سوچے بغیر کہ اس کی کتنی ذلت ہوجائے گی۔ ایسا کچھ کرنا ہی تھا تو میرا چکر چلوا دیتیں کسی کے ساتھ۔ لوگ چار دن باتیں کرتے پھر بھول جاتے۔ گھر کی لڑکی پہ ایسا الزام لگاتے یہ بھی نہیں سوچا آپ نے سب اسے کتنا رسوا کریں گے۔" چاندنی سر جھکائے خاموش کھڑی تھی جیسے وہاں جو کچھ بھی باتیں ہو رہی ہیں ان سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن انمول کی اس آخری بات پہ اس نے سر اٹھایا تھا۔

"اوہ میرے اللہ! یہ سب کیا کر دیا تم لوگوں نے۔ میں نے تو وہاں بھابھی کو فون بھی کر دیا اور غصے میں پتا نہیں کیا کیا بول بیٹھی ہوں۔" اب سر پکڑ کر بیٹھنے کی باری بڑی پھوپھو کی تھی۔

"چلو جو بھی ہوا منگنی تو ختم ہوگئی نا۔" دردانہ پھوپھو ہاتھ جھاڑتی خوشی سے بولیں۔

"ارے چپ..... میں بھی کتنی احمق ہوں ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کس کے منہ سے نکلی بات پہ اعتبار کر بیٹھی ہوں۔" انہوں نے بے اختیار بہن کو جھڑکا تھا جس کی وجہ سے بات کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔

"اور تم دونوں۔ کیا تکلیف ہے تمہیں اس رشتے سے؟ کیوں نہیں کرنا چاہتے تم دونوں شادی؟" ابھی تو یہ بھی ٹینشن تھی کہ سب کا سامنا کیسے ہوگا کیونکہ بات اب تک تو اوپر سے نیچے تک پھیل چکی ہوگی۔

"کوئی خاص وجہ نہیں، بس دل نہیں کر رہا۔" انمول نے لاپروائی سے کہتے کندھے اچکائے، البتہ چاندنی مسلسل رو رہی تھی۔

"لو بھلا۔ دو گھروں میں جنگ و جدل کروا رہا ہے اور پرخلوص کا دل نہیں کر رہا جبکہ مجھے تو یہی لگا یقیناً یہ دونوں کسی اور جگہ شادی کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔" دردانہ پھوپھو ایک نیا پنڈورا باکس کھولنے لگی تھیں۔

"آپ بھی کمال ہو خالہ! پہلے تو آپ سب کے سامنے ہم دونوں کا چکر ثابت کرنے پہ تلی ہوئی تھیں۔ اب خود سے ہی فیصلہ کر لیا کہ ہمارا انہیں اور شادی کا ارادہ ہے۔" انمول نے دونوں ہاتھ جوڑتے انہیں خاموش کروایا تو وہ منہ بنا کر واپس صوفہ پہ بیٹھ گئیں۔

"چاندنی..... میرا بچہ۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے واقعی بڑی غلطی ہوئی، مجھے تم سے ایسے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔" بڑی پھوپھو نے آگے بڑھ کر چاندنی کو گلے سے لگاتے اس کا ماتھا چوما۔

"کوئی بات نہیں پھوپھو! آپ یہ کڑھی رکھ لیں۔ میں چلتی ہوں۔" اس نے ہاتھ میں اب تک پیالہ پکڑا تھا وہی ڈونگا ان کی طرف بڑھاتے وہ ہچکیاں لیتی واپس جانے کو مڑی۔

"چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔" اس نے بے یقین نظروں سے انمول کو دیکھا تھا۔ وہ ماں کے سامنے اس کے کردار کی گواہی دے رہا تھا۔ اس کی طرف داری کر رہا تھا حالانکہ چاہتا تو خاموش رہ کر اس وقت سارا ملبہ اس کے سر ڈال کر اس رشتے سے باآسانی جان چھڑا سکتا تھا لیکن اس نے سچ بول کر چاندنی کا دامن داغدار ہونے سے بچایا تھا۔

سر اثبات میں ہلاتے وہ انمول کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

گلی میں اس وقت اکا دکا موٹر سائیکل گزر رہے تھے۔ دو تین راہگیر بھی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ایک حساب سے وہاں رش نہیں تھا اور خاموشی بھی ضرورت سے زیادہ تھی۔ وہ بے آواز

روتی سر جھکائے خاموشی سے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ ساتھ چلتا انمول بھی چپ چاپ اور قدرے سنجیدہ تھا۔ جیسے ابھی تک فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کن لفظوں میں گفتگو کا آغاز کرے۔

"خالہ اور امی کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ چاندنی پلیز، تم اب رونا بند کرو۔" بالآخر اس نے کہہ دیا تھا۔

"نہیں میں رو نہیں رہی، بس ایسے ہی دل بھاری بھاری ہو رہا ہے۔ پھوپھو نے آج سے پہلے مجھ سے اتنے سخت الفاظ میں بات جو نہیں کی تو مجھے عجیب لگ رہا ہے۔" وہ دونوں چلتے چلتے وہیں رک گئے۔

"خالہ کا تو دماغ خراب ہے۔ میں نے کہا تھا امی سے دوٹوک بات کرنے کو کہ ہم یہ شادی کرنے پہ راضی نہیں ہیں انہوں نے ایک نئی چنگاری چھوڑ دی۔ ابھی تو پتا نہیں نانی کی طرف کیا ہنگامہ مچا ہوگا۔ امی میرے آنے سے پہلے مامی کو کال کر چکی تھیں۔" اس نے غصے سے لب بھینچے۔

"تم نے میری طرف داری کیوں کی انمول۔ پھوپھو رشتہ تو ختم کر ہی چکی تھیں پھر کیا ضرورت تھی صفائی دینے کی؟" وہ اپنے دل میں اٹھتے سوال کو زبان پہ آنے سے روک نہیں پائی تھی۔

"ہم منگنی ختم کروانا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے تمہاری کردار کشی ہو یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ خالہ نے بہت غلط کیا تمہارا نام لے کر، اس کے لیے میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" چاندنی نے پہلی بار اسے اتنا سنجیدہ دیکھا تھا۔

"انہوں نے جو کیا ہمارے ہی کہنے پہ کیا۔ تم اپنا دل ان کی طرف سے برا مت کرو۔" وہ دونوں اب چلتے چلتے گھر کے پاس پہنچ گئے تھے۔

"اور جو تمہارا دل برا ہوا اس کا کیا؟ اور وہ مامی۔ ان کے دل پہ کیا گزر رہی ہوگی اس وقت ذرا سوچا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا اندر کسی کا سامنا کیسے کروں گا۔" گھر کا دروازہ دیکھتے انمول ندامت سے بولا۔

"انمول۔" وہ اس کی مشکور تھی، شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی لیکن سچ تو یہ ہے محبت اور شکریہ جیسے چھوٹے چھوٹے احساسات کو بیان کرتے سب سے زیادہ انا آڑے آتی ہے۔

"تم اندر جاؤ اور اب رونا مت۔ میں بعد میں آؤں گا امی کے ساتھ۔" انمول نے چاندنی کو دیکھا جس کی آنکھوں میں لکھا پیغام نیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گیا اور پھر نگاہ جھکاتے اسے اندر جانے کا کہا۔

وہ سر ہلاتی اندر چلی گئی تو انمول بھی دل پہ ایک نیا بوجھ لیے الٹے قدموں گھر کی طرف واپس چل پڑا۔

☆☆☆

ہر چہرہ سنجیدہ تھا۔ ہر آنکھ میں خفگی نمایاں تھی تو سب کی زبان پہ ایک ہی شکوہ تھا۔ صحن میں اس وقت گھر کے سب ہی لوگ موجود تھے اور بڑی پھوپھو مجرم بنی ان سب کو وضاحتیں دے رہی تھیں۔ ان سب کا ایک ہی سوال تھا کہ بنا تصدیق آخر اتنی بڑی بات منہ سے نکالی ہی کیوں۔ اب وہ کیا بتاتیں کہ جب شیطان غصے کی صورت انسان کے حواسوں پہ سوار ہو جائے تو پھر ایسی ہی کوتاہی سرزد ہوتی ہے جو ان سے ہوگئی۔ دردانہ پھوپھو کی باتوں میں آج سے پہلے کتنا سچ، کتنا جھوٹ نکلا ہے یہ وہ خود بھی جانتی تھیں پھر کیوں اتنے اہم اور حساس موضوع پہ اتنی جلدی نتیجہ نکالا گیا۔

"مجھ سے غلطی ہوگئی بھابھی! میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔" انہوں نے بھاوج کی طرف دیکھتے دونوں ہاتھ جوڑے۔

"ہاتھ جوڑو یا پاؤں۔ میں یہ بات کبھی نہیں بھولوں گی۔ میری معصوم بچی پہ تم لوگوں نے اتنی بڑی تہمت لگائی کیسے۔" وہ ہاتھ اٹھائی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئیں اور اپنے تئیں بات دوٹوک ختم کر دی۔

"میں نے کہا نا مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اس دردانہ کی باتوں میں آگئی تھی میں، ورنہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ گھر کی بچی کے متعلق اتنی بڑی بات کہوں۔" بڑی پھوپھو کی طرف دیکھنے کے بجائے انہوں نے منہ موڑتے وہاں بیٹھے میاں کو دیکھا جو اب تک خاموش تھے۔

"امی آپ ہی سمجھائیں نا انہیں۔ آپ تو جانتی ہیں میں نے کتنے ارمان سے یہ رشتہ مانگا تھا۔ میری تو برسوں کی خواہش تھی چاندنی کو بہو بنانے کی۔" انہیں ہنوز خفا دیکھ کر بڑی پھوپھو ماں کی طرف مڑیں اور ان کا ہاتھ تھامے وضاحت کی۔

"کوئی بھی بات زبان سے نکالنے سے سو بار سوچنا چاہیے وہ بھی جب معاملہ اتنا حساس ہو۔" انہوں نے بھی بیٹی کو ہی غلط گردانا تھا۔

"باجی آپ بھی کس کی بات پہ یقین کر کے بھابھی سے جھگڑیں۔ یہ دردانہ کبھی منہ سے کچھ اچھا نکال جائے ایسا ہو سکتا ہے کیا؟"

غضنفر چچا کو تو اس سارے معاملے میں بس ایک دردانہ پھوپھو پہ ہی غصہ تھا۔ باقی انمول اور چاندنی کی کلاس وہ پہلے ہی الگ لے چکے تھے اور وہ دونوں اب ان کے ہی دائیں بائیں سر جھکائے بیٹھے ساری کارروائی ہوتے دیکھ رہے تھے۔

"ہائے میں نے کیا کیا۔ یہ دونوں ہی میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ یاد نہیں اس دن کیسے ایک دوسرے کے بال نوچ رہے تھے۔" دردانہ پھوپھو نے بھانجے اور بھتیجی کی طرف اشارہ کرتے اپنا دفاع کیا۔

"تو انہیں سمجھایا جا سکتا تھا۔ وہ تو بچے ہیں ان کو کیا پتا اسی میں ان کی بہتری ہے۔" بڑی پھوپھو جل کر بولیں۔ زندگی میں پہلی بار ان کی اتنی بری طرح مٹی پلید ہوئی تھی انہیں تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اتنے بہت سے لوگوں کو منائیں کیسے۔

"اب انہیں بہتری نہ نظر آئے تو کیا زبردستی کریں گے۔ شادی بیاہ کا معاملہ ہے کوئی کھانسی کی دوا تو ہے نہیں جو زبردستی منہ میں انڈیل دیں گے۔"

پھوپھو نے اپنے حساب سے لاجک تو ٹھیک ہی دی تھی۔

"اتنا بک بک کرتی ہے۔ مجھے سچ نہیں بتا سکتی تھی۔ میں خود بات کرتی دونوں کو آمنے سامنے بٹھا کر۔" بڑی پھوپھو کا پارہ مزید ہائی ہوا تھا۔

"تو بیٹھے ہیں نا آمنے سامنے...... اب کر لو بات جو کرنی ہے۔ کیوں گھنو میسنو بتاؤ کس نے کہا تھا منگنی ختم کرانے کو۔"

"کیا تکلیف ہے تمہیں انمول، کیوں نہیں کرنا چاہتے تم یہ شادی بتاؤ؟" انہوں نے درشتی سے بیٹے کی طرف دیکھتے سوال کیا۔

"امی...... وہ...... میں...... بس ایسے ہی۔" جواب دے بھی تو کیا۔ سچ تو یہی ہے کہ کوئی ٹھوس وجہ تھی ہی نہیں۔

"یہ سب چھوڑو۔ اب ان باتوں کی گنجائش ہے نہ ضرورت۔ ہماری طرف سے بس یہ رشتہ ختم سمجھو۔ آج بنا تصدیق اتنا بڑا الزام لگ گیا، کل کو کوئی نیا انکشاف ہوا تو بات جانے کہاں پہنچ جائے اس لیے بہتر ہے کہ سب یہیں ختم ہو جائے۔ ابھی موقع ہے کل کو پچھتانے سے تو اچھا ہے۔" بہت دیر سے خاموش ابا نے بالآخر زبان کھولی تھی۔

"بھائی جان آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔" بڑی پھوپھو نے بھائی کا ہاتھ تھامے التجا کی۔

"میرا تو خیال ہے جب بچے رضامند نہیں پھر کیا فائدہ زور زبردستی کرنے کا۔ تجھ بھی ہے دردانہ نے بری بات کی لیکن یہ بھی سوچو کیوں کی؟" دادی بھی بیٹے کی ہم خیال تھیں۔

"ان دونوں کی خاطر ہی کہی ورنہ میرے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے کہ میرے بھائی بہن کے بچوں کی شادی ہو جائے۔" ماں کی تھوڑی سی طرف داری پا کر دردانہ پھوپھو تو پھیل گئی تھیں۔

"تجھے تو میں اکیلے میں پوچھوں گا فسادی عورت۔ یہ بچے تھے تو تو بڑی ہے۔ تسلی سے بیٹھ کر سب کو بتا نہیں سکتی تھی۔" غضنفر چچا دانت پیستے

بولے۔

"ارے اس کی تو چھوڑو۔ یہ تو سب سے بڑھ کر بچی ہے۔" دادی ہاتھ جھٹکتے بولیں۔ سچویشن ہی ایسی سنگین تھی کہ دردانہ پھوپھو سوائے پہلو بدلنے کے مزید کچھ کر نہیں پائیں البتہ بھائی کو گھورتی رہیں۔

"غلطی ہماری ہی ہے، ہمیں انمول اور چاندنی سے پہلے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا بات گھر کی ہے گھر کے اندر ہی ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ چاندنی تم انگوٹھی واپس کردو۔" ابا کی آواز پہ چاندنی نے چونک کر سر اٹھایا اور حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ پیچھے کھڑی ماں نے بھی آنکھ کے اشارے سے انگوٹھی اتارنے کو کہا تھا۔ پھر اس نے باری باری وہاں بیٹھے ہر شخص کی طرف دیکھا۔ وہ سب لوگ بھی اسی کو دیکھ رہے تھے۔ بے اختیار چاندنی کی نگاہ غضنفر چچا کے برابر بیٹھے انمول پہ جا کر ٹھہر گئی۔ وہ حد درجہ سنجیدہ لب بھینچے بیٹھا اس وقت اسی کو دیکھ رہا تھا۔ چاندنی نے نظریں جھکا کر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور شاید اتنے دنوں میں پہلی بار انگلی میں پہنی اس انگوٹھی کو دیکھا تھا۔ روبی اور زرقون کے نگینوں سے سجی وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ کو کس طرح سجائے ہوئے تھی یہ آج پہلی بار اندازہ ہوا تھا۔

سر جھکائے نچلا لب کاٹتے چاندنی نے انگوٹھی اتار کر ساتھ بیٹھے غضنفر چچا کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے مایوسی سے انگوٹھی پکڑ کر بڑی باجی کو دے دی۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی بھائی جان۔ میں بھی گھر جا کر منگنی کا سب سامان واپس بھجوا دوں گی۔" بھائی کے ہاتھ سے انگوٹھی پکڑ کر ایک گہرا سانس لیتے بڑی پھوپھو دھیمے لہجے میں کہتی دروازے کی طرف چل پڑیں۔ پیچھے کسی نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سب کی خوشی اور دعاؤں سے کیے اس تعلق کا ٹوٹنا آج ان سب کو بے انتہا دکھی کر گیا تھا۔

☆☆☆

تھوڑی ہی دیر میں محفل برخاست ہو گئی تھی۔

بڑی پھوپھو رنجیدہ سی اپنے گھر کو لوٹ گئیں۔ باقی سب بھی کونے کھدرے سنبھالے خاموش اور سنجیدہ تھے۔ صبح سے چولہے پہ چڑھی اتنے اہتمام سے پکی کڑھی کی دیگچی کو کسی نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اب اتنا سنجیدہ ماحول اور دل میں رنج ہو تو کھانے کا نوالہ کہاں اترتا ہے حلق سے۔

دردانہ پھوپھو اب تک سب کو اپنی صفائیاں دیتی عاجز آ کر بڑے کمرے کی طرف چلی گئیں کیونکہ اس وقت کوئی بھی ان کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ اندر پہنچیں تو چاندنی گھٹنوں میں سر دیے اکیلی بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ بھتیجی کو اکیلے روتا دیکھ کر وہ ایک تشویش سے ایک ہی جست میں پورا کمرہ پار کرتی اس تک پہنچی تھیں۔

"میں انمول سے شادی کے لیے تیار ہوں پھوپھو۔" ان کے استفسار پہ چاندنی نے سر اٹھا کر جو جواب دیا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ وہ تو یہ سمجھیں اسے شاید اماں سے کچھ سننے کو ملا ہوگا جو یوں رونا دھونا کر رہی ہے لیکن وہ تو عجیب داستان کہہ رہی تھی۔

"ہیں..... کیا کہا ذرا پھر سے کہنا تو؟" انہیں لگا شاید انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"میں چاندنی سے شادی کرنا چاہتا ہوں ماموں۔" چھت پہ غضنفر چچا کے ساتھ کھڑے انمول نے ہاتھ میں پکڑا لنگر ہوا میں اچھالتے ان کی طرف دیکھا۔

چچا نے بے اختیار اپنا ہاتھ سر پہ مارا جو بال نہ ہونے کے سبب پھسل کر دور نکل گیا تھا۔

"دماغ ٹھکانے پہ ہے یا کھسک گیا۔ وہ جو گھسان کا رن تم دونوں کی بدولت پڑا ہے وہ بھول گئی ہے کیا؟" پھوپھو نے ایک زوردار دھپ چاندنی کی کمر پہ رسید کی کہ اس کی دبی دبی چیخ نکل گئی تھی۔

"اس سب کے بعد ہی تو احساس ہوا ہے کہ اپنی غلطی کا۔" رونا دھونا بھلا کر وہ اپنی کمر سہلانے لگی تھی۔



"یار عجیب باؤلے ہو تم۔ یہ احساس دردانہ کے پاس جانے سے پہلے کیوں نہیں ہوا بھئی۔ اب تو منگنی ختم ہو گئی۔" غضنفر چچا نے ہاتھ اٹھا کر دوٹوک کہتے بات ختم کی تھی۔ ان دونوں کے چکر میں پہلے ہی گھر کا ماحول کشیدہ تھا اور اب ایک نئی صورت حال۔ مطلب کہانی میں ٹوئسٹ۔

"منگنی ہے کون سا نکاح ٹوٹا ہے جو دوبارہ نہیں ہو سکتا پھوپھو۔" اس نے دہائی دی تھی جس پہ پھوپھو کا دماغ گھومنا فطری تھا۔

"باجی بھی بھرے دل سے نکلی ہیں اور اپنی اماں کی تو سن ہی لی تم نے کتنا واویلا مچایا ہوا تھا انہوں نے۔" وہ تو اس وقت کو کوس رہی تھیں جب انہوں نے ان دونوں کی باتوں میں آ کر اپنی خدمات پیش کیں۔

"پھوپھو! آپ سمجھائیں نا امی کو، مجھے یقین ہے وہ مان جائیں گی۔" اس وقت اگر سب کو مشترکہ کسی پہ غصہ تھا تو وہ دردانہ پھوپھو ہی تھیں اور ان حالات میں ان کی کون سننے والا تھا۔

"ارے یار! باجی اور بھابھی سے تو میں بات کرلوں گا لیکن اصل مسئلہ تو بھائی جان کا ہے۔ یہ فیصلہ انہوں نے لیا ہے، اب انہیں کیسے راضی کیا جائے۔"

انمول کی التجا پہ غضنفر چچا نے عقل کے گھوڑے دوڑاتے تمام محرکات پہ غور کیا لیکن مسئلہ بگڑ چکا تھا اسے سنبھالنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا وہ سوچ رہا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے سیڑھیاں اترنے لگے ساتھ ساتھ اس سے متعلق گفتگو بھی کر رہے تھے۔

"یار ماموں! آپ نانی سے بات کریں پلیز، وہ بڑے ماموں کو منا سکتی ہیں۔" غضنفر چچا کو امید تو کوئی نہیں تھی پھر بھی انمول کے مشورے پہ دادی سے بات کرنے کا راستہ تو تھا۔

"نہ بہن مجھے تو اب اس سیاست سے دور ہی رکھو تم۔ میں پہلے ہی بات کر کے بہت بری بن چکی ہوں اب تو ناک گھس جائے گی کوئی میری نہیں سننے کا۔"

چاندنی کو سرخ جھنڈی دکھاتے وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئیں اور کمرے سے باہر نکلنے لگیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ جانتی تھی یہ کام مشکل ہے لیکن پھوپھو کروا سکتی ہیں لیکن سچ وہی تھا جو اس وقت دردانہ پھوپھو بیان کر رہی تھیں۔ ان حالات میں ان کے لیے سب طرف سے ہی نو لفٹ تھی۔

"پھوپھو ایک بار صرف میری خوشی کی خاطر میری مدد کر دیں۔" ان کا ہاتھ تھامے وہ جس طرح ان کی منت کر رہی تھی دردانہ پھوپھو کا دل پسیجا تو تھا لیکن وہ اب بھی اس مسئلے میں پڑنے کو تیار نہیں تھیں۔

"اور اگر چاندنی نہ مانی تو؟" وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر صحن میں پہنچے جب انہیں کھسر پھسر کرتا دیکھ تجسس میں ڈوبی چچی بھی ان کے پاس چلی آئیں۔ غضنفر چچا کی زبانی یہ نیا قصہ سن کر پہلے تو منہ حیرت سے کھلا اور جلدی سے سوال کیا تھا کیونکہ یہ خدشہ بہرحال اپنی جگہ تھا۔

"وہ انکار نہیں کرے گی، مجھے پورا یقین ہے۔" اس کا لہجہ پر اعتماد تھا۔ چچی نے سوالیہ نظروں سے غضنفر چچا کو دیکھا جواب بھی قائل ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔

"اب یہ اچانک یقین کیسے ہو گیا انمول پہ، پہلے تو اس سے جان چھڑانے کو مری جا رہی تھی۔" پھوپھو کو ہر سوال کا جواب حیرت میں ڈبو رہا تھا۔ کہاں اس کا نام سننے کو تیار نہ تھی اور اب اچانک یہ یقین کہ وہ بھی اس سے شادی پہ راضی ہوگا عجیب نہیں تو اور کیا تھا۔

"بس پتا نہیں لیکن ایک دم ہی احساس ہوا ہے کہ....." وہ کہتے کہتے نظریں جھکائے خاموش ہو گئی۔

"کہ.....؟" انہوں نے ابرو اٹھائے سوال کیا۔

"سمجھا کریں نا پھوپھو۔" وہ جھینپ کر شرما

دی۔
"ارے سمجھائے گی تو سمجھوں گی نا میں۔" دردانہ پھوپھو نے حسب عادت ایک دھپ رسید کی تھی۔

"میں سمجھا نہیں سکتا ماموں! بس وہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔" اس کے چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ کو انجوائے کرتے چچی نے غضنفر چچا کو کہنی ماری تھی۔

"اور پھر جب کچھ دن بعد بری لگنے لگی تو ایک بار پھر منگنی ٹوٹ جائے گی۔" غضنفر چچا کو بہر حال تشویش تھی۔ ایسے تعلقات ان کی حماقتوں کی بھینٹ ہرگز نہیں چڑھائے جاسکتے تھے۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اگر... تو آپ میرا سر توڑ دینا۔" پھوپھو کے استفسار پہ چاندنی نے ہاتھ جوڑے التجا کی۔

"تجھ سے پہلے تو بیٹا میرا سر توڑ دیں گے سب۔"

پھوپھو اس وقت ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند نظر آرہی تھیں اور سامنے کھڑی چاندنی کی باتیں انہیں اب بھی مذاق ہی محسوس ہو رہی تھیں۔

"پھوپھو پلیز میں اس کے بغیر مرجاؤں گی۔" ضدی لہجے میں کہتے وہ ان کے پیچھے لپکی جو اس سے جان چھڑائے کمرے سے باہر جارہی تھیں۔

"ہیں...... یہ اچانک بات اتنی آگے تک کیسے پہنچ گئی بھئی، ابھی دو گھنٹے پہلے تو تم لوگ نارمل تھے۔ یار فوجی کہیں کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں لگ گئی سر پہ۔" انہوں نے واقعی انمول کے سر کو ٹٹولتے اس کا معائنہ کیا تھا۔

"آپ بھی نا...... جب وہ کہہ رہا ہے وہ چاندنی کو پسند کرتا ہے، اس سے ہی شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔ کیوں اس بے چارے کو شرمندہ کر رہے ہیں۔" چچی کو اس سے ہمدردی ہو رہی تھی۔

"میں شرمندہ کر رہا ہوں؟ شرمندہ تو ان برخوردار نے کروایا ہے ہمیں ایک دوسرے کے سامنے۔ پورا خاندان ان دونوں کی وجہ سے ڈسٹرب ہے۔ رشتے مضبوط ہونے کے بجائے کمزور پڑ گئے ہیں اور یہ جناب کہہ رہے ہیں کہ منگنی دوبارہ کروا دو۔" غضنفر چچا کی بات میں منطق تھی شاید اسی لیے چچی کا منہ اتر گیا تھا۔

"تو آپ میری مدد نہیں کریں گے پھر؟" انمول نے جذباتی لہجے میں دوٹوک پوچھا۔

"سوری!" چچا نے ہاتھ اٹھائے اور بڑے کمرے کی طرف چل پڑے۔ چچی بھی انمول کا بازو تھامے ان کے پیچھے چل پڑیں۔ ان کا خیال تھا اندر بیٹھ کر تحمل سے وہ چچا کو سمجھائیں گی۔

"ٹھیک ہے پھوپھو! اگر آپ مدد نہیں کرنا چاہتی ہیں تو مت کریں۔ میں خود کچھ کرلوں گی لیکن شادی ہر حال میں انمول سے ہی کروں گی۔" دروازے سے باہر نکلتی پھوپھو کے پیچھے بلند و بانگ انداز میں نعرے لگاتی چاندنی کو دیکھ کر وہ تینوں باہر ہی رک گئے۔ چاندنی کا رنگ ہلدی ہوگیا تھا۔ اب اسے کہاں اندازہ تھا جوشِ خطابت میں جو بول رہی ہے وہ پھوپھو کے علاوہ کوئی اور بھی سن سکتا ہے۔ غضنفر چچا نے سنجیدہ نگاہوں سے پہلے چاندنی اور پھر پیچھے کھڑے انمول کو دیکھا جو خود بھی مسکراتا ہوا چاندنی کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"اس کا مطلب دونوں طرف ہے آگ لگی ہوئی۔" پیچھے کھڑی چچی نے شوخ انداز میں کہتے میاں کو مخاطب کیا۔ غضنفر چچا ہنوز سنجیدہ تھے۔ قہر آلود نظروں سے بیوی کو دیکھتے ٹوکا۔

"اچھا تم فائر بریگیڈ کی طرح خوش نہ ہو، چلو اپنا کام کرو۔" چچی کا موڈ آف ہوگیا تھا۔

"لو بھلا میں نے کیا کیا۔ جو کر رہے یہ دونوں ہی کر رہے ہیں۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ کچن کی طرف چل پڑیں۔ آنکھ کے اشارے سے غضنفر چچا نے باہر نکلتی دردانہ پھوپھو کو واپس بڑے کمرے میں چلنے کا کہا۔ وہ سر ہلاتی بھائی کے ساتھ اندر چلی گئیں۔ انمول بھی چاندنی کے ہمراہ ان کے پیچھے ہی کمرے



میں چلا آیا۔

"بھئی غضنفر! میرے تو ہاتھ کھڑے ہیں۔ میں تو اپنے گھر جارہی ہوں۔ یہاں پھر کوئی نیا شوشا میرے نام لگتا محسوس ہو رہا ہے۔" صوفہ پہ بیٹھتے دردانہ پھوپھو نے صاف گوئی سے کہا تھا۔ وہ کسی صورت اپنا ہاتھ اس معاملے میں پکڑانے کو تیار نہیں تھیں۔ چچا البتہ بھتیجی اور بھانجے کے مشترکہ بیان کو سننے کے بعد اب مطمئن نظر آرہے تھے۔

"شوشے تو تو نے ایک سو ایک چھوڑے ہیں، کبھی کوئی نیکی کا کام بھی کرلے آخر کو بخشش کے لیے بھی تو کچھ سامان چاہیے۔" اب دونوں آمنے سامنے ہوں اور پھلجڑیاں پٹاخے نہ چھوٹیں یہ بھلا کیسے ہوسکتا تھا۔

"ارے تو اپنی بخشش کی فکر کر منحوس انسان۔ جب دیکھو میرے گلے پڑا رہتا ہے۔" پھوپھو ہاتھ ہلا کر کوستی صوفہ سے اٹھیں تاکہ چچا کی حدود سے دور جاسکیں۔

"آپ دونوں کو بس اپنی لڑائیوں کی پڑی ہے ہمارا تو کسی کو خیال ہی نہیں ہے۔" انمول نے دونوں کو لڑتے دیکھ کر ماتھ پیٹ لیا۔

"ارے میرا بچہ کیوں پریشان ہوتا ہے۔ خالہ صدقے میں ہوں نا...... میں کرتی ہوں بات میرا بچہ۔" بھانجے کو پریشان دیکھ کر پھوپھو ہمیشہ کی طرح جذباتی ہوگئیں اور اس کا ہاتھ تھامے تسلی دلاسے دینے لگیں۔

"ہائے غضنفر۔ میرا بھائی ایسا کر تو بھائی جان سے بات کر میں امی کو مناتی ہوں۔ ہیں؟ ان دونوں کی شادی کروا دیتے ہیں۔" لو بھئی ایک منٹ میں منحوس سے بھائی تک سفر بس دردانہ پھوپھو ہی کرسکتی تھیں۔

"اچھا۔ چلو دیکھتا ہوں لیکن ان دونوں کو پہلے حلف نامے پہ دستخط کرنا ہوگا کہ یہ کچھ دن بعد دوبارہ رشتہ توڑنے کی بات نہیں کریں گے۔"

غضنفر چچا نے تنبیہی انداز میں کہا۔ وہ اب مزید کوئی چانس نہیں لینا چاہتے تھے۔

"حلف نامہ چھوڑ نکاح نامے پہ دستخط کروالو ماموں۔ اب جو کہہ دیا تو کہہ دیا پیچھے ہٹنا ہم فوجیوں کی شان نہیں۔" شوخی سے کہتے انمول نے چاندنی کو دیکھا جو اس کی بات پہ شرماتی چچا کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

☆☆☆

پارلیمنٹ کا اجلاس ایک بار پھر بلایا گیا۔ غضنفر چچا نے ابا کو ساری بات بتادی تھی تو دوسری طرف دردانہ پھوپھو ماں کا گھٹنا پکڑے انہیں سمجھا رہی تھیں تو کبھی بہن کو قائل کرنے میں مصروف تھیں۔

"یار یہ ہو کیا رہا ہے؟" ابا نے حیرت سے سوال کیا۔ فقط چند گھنٹے پہلے اسی بات کو لے کر گھر میں واویلا مچا ہوا تھا اور اب ایک بار پھر نیا شور اٹھنے لگا۔

"وہ تو مجھے بھی نہیں پتا لیکن بس دونوں بچوں کی خواہش ہے سو آپ کو بتا دی۔" غضنفر چچا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ دونوں تو اس رشتے پہ راضی ہی نہیں تھے۔ دردانہ نے تو یہی کہا تھا۔" باجی منہ پہ ہاتھ رکھے تشویش سے بولیں۔

"ہائے سب میری ہی زبان پکڑتے ہیں کوئی اپنی اولاد سے بھی تو پوچھو وہ منحوس مارے کیا چاہتے ہیں۔" اپنا نام سن کر انہیں پھر مرچیں لگ گئی تھیں۔

"تو یہاں بات بنانے بیٹھی تھی یا بگاڑنے؟ اب اگر درمیان میں بولی تو گلا دبا دوں گا تیرا۔" غضنفر چچا نے دونوں ہاتھ اٹھائے ڈرایا جیسے سچ میں گلا ہی دبا دیں گے۔

"باجی۔ بھائی جان۔ میرا خیال ہے بات ابھی گھر کی چار دیواری تک ہی ہے۔ پھر ہم بھی تو سب یہی چاہتے ہیں کہ یہ رشتہ قائم رہے۔" چچا نے ایک بار مصالحت کی کوشش کرتے بھائی اور بہن کی طرف دیکھا۔

"وہ دونوں ہی کہہ رہے ہیں کہ انہیں شادی

کرنی ہے۔'' پھوپھو نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہاں تو ہم نے کب انکار کیا ہے۔ ڈھونڈتے ہیں کوئی رشتہ دونوں کے لیے۔'' دادی نے تسلی دیتے بیٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

''اوہو، امی! وہ ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' چچا کا دل چاہا بس اب اپنا سر پیٹ لیں۔

''لیکن کیوں؟'' دادی نے معصومیت سے سوال کیا۔

''اب یہ تو آپ اپنے نواسے اور پوتی سے اکیلے میں پوچھنا ہمیں تو ان دونوں نے ہی بھیجا ہے آپ کے پاس۔'' غضنفر چچا نے چڑ کر جواب دیا۔

''ہائے میں تو کہتی ہوں چھوڑو سب باتیں بس مٹھائی منگوالو چائے کے ساتھ۔ خوشی کا موقع ہے صبح سے سر میں درد ہوگیا اس سارے ڈرامے کے چکر میں۔'' ہونٹوں پہ زبان پھیرتے پھوپھو نے چچی کو اشارہ کیا۔

''لو اسے اپنے ٹھونسنے کی پڑگئی ہے۔ کس بات کی مٹھائی بانٹیں ہم نے حلوائی کی دکان کھولی ہوئی ہے کیا؟'' غضنفر چچا کی شوخی پہ ابا نے گھورا۔

''سوری بھائی جان۔'' وہ ایک دم ہی معذرت کرتے سنجیدہ ہوگئے۔

''پھر کیا خیال ہے آپ سب کا؟'' ابا نے ایک ساتھ ماں، بیوی اور بہن کو مخاطب کیا تھا۔ غضنفر چچا اندر سے انمول اور چاندنی کو بلا لائے تھے۔ سنجیدگی سے سر جھکائے وہ دونوں بھی سب کے بیچ خاموش بیٹھے تھے۔

''سب اگر راضی ہیں تو اعتراض کس بات کا..... ہاں لیکن آگے کا سوچ لو بس۔ کل کو دوبارہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔'' دادی نے ہی جواب دیا تھا۔ بظاہر تو اب کسی کو بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن ہاں ایک تشویش مستقل تھی۔

''تو ٹھیک ہے ایسا کرتے ہیں انہیں تین ماہ کا پروبیشن ٹائم (آزمائشی وقت) دیتے ہیں۔ اگر اس دوران ان دونوں نے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا تو پھر اسے مستقل کرتے ان کی شادی کروادیں گے۔'' ابا نے مدبرانہ انداز میں مسئلے کا حل بیان کرتے ان کی شادی کو ملازمت میں بدل دیا تھا۔

''بڑے ماموں میرا تو آپ سب جانتے ہیں کتنی صلح جو طبیعت کا انسان ہوں میں۔ جھگڑا تو بس جنگلی بلی ہی کرتی ہے ہمیشہ۔'' یہ تسلی تو بہرحال ہوگئی تھی کہ سب راضی ہو چکے ہیں اور خاموش بیٹھے اس کی زبان کو زنگ لگ رہا تھا لہٰذا ہنستے ہوئے بولا۔

''میں لڑتی ہوں یا تم اور خبردار جو ایک بار بھی اگر تم نے مجھے جنگلی بلی کہا تو میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔'' چاندنی نے بے اختیار اپنے لمبے ناخنوں کو دکھاتے انمول کو ڈرایا۔

''ابے یار پھر شروع ہوگئے۔'' غضنفر چچا سمیت سب نے ہی سر پکڑ لیا تھا۔

''ارے میں نے تو پہلے ہی کہا تھا ان دونوں کی شادی مت کروانا۔ جس انمول گھڑی ان کا بیاہ ہوگا چھریاں چاقو چل جائیں گے یہاں۔ ارے بھیا ایسی فسادی شادی سے تو اللہ بچائے۔'' شور مچاتے پھوپھو اپنی چادر سنبھالے مین گیٹ کی طرف دوڑیں۔

ان کا یہاں مزید ٹھہرنے کا ارادہ ہرگز نہیں تھا اور جلد واپسی کا تو بالکل کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پیچھے سب آوازیں دیتے رہ گئے لیکن پھوپھو بھاگم بھاگ دروازہ عبور کرتے منظر سے غائب ہوگئیں اور یہ پہلی بار تھا ان کی بات پہ وہاں بیٹھے سب لوگ خفا ہونے کے بجائے قہقہے لگانے لگے تھے۔

☆☆

"راہی سر آ گئے۔" اقبال کی نظریں گلاس وال کے باہر رکیں تو سب متحرک ہو گئے۔ برفیلی سی سرد گہری شام کے دھندلکوں میں ثمی سب سے پہلے اتری۔ کافی ہاؤس کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اس نے پلٹ کر ماں کو دیکھا جو راہی کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے نکلنے میں مدد کر رہی تھی۔

ثمی پاؤں پٹختے اندر داخل ہوئی تو جیسے کہکشاں کی بارش ہونے لگی۔ اس پرہال میں نیم تاریکی تھی، صرف ثمی روشنی کے ہالے میں تھی اور اس حسین چہرے اور منظر کو فرجاد نے کیمرے میں قید کر لیا۔

☆☆☆

"عابد۔ میں نے تو ساری بات آپ کے گوش گزار کر دی ہے اور اس سلسلے میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" اسماء نے ثمینہ، منیبہ اور اپنے درمیان طے پائے گئے معاملات عابد کے گوش گزار کر دیے تو انہوں نے چائے کا مگ رکھتے ہوئے گہرا سانس لے کر اسماء کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے، مگر ساجد بہت ہنگامہ کرے گا۔"

"معذرت چاہتی ہوں عابد صاحب! گستاخی معاف۔ مگر اب وقت اور ماحول بدل رہا ہے۔ ہماری حد تو ٹھیک تھا مگر..... مگر اب ہم سب کو وقت اور ماحول کے مطابق چلنا ہے۔ ساجد نے ہر عمر میں اپنی من مانی کی، ثمینہ کو پاؤں کی جوتی بنا کر گھسیٹ گھسیٹ کر چلتا رہا۔ پھر منیبہ کے ساتھ بھی ویسا ہی رویہ، کیوں آخر؟ ساجد میاں چاہتے کیا ہیں؟ خیر سے چھ بچوں کے والد ہیں، ہوش کے ناخن لینے کے بجائے ابھی تک کھلنڈرا رویہ اپنایا ہوا ہے۔ ارے، اسے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کو دونوں بیویوں کی محبت اور تائید حاصل ہے۔ اب بھی اگر ساجد نے ہماری بات نہ مانی تو..... سارہ، زارا اور عمارہ تو لڑکیاں ہیں، سہہ جائیں گی مگر منیبہ تین بیٹوں کی ماں ہے۔ اس کو اور اس کے بیٹوں کو حقوق چاہئیں، باپ کا نام اور معاشرے میں پہچان چاہیے۔ ارمغان، زین، داؤد ماشاء اللہ جوان ہیں، اس گھر کے بیٹے ہیں وہ، اس گھر کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو آپ کو یا ساجد کو کیوں اعتراض ہے؟" اسماء بڑے اعتماد سے بولے جا رہی تھیں، یہ اعتماد شاید عابد کے رویے میں بڑھتی ہوئی نرمی سے تھی۔

"مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا، البتہ ساجد کی میں ضمانت نہیں دے سکتا۔"

"واہ، یہ بھی خوب ہے یعنی کہ جن کے سارے معاملات ہیں، جس کے یہ سب بگاڑ ہیں، سب انہی سے ڈر رہے ہیں۔ بس اب جو بھی ہو، سب بچوں کی بہتری کے لیے ہم تینوں عورتوں نے جو سوچا ہے اس کا آغاز منیبہ اور لڑکوں کے ڈنر سے کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اس معاملے میں، میں آپ خواتین سے متفق ہوں۔" عابد نے بڑے بھرم جھاڑتے ہوئے اپنی تائید کا اظہار کیا تھا تو اسماء خشمگیں نظروں سے میاں کو دیکھتی کھڑی ہو گئیں۔

"جی شکریہ۔ بڑا احسان ہے آپ کا۔ آپ مردوں کی حکومت نے گھر کو تباہ کر دیا ہے۔ اب ہم معاملات سنبھالتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مدد سے پھر دیکھیے گا سب کس طرح ایک چھت کے نیچے ہنسی خوشی رہتے ہیں۔" اسماء نے دل میں سوچا پر زبان سے کچھ نہ بولیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں آپ؟" عابد نے اسماء کو دیکھا۔

"ہوں۔ ہاں جی، کچھ نہیں۔ ہم لوگ ہفتے کو منیبہ اور بچوں کو ڈنر پر بلا رہے ہیں۔ منیبہ، ثمینہ کی دوست کی حیثیت سے آئے گی۔ ساجد کو سنبھالنا اب آپ کی ذمہ داری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" عابد نے دھیمے لہجے میں کہا اور کمبل سینے تک تان لیا۔

☆☆☆



"چلیں زارا۔ میں تو تیار ہوں، یونیورسٹی جانے کے لیے۔" ثانیہ یونیورسٹی جانے کے لیے خوب تیار ہو کر آئی۔

"تیار تو میں بھی ہوں مگر تمہارے بھائی صاحب تشریف لے آئیں تو بات ہے۔ ویسے تم بہت اچھی لگ رہی ہو ثانیہ! بس ذرا لپ اسٹک کم کر دو۔" زارا نے اسے ٹشو دیا تو ثانیہ نے منہ تو بنایا مگر لپ اسٹک صاف کر دی اور بولی۔

"کیا ہے بھئی۔ پہلی بار یونیورسٹی جا رہی ہوں، تم نے میری تیاری صاف کروا دی۔"

"اس لیے کہ کسی بھی درس گاہ میں یوں میک اپ کر کے اور اوٹ پٹانگ ڈریسنگ کر کے جانا کم از کم مجھے تو پسند نہیں۔ بلاوجہ ہی ہر کسی کی توجہ کا مرکز بن جاؤ۔ ہر لڑکی پر اٹھنے والی مرد کی ہر نظر کا اپنا ہی مطلب اور سوچ ہوتی ہے۔ کم از کم مجھے تو یہ سب پسند نہیں۔" زارا نے اپنے کرلی بالوں کو ایک بار پھر کیچر میں قید کیا۔

"اف زارا۔ تم بھی ناں۔ خیر میں تمہاری بات سے سو فیصد متفق ہوں۔ پہلی بار یونیورسٹی جا رہی ہوں ناں تو سوچا....."

"السلام علیکم! صبح بخیر لیڈیز۔" فہد جلدی سے سیڑھیاں اترتا آیا، نظریں زارا پر تھیں جو اسے دیکھ کر موبائل کو دیکھنے لگی تھی۔

"بھائی۔ آپ بھی ناں، عید کا چاند ہی ہو گئے آج تو۔ چلیں دیر ہو رہی ہے۔"

"دیر ہو رہی ہے..... مگر یہ تم اتنی تیار شیار، صبح ہی صبح کہاں جا رہی ہوں لڑکی۔" فہد نے ثانیہ کو سر سے پاؤں تک خوب تیار دیکھ کر کہا۔

"یونیورسٹی جا رہی ہوں بھائی۔"

"یونیورسٹی جا رہی ہو..... مگر کیوں؟ وہاں نیاز بٹ رہی ہے یا کسی کوے کی شادی ہے۔ جس میں شرکت کے لیے جا رہی ہو۔"

اس طنز پر زارا نے بری طرح فہد کو گھورا، مگر اس بات کا مطلب ثانیہ نہیں سمجھ پائی۔

"کیا ہے بھیا؟ میں چل کرنے جا رہی ہوں، ذرا یونیورسٹی کے ماحول سے دوستی کرنے۔ آخر مجھے بھی پڑھنا ہے، وہ بھی انجینئرنگ یونیورسٹی۔"

"کیا کہا۔ تم انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لو گی؟ یہ خناس یقیناً زارا میڈم نے بھرا ہو گا۔" فہد نے زہر میں بجھا ایک اور تیر زارا کی طرف اچھالا تو زارا نے تیز نگاہ سے اسے گھورا اور بیگ اٹھا کر باہر کی طرف بڑھی۔

"جی نہیں۔ بھیا۔ یہ میرا شوق ہے۔ میں تو بنوں گی انجینئر۔ اتنی اچھی پرسنیلٹی آئی ہے میری۔"

"اوہو۔ کیا ہوا جو پرسنیلٹی اچھی آ گئی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں، کوئی کام تو صرف مردوں کے لیے رہنے دو۔ کوئی صحافت کے میدان میں کود گئی ہے، کوئی انجینئر بننے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ ہو کیا گیا ہے اس گھر کی لڑکیوں کو۔ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کا ڈینگی کاٹ گیا ہے اور یہ سب ان خاتون کا کارنامہ ہے جو آزادیٔ نسواں کا علم اٹھائے نکل پڑی ہیں۔ دیکھیے اب کیا ہوا انجام....."

فہد اسے چڑانے کے لیے چبا چبا کر بول رہا تھا اور ساتھ ہی پورچ میں کھڑی گاڑی کو ریموٹ سے آن کیا۔ دروازہ کھلا، زارا غصہ سے پلٹی۔

"ملاحظہ کی تم نے اپنے بھائی جان کی سوچ اور ذہنی پسماندگی۔ عورت کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال کر اپنے احکام پر چلانے والے مرد میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔" زارا بیک ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔ ثانیہ، فہد کو

گھورنے لگی۔
"[illegible] ناں بھائی۔ ہر وقت میری پیاری بھابھی کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔" ثانیہ تیزی سے آگے بڑھی اور پیچھے زارا کے ساتھ بیٹھ گئی۔
"ایکسکیوزمی! لڑکی لگتا ہے تم تک بریکنگ نیوز ابھی تک نہیں پہنچی۔ یہ اسماء اور ثمینہ بھی ناں، کبھی بڑی نہیں ہوں گی۔" فہد چڑانے والے انداز میں زارا کو گھورتا ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔
"ایکسکیوزمی بھائی! امی اور خالہ کے لیے کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"
"ہاں تو اور کیا کہوں؟ کہا بھی تھا ان خواتین سے کہ ہر خاص و عام کو بتا دیا جائے کہ یہ خاتون اب ہماری منگیتر نہیں رہیں لہٰذا ان کو میرے حوالے سے پکارا جائے، نہ ہی منسوب کیا جائے اور اب یہ پیغام تم سب تک پہنچا دینا، او کے۔"
فہد کے اندر کا درد اس کے لہجے میں جھلک رہا تھا، مگر ثانیہ نے اس کی اس بات کو بھی زارا سے چھیڑ چھاڑ سمجھا۔
"بس کریں بھائی! مذاق میں بھی ایسی بات نہ کریں۔ ہمیں گھبراہٹ ہوتی ہے۔"
"نہیں ثانیہ۔ ایک ہی تو سچ بولا ہے تمہارے بھیا نے۔"
"اف زارا! تم دونوں کے اختلافات سے لگتا ہے کہ...... چلیے بھیا! گاڑی اسٹارٹ کریں ورنہ میں آپ دونوں کی اس روٹین کی نوک جھوک کو سیریس لے کر رونے لگوں گی۔"
"ہونہہ...... روٹین کی نوک جھوک۔" فہد نے گہرا سانس لیا۔ زارا گلابوں کی کیاریوں میں کھلتے گلاب دیکھنے لگی۔
"اب کیا سوچ رہے ہیں بھیا! چلیے بھی۔ زارا کی کلاس مس ہو جائے گی۔" ثانیہ کی بات پر فہد چونکا۔
"ہوں۔ ہاں۔ مگر یہ کیا میں ڈرائیور ہوں تم دونوں بیگمات کا۔ دونوں میں سے کوئی ایک آؤ فرنٹ سیٹ پر۔" فہد نے ایک برہم سی نظر زارا پر ڈالی، جو سخت بے زاری بیٹھی تھی۔
"چلو زارا۔ تمہیں ہی اس سیٹ پر ہونا چاہیے، آگے جاؤ۔"
"میں یہیں ٹھیک ہوں۔" زارا اسی بے زاری سے بولی تو فہد چڑ گیا۔
"ٹھیک کہہ رہی ہیں محترمہ! میرے ساتھ بیٹھنے ہی سے تو ان کی طبیعت خراب ہوتی ہے۔ نہ جانے خود کو سمجھتی کیا ہیں۔"
"زارا۔ پلیز جاؤ۔ آگے جاؤ۔ تم وہیں جچتی ہو، تمہارے بغیر یہ گاڑی نہیں چلے گی۔"
"ایک میں تم لوگوں کی ان —— باتوں سے سخت نالاں ہوں۔ کون ہوں میں، اسٹیئرنگ ہوں، بریک کلچ ہوں کہ میرے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی۔" زارا غصے سے بولتی اٹھ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی کیونکہ وہ فہد کی ڈھٹائی جانتی تھی جب تک نہ بیٹھ جاتی، وہ ہرگز گاڑی ڈرائیو نہ کرتا اور وقت برباد کرتا۔ میڈم جمیلہ کی کلاس مس بھی نہیں کر سکتی تھی۔ فہد کو نہ جانے کیوں اب اسے چڑانے میں مزا سا آنے لگا تھا، وہ جیسے ہی بیٹھی فہد نے گاڑی اسٹارٹ کر کے گنگنانا شروع کر دیا۔
"تم کیا جانو تم کیا ہو، ایک سریلا سپنا ہو۔"
فہد نے پلٹ کر ثانیہ کو دیکھا، وہ محبت سے دونوں کو دیکھ کر مسکرا دی۔
اسی دوران سرمد کی کال آ گئی، زارا کے موبائل پر۔ فہد نے موبائل اسکرین پر — سرمد کا نام دیکھ لیا تھا۔ ایک



دم اسے شدید غصہ آیا، زارا نے اس کی وجہ سے فون ریسیو نہیں کیا کہ درمیان میں اگر فہد نے کچھ کہہ دیا تو وہ کیا منہ دکھائے گی سرمد کو۔ مگر سرمد کی تیسری کال پر چڑ کر فہد نے موبائل زارا کے ہاتھ سے لے کر آن کر دیا۔
"یار سرمد۔ آ رہی ہیں ہاں یونیورسٹی محترمہ زارا صاحبہ! پھر بار بار کال کرنے کا کیا مطلب ہے۔ یار تم تو ضرورت سے زیادہ ایفیشنٹ ہو، حد ہوتی ہے۔"
اور جس بات سے زارا ڈر رہی تھی، وہ ہو گئی تھی۔
"اوہ سوری فہد! وہ دراصل زارا کے پاس میری فائل ہے، اسے صرف یہ یاد دلانے کے لیے کال کر رہا تھا۔" جواباً سرمد نے انتہائی اچھے طریقے سے بات کی تو فہد نے موبائل زارا کی طرف بڑھایا۔
"بات کرو۔"
"ہاں سرمد۔ ہاں۔ ہاں میں نے فائل لے لی ہے اور آج ہمیں اس سلسلے میں کچھ خواتین کے انٹرویوز بھی کرنے ہیں۔ او کے ملتے ہیں۔"
فون آف کر کے زارا، ثانیہ کی طرف پلٹی۔ شدید غصے سے اس کا چہرہ گرم اور سرخ ہو رہا تھا۔
"دیکھ لیا۔ دیکھ لیا۔ تم نے اپنے بھائی صاحب کا پڑھا لکھا انداز، اس جیسے خود پسند، خود پرست انسان کے ساتھ چند قدم چلنا دشوار ہے کجا ساری زندگی۔" شدید ضبط کے باوجود کئی آنسو اس کے گالوں کو تر کر گئے تو فہد کے دل میں اک ٹیس سی اٹھی۔
"تو تمہیں زندگی کے سفر میں ساتھ لے کر کون جا رہا ہے۔ ہم سے نہیں ہوتیں یہ دلداریاں۔ چلو اترو۔"
گاڑی زارا کے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے روک کر فہد نے زارا کے منتظر سرمد کو دیکھا تو جی چاہا اسے شوٹ کر دے۔
زارا فوراً اتر گئی۔
"اور تم کیوں تشریف فرما ہو، پھوٹو اب۔ میری مہمان نہیں جو میں......"
"اف بھیا! آپ تو واقعی بہت بدمزاج ہیں۔ امی سے شکایت کروں گی آپ کی۔" شکایت کی دھمکی دیتی ثانیہ بیگ سنبھالے اتر گئی۔ فہد تیزی سے آگے بڑھ گیا۔
"السلام علیکم۔" ثانیہ سرمد کو پہلی بار دیکھ رہی تھی۔
"وعلیکم السلام۔ آئیے۔" سرمد مسکرا کر اس کی طرف مڑا۔
"سرمد! یہ میری کزن ثانیہ ہے۔ فہد کی بہن، این ای ڈی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔ چند نمبروں سے ٹاپ کرتے کرتے رہ گئی۔" زارا نے دانستہ طور پر فہد کی بات کو بھلا کر موڈ بحال کر لیا۔ ثانیہ پہلی بار آئی تھی۔
"ارے واہ، ماشاء اللہ۔ اتنی ذہین اور قابل ہیں آپ۔ ویسے ایک بات ہے لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ محنت کرتی ہیں اور مجھے تو خوشی ہوتی ہے جب لڑکیاں مردوں کے شانہ بشانہ محنت کرتی ہیں، آگے بڑھتی ہیں۔ ایڈمیشن بھی شروع ہونے ہی والے ہیں، اس سلسلے میں، میں آپ کو اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔"

☆☆☆

"آؤ آؤ سعد۔ بیٹھو۔" سعد فائل پکڑے ساجد کے آفس میں آیا تو وہ گہری سوچ میں تھے۔ اسے دیکھ کر چونک گئے۔
"شکریہ چچا جان۔ آپ کسی گہری سوچ میں لگ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے۔" سعد نے بغور چچا کو دیکھا۔
"میں دراصل اپنے آفس میں ایک نوجوان کو اپائنٹ کرنا چاہ رہا ہوں۔" ساجد اصل مدعا پر آ گئے۔
"لیکن چچا جان! ہمارے ہاں آفس میں، فیکٹری میں کہیں بھی کوئی ویکنسی نہیں ہے۔" سعد نے صاف منع

کر دیا۔

"بیٹا۔ دیکھنی کبھی کبھی نکالنا پڑتی ہے۔ مطلب میں اپنے لیے ایک اچھے پڑھے لکھے نوجوان کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ میں اب زیادہ کام نہیں کر سکتا، تو میری جگہ وہ میرے معاملات، میری مصروفیات تمہارے ساتھ شیئر کرے گا۔" نظریں چرا کر ساجد نے کہا تو سعد کو سخت غصہ آ گیا۔

"تو سر جی۔ یہ صورت حال ہے، آپ مجھ پر کوئی کیمرہ فٹ کرنا چاہ رہے ہیں تو میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" ساجد جل کر سوچنے لگا۔

"کیوں بیٹے تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" اسے خاموش دیکھ کر ساجد نے پوچھا تو وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"نن...... نہیں چچا جان! مجھے کیوں کوئی اعتراض ہونے لگا۔ آپ دیکھ لیں کوئی، کہیں تو اخبار میں اشتہار دے دوں یا......" سعد نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"نہیں۔ کسی اشتہار وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ میری نظر میں ایک نوجوان ہے، میں اسے ہی رکھنا چاہ رہا ہوں۔"

بات کرتے ہوئے ساجد نے خود کو دائیں بائیں فائلیں اٹھاتے دیکھتے سائن کرنے میں مصروف رکھا کیونکہ جب انسان کے اپنے اندر چور ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے نظریں چراتا ہے اور ساجد بھی اب اپنے ہی بیٹوں کو اپنے ہی بزنس میں شامل کرتے ہوئے چور سے بن رہے تھے اور در پردہ کچھ ہے یہ بات سعد بھی سمجھ رہا تھا۔

"اچھا تو چچا جان۔ اگر آپ صرف اپنے لیے سیکریٹری رکھ رہے ہیں تو اس کی کیا سیلری ہوگی اور اس کی ادائیگی جوائنٹ اکاؤنٹ سے ہوگی یا......"

"تم کوئی فکر نہ کرو میاں! یہ میری اپائنٹمنٹ 'پرسنل ہوگی تو سیلری جوائنٹ اکاؤنٹ سے کیوں ہوگی۔ میں خود سیلری دوں گا۔ ڈونٹ وری، ایٹ آل۔" ساجد نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ سعد شرمندہ سا ہو گیا۔

"جی۔ اچھا چچا جان! یہ نئے پروجیکٹ کی فائلیں ہیں، آپ ایک نظر دیکھ لیں تو بات آگے بڑھائی جائے۔"

"تم نے دیکھ لی ہیں، تمہیں مناسب لگ رہا ہے تو ایک میٹنگ رکھ لو اور اس میں تمام معاملات طے ہو جائیں گے۔" ساجد کا رویہ گریز پا تھا، سعد نے ان کو ایک نظر دیکھا۔

"جی بہتر۔ میں میٹنگ کال کرنے سے پہلے آپ کو بتا دوں گا، ابھی آپ کہیں جا رہے ہیں۔" ساجد کو سیٹ پر سے اٹھتے اور موبائل، گاڑی کی چابی اٹھاتے دیکھ کر سعد نے پوچھا تو ساجد مڑے بغیر جواب دیے بنا آگے بڑھ گئے۔

"یہ سر جی ہیں کس چکر میں، اللہ ہی جانے۔"

☆☆☆

"دیکھیں ساجد! میں بہت خوش ہوں کہ آپ کے بیٹے آپ کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے اور آپ کی ذمہ داریوں میں آپ کا ساتھ دینے کے قابل ہو گئے ہیں تو آپ خود ارمغان سے بات کریں اور ذرا پیار سے بات کریں۔ وہ...... وہ آپ کی بات مان جائے گا۔"

"پیار...... پیار...... کیسا ہوتا ہے پیار؟ میں تو حیران ہوں کہ میرے بیٹے مجھ سے نالاں کیوں ہیں، ان کے حقوق کی ادائیگی میں کون سی کوتاہی برتی ہے میں نے کہ......" ساجد بیڈ پر لیٹ گئے، بی پی ہائی ہو گیا تھا۔ منیبہ



جلدی سے پانی لے آئی۔

"یا اللہ تو ہی ان باپ بیٹوں کے درمیان کھڑی دیوار کو گرا سکتا ہے۔ ارمغان تو ہرگز باپ کی یہ بات نہیں مانے گا۔"

"موصوف یونیورسٹی سے کب تک تشریف لائیں گے۔"

ساجد کبھی بھی اپنے لہجے کی تلخی کو ختم نہیں کر سکے اور اسی سے سارے فساد کھڑے ہوئے۔

"آج تو ذرا لیٹ ہو جائے گا۔ ساجد! آپ فکر نہ کریں میں اسے منالوں گی، وہ بطور ہیلپر آپ کے ساتھ کھڑا ہوگا۔"

"جی...... جی۔ کیوں نہیں۔ وہ آپ کی بات کیوں ٹالنے لگا، ماں ہیں ناں آپ۔ آپ ماؤں نے اپنے بچوں کی ٹریننگ ہی ایسے کی ہوتی ہیں کہ بچے کی نظر میں باپ کی تو کوئی حیثیت ہوتی نہیں، ماں ہی ماں ہوتی ہے۔ ادھر ثمینہ بیگم نے، ارے تم دونوں عورتوں نے میرے بیٹوں اور بیٹیوں کو میرے خلاف کر دیا ہے۔" ساجد نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"اف ساجد......" منیبہ بے زاری اٹھ کر باہر چلی گئی۔

☆☆☆

"اف کتنا پڑھتے ہو تم، بچ میں، میں تو بور ہو گئی ہوں۔ سوچا تھا ذرا انجوائے کریں گے، کھائیں پئیں گے، یونیورسٹی گھومیں گے۔ مگر آپ لوگ تو کتابی کیڑا ہو۔" ثانیہ نے زارا، سرمد اور حنا کو کتابوں میں گھسا دیکھ کر کہا تو حنا ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"حد ہے یار! تم لوگوں نے مہمان بچی کو بھوکا مار دیا۔ بوریت سے جمائیاں لے لے کر بے چاری سوکھے گلاب جیسی ہو گئی ہے۔" حنا، ثانیہ کی حمایت میں اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

"سوری ثانیہ! بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ یہ ختم کر کے آج ہم آپ کو پڑوسی یونیورسٹی یعنی کہ آپ کی ہونے والی درس گاہ میں اچھا سا لنچ کروائیں گے۔ کیوں زارا؟"

اخبارات کے بنڈل کو سرمد نے الماری میں رکھتے ہوئے اپنی بات کی تائید کے لیے زارا کو دیکھا جو نوٹس بنانے میں بہت مگن تھی۔ دائیں بائیں سے نکلی اس کی لٹوں میں سرمد کی نظر الجھ کر رہ گئی۔ حنا کی نظریں چونکہ اس کی نظروں کی ٹوہ میں رہتی تھیں اس نے جھٹ چٹکی بجائی، سرمد نادم سا ہو گیا۔

"میڈم زارا۔ سرمد صاحب نے کچھ کہا ہے، کوئی آفر دی ہے جو ہمیں، ہمارے معدے کو سو فیصد قبول ہے۔"

"اچھا بھئی، اچھا۔ چلو سامان تو سمیٹ لینے دو۔" زارا نے اپنی فائل اٹھا کر بیگ شانے سے لٹکایا۔

"چلو۔" پھر یہ چاروں سرمد کی گاڑی میں این ای ڈی یونیورسٹی پہنچ گئے۔ سرمد نے فون کر دیا تھا، اسی لیے ارمغان کیفے ٹیریا پر ہی ان کا منتظر تھا۔

"ویلکم۔" ارمغان نے مزاج سے ہٹ کر خوش گوار موڈ میں خوش آمدید کہا۔ نظریں کھلتی گندمی رنگت والی ثانیہ پر تھیں۔ جو اس پر سرسری نظر ڈال کر زارا کے اور قریب ہو گئی تھی۔

"یہ خاتون ثانیہ عابد ہیں۔ زارا کی کزن اور فہد کی بہن ہیں اور فیوچر میں تمہاری یونیورسٹی فیلو بننے جا رہی ہیں اور اس سلسلے میں ان کو آپ کی مدد درکار ہوگی۔" سرمد نے ثانیہ سے پوچھے بغیر ہی ہیلپ کی ذمہ داری اس پر ڈال دی۔

"ہوں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی، فی الحال تو لنچ کرتے ہیں۔ آیئے پلیز۔" ارمغان اپنے ازلی اکڑ پن میں آچکا تھا۔

"کتنی عجیب بات ہے، میرا دوست مجھ سے ہی میرے اپنے لوگوں کا تعارف کروا رہا ہے۔" ارمغان نے گہرا سا سانس لے کر ایک نظر اپنی پرکشش چہرے والی کزن کو دیکھا، جو کچھ سمٹی جا رہی تھی۔

"بات سنو زارا! فہد کو پتا چلے گا تو ہنگامہ کرے گا۔" حنا، سرمد اور ارمغان کے اٹھ کر جاتے ہی بولی تو ثانیہ دونوں کو دیکھنے لگی۔

"مائی فٹ! وہ ہوتا کون ہے مجھ پر پابندیاں لگانے والا۔"

"کیا ہوگیا ہے زارا! کیوں پریشان ہو رہی ہو؟"

"ثانیہ۔ تم نہیں جانتیں، بھئی تمہارا بھائی، کیا کیا کارنامے انجام دیتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں حنا! مگر بھیا زارا کے معاملے میں اتنے پکے ہیں کہ اس پر کسی کا سایہ بھی گوارا نہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ شادی ہو جائے گی تو سب معاملات سیٹ ہو جائیں گے۔"

"کس کی شادی...... اوہ یاد آیا سارہ کی شادی کے پروگرام بن رہے ہیں۔ گڈ، ویسے تم لوگوں کو کتنا مزا آئے گا ناں۔ ماشاء اللہ ڈھیر سارے کزنز خوب ہلا گلا ہوگا۔ آئی وش کہ ہم بھی اس فیملی کے ممبر ہوتے۔ کیوں ارمغان......" سرمد کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی، اس نے ارمغان کو دیکھا جو اس کی بات پر چونکا۔

"ہوں۔ ہاں اور آپ لوگ کافی لیں گے تو چلیں یا یہیں آرڈر کردیں۔" ارمغان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ہی میزبان ہو، جبکہ زارا اپنا والٹ نکال چکی تھی۔

"بہت شکریہ۔ آپ بل منگوایئے، ہم پے کرکے چلیں۔" زارا کی بات پر ارمغان کو خاندانی غصہ آگیا۔

"میڈم۔ اس وقت آپ لوگ میری یونیورسٹی میں، میری مہمان ہیں۔ تو کوئی بھی میزبان مہمان سے بل نہیں لیتا۔"

"ارمغان ٹھیک کہہ رہا ہے اور بل کی ادائیگی بھی ہو چکی ہے۔"

"سرمد۔ یہ بہت غلط بات ہے، اگلی دفعہ ہم لوگ تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔" زارا کو بہت برا لگا تھا ارمغان کا بل پے کرنا۔

"ارے یہ سزا مت دینا۔ آئندہ بل تم ہی پے کروگی، ویسے بھی یہ لنچ مجھے اپنی چھوٹی بہن ثانیہ کے اعزاز میں دینا تھا مگر ارمغان نے مجھے بھی نہیں بتایا۔"

"بہت شکریہ سرمد بھائی! آپ کا اور...... آپ کا لیکن یہ سب اچھا نہیں لگا۔" ثانیہ بھی کچھ خفا خفا سی اٹھ گئی۔

"چلیے، لنچ ادھار رہا آنے والے وقت میں اگر آپ میری یونیورسٹی فیلو بن رہی ہیں تو کروا دیجیے گا لنچ، حساب برابر۔"

"اور اس لنچ میں بھی ہم سب شریک ہوں گے۔" حنا نے ہنس کر ارمغان اور ثانیہ کو دیکھا۔

"سرمد! ایسا کرو ہمیں اب یونیورسٹی چھوڑ دو، فہد آتا ہی ہوگا۔" زارا جلدی سے چلی جانا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فہد کو اپنے غصے کے اظہار کے لیے تنہائی کی ضرورت نہیں ہوتی، جب جہاں آتا ہے، اتار دیتا ہے اور اسے معزز لوگوں کی توہین گوارا نہیں تھی۔

☆☆☆



"بزنس میں دن بہ دن خسارہ ہو رہا ہے اور گھریلو اخراجات ہیں کہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ مہنگائی نے الگ کمر توڑ رکھی ہے۔ کیا کرنا ہے کلیم۔" چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے وسیم نے خالصتاً اخراجات اور مہنگائی کا رونا رویا تو کلیم اور غفیر اسے دیکھنے لگے۔

"آپ ہمیں تو ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے ان تمام معاملات کے ہم ذمہ دار ہیں۔ خسارہ اور اخراجات تو سب کے سامنے ہیں اور اس سلسلے میں ہمیں اب ابا جان سے بات کرنا پڑے گی۔"

"ہرگز نہیں۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کلیم بھیا! ابا جان کا اب ان معاملات سے کیا لینا دینا۔ انہوں نے اپنی تمام ذمہ داریاں نبھادیں، اب وہ کیا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے تھوڑی کچھ چھپا کر رکھا ہے جو ان سے مانگ لیں گے۔ ہم ان کو پریشان نہیں کریں گے۔"

غفیر کی بات جو انہوں نے اپنے ابا جان کے حق میں کی تھی، ان کی بیگم گلشن جہاں سن لیتیں تو نہ جانے کیا وبال کھڑا کرتیں۔

"بات تو غفیر میاں! تمہاری درست ہے۔ مگر بتاؤ کریں گے کیا؟" وسیم کے حلق سے چائے نہیں اتر رہی تھی، کپ واپس رکھ دیا۔

"خسارہ اسی طرح ہوتا رہا تو بینک رپٹ ہونے کا خدشہ ہے۔"

"اللہ نہ کرے۔ اگر جو ایسا ہوا تو ابا جان اور اماں جان...... نہیں، ہمیں تمام معاملات اپنے تک رکھنے ہیں۔"

"اور گھر کی دیگر خواتین سے بھی اور لڑکیوں سے بھی، البتہ ہمیں اب گھر کے لڑکوں سے یہ تمام معاملات شیئر کرنے چاہئیں۔ آنے والے وقتوں میں زندگی کی باگ دوڑ ان ہی کے ہاتھ میں تو ہوگی۔"

"بہت معقول بات کی ہے تم نے کلیم! ہمیں ایک میٹنگ لڑکوں کے ساتھ کرنی چاہیے، جوان ہیں۔ آج کل کے دور کے ہیں، نئی سوچ، نئے آئیڈیاز ہوں گے۔ ان کے پاس۔ تو یہ طے ہوا کہ آج رات کھانے کے بعد میٹنگ ہوگی۔"

رات کو میٹنگز کے دوران تمام لڑکوں کو گھر کے حالات اور معاملات سے آگاہ کردیا گیا۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، کسی نے کب سوچا تھا کہ نواب خاندان کی یہ عالی شان حویلی کی بنیادیں اس حد تک کھوکھلی ہو چکی ہیں کہ عمارت بچانا مشکل ہو جائے گا۔

"حالات اتنے ہی سنگین تھے تو ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا گیا ابا جان!" فیصل کے لہجے میں شکایت تھی۔

"بات آپ کی درست ہے مگر یہ سوال اپنے ابا جان سے نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے بزنس کے حالات اور قرضہ جات کے بارے میں انہوں نے بھی ہمیں کبھی نہیں بتایا۔ اب جب ہم تباہی کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں تو...... لگتا ہے کہ ذرا سی بھی گرفت نرم پڑی تو زندگی کا بادبان ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔" وسیم نے لڑکوں سے نظریں چرائیں۔

گھر کے سب لڑکے، غزین سمیت موجود تھے ہر چند کہ غزین کو منع کیا گیا کہ وہ اس گھر کا بیٹا ضرور ہے مگر یہ مسائل اس کے مسائل نہیں ہیں نہ ہی اس پر ذمہ داری ہے مگر پھر بھی وہ بیٹھا سب سن رہا تھا۔

"اب کیا ہوگا چچا جان!" راحیل اور بجیل نے متفکر لہجے میں کہا۔

"ارے بچوں! تم لوگوں سے حالات شیئر کرنے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ آپ لوگ پریشان ہو جائیں۔ اچھے برے حالات زندگی کا حصہ ہوتے ہیں، یہ بتاؤ کہ تمہارا ایم بی اے مکمل ہو گیا۔"

"ایک سمسٹر باقی ہے چچا جان۔ ویسے مجھے یونیورسٹی ہی میں اچھی جاب کی آفر ہے۔ ڈگری ملتے ہی، وہیں جاب کرلوں گا۔"

"بجیل۔ تمہارا ہاؤس جاب بھی اب ختم ہونے والا ہوگا۔"

"جی۔ بالکل ابا جان! ہاؤس جاب مکمل ہونے والا ہے مگر سمپل ایم بی بی ایس کو اتنی سیلری کہاں ملتی ہے کہ......"

"ابھی سب کو کام کرنا ہے، جو تعلیم، جو ہنر کسی کے پاس ہے وہ اس کا استعمال کرے تاکہ گرتی دیواروں کو سہارا دیا جاسکے۔"

"اس کا مطلب تو صاف صاف یہ ہوا ابا جان کہ ہم لوگ غریب ہونے جارہے ہیں۔ جیسے ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کو زوال کے آسیب نے جکڑ کر تباہ کردیا۔ ان کی اولادیں، محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ کوئی ٹھیلا لگانے لگا۔ ابا جان مجھے بھی ایک ٹھیلا دیلا لے دیجیے میں بھی اس برے وقت میں سب کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔"

ہرچند کہ میٹنگ کا موضوع بہت سنجیدہ تھا مگر شمعون جو کہ لڑکوں میں سب سے چھوٹا تھا، اس کی بات سنجیدہ چہروں پر مسکراہٹ لے آئی۔

"اچھا تو میاں، اس ٹھیلے پر کیا بیچیں گے آپ؟"

"سبزی تو بیچ ہی سکتا ہوں۔ کبھی کبھی چھوٹی چچی کچھ منگواتی ہیں تو میں غور سے دکان دار کو دیکھتا ہوں۔"

"ابا جان! آپ ہمیں امریکا بھیج دیجیے، دیکھیے گا ایسی جاب کریں گے کہ گھر کے تمام دلدر دور ہوجائیں گے۔"

سفیر میاں کے اس اعلان پر سب پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بزرگوں نے تو سفیر میاں کی اس سوچ کو محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا مگر لڑکوں نے بڑوں کی نظر چرا کر سفیر کا مذاق اڑانا شروع کردیا۔

"مچھر چلا امریکا۔ امریکا پر آگیا ناں برا وقت۔"

"لگ گئی ناں امریکا کو ہماری آہ اور کریں ہمیں تنگ۔"

شمعون اور ہارون تو سفیر میاں کو چٹکیوں میں اڑاتے، وہ دور سے منہ پر ہاتھ پھیر پھیر کر انتقام لینے کی دھمکی دیتے۔

"کوئی کہیں نہیں جائے گا، ہمیں یہیں رہ کر اپنے مسائل حل کرنے ہیں۔"

☆☆☆

"یہ اندر کیا معاملات چل رہے ہیں۔ ہم خواتین کو اس میٹنگ میں شرکت کی دعوت کیوں نہیں دی گئی؟"

گھر کی سب خواتین دالان میں ٹہل رہی تھیں۔ سب کو ایک پریشانی لاحق تھی کہ ایسی کیا بات ہے جو ہم سے چھپائی جارہی ہے۔

"آپ سب لوگ پریشان نہ ہوں، میں اندر جاتی ہوں۔ میں تو سب سے بڑی ہوں، کسی کی کیا مجال کہ مجھے روک سکے۔" منیزہ اپنے رشتے کا استحقاق لیے آگے بڑھیں تو گلشن جہاں نے برا سا منہ بنایا۔

"رہنے دیجیے آپا جان! بھرم مت گنوائیے اپنا۔ آپ کا کیا خیال ہے ہم نے تاک جھانک کر کان لگا کر سننے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ سب کرچکے حتیٰ کہ دروازے کو توڑنے کی بھی خاموش کوشش کر ڈالی مگر بھیا بہت مضبوط ہیں، اس حویلی کے در و دیوار۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



## القرآن

☆ اور اگر بدلہ لو تو اتنا بدلہ لو جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے۔ اور اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے (سورۃ النحل......126)

☆ جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ظلم کا نشانہ بنایا، پھر توبہ نہیں کی ہے۔ ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ اور ان کو آگ میں جلنے کی سزا دی جائے گی۔ (سورۃ البروج......10)

## تکبر کی سزا

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز خدا کچھ لوگوں کو چیونٹیوں کی شکل میں اٹھائے گا۔ لوگ انہیں اپنے قدموں سے روندیں گے۔ پوچھا جائے گا یہ چیونٹیوں کی شکل میں کون لوگ ہیں؟ انہیں بتایا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو تکبر کرتے تھے (ترغیب و ترتیب)

## بات ہے پتے کی

پیسہ کہتا ہے: مجھے حاصل کرو۔ اور سب بھلا دو۔

وقت کہتا ہے: میرے پیچھے چلو اور باقی سب چھوڑ دو۔

مستقبل کہتا ہے: میرے لیے کوشش کرو۔ اور باقی سب بھلا دو۔

اور اللہ صرف اتنا کہتا ہے: مجھے یاد کرو۔ میں سب کچھ تیرے قدموں میں ڈال دوں گا۔

ماہا بشیر حسین......ڈنگہ

## اللہ کا دروازہ

حضرت حسن بصریؒ نے بلند آواز سے فرمایا۔ "لوگو! اللہ کے دروازے کو کھٹکھٹاتے رہو۔ دروازہ ضرور کھلتا ہے۔"

ایک بڑھیا نے جب سنا تو بولی: "اے حسن! کیا اللہ کا دروازہ بند بھی ہوتا ہے؟"

حضرت حسن بصریؒ بڑھیا کی بات سن کر غش کھا گئے اور بولے۔

"اے اللہ! یہ بڑھیا تجھے مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔"

صائمہ سحر......فیصل آباد

# کرن کرن خوشبو

شعاع عنبریں

## سخاوت اور بچت

ایک حاجت مند حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دروازے پر غروب آفتاب کے بعد آیا۔ ابھی اس نے دستک نہ دی تھی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنی اہلیہ سے شکایت کررہے تھے کہ "چراغ کی بتی موٹی ہے جو تیل زیادہ استعمال کرنے کا سبب بن رہی ہے۔"

حاجت مند نے جو سنا تو وہ سوچتا ہی رہ گیا کہ وہ ایسے شخص سے کیا اپنی حاجت بیان کرے پھر اس نے ارادہ کیا حاجت بیان کرکے دیکھوں۔ شاید میری کچھ امداد کردیں۔

دستک کی آواز سن کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ باہر آئے۔ حاجت مند نے اپنی حاجت بیان کی اور کہا کہ ضرورت کچھ زیادہ ہی ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شخص کا ہاتھ تھاما۔ بستی سے باہر لے گئے جہاں آپ کا سامان تجارت بڑی تعداد میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی نذر کیا۔

وہ شخص ہکا بکا دیکھتا رہ گیا اور پھر بولا۔ ''ایک بات بتایئے چراغ کی بتی قدرے موٹی ہوجانے پر آپ اپنی زوجہ محترمہ کو سرزنش کررہے تھے۔ حالانکہ چراغ اس قدر روشنی رکھنے میں شاید صرف ایک درہم کا تیل بھی استعمال نہ ہوتا۔ وہ تو آپ کو گوارا نہ ہوا اور یہاں ہزاروں کا سامان مجھے بلا تامل دے رہے ہیں؟''

تب آپ نے فرمایا: ''بھائی چراغ میں تیل کا زیادہ اسراف ہے اور زیادہ اسراف اللہ کو پسند نہیں۔ اور سامان تمہیں اللہ کی خوشنودی کے لیے صدقہ دیا ہے۔ اس پر اجر کی امید ہے اور وہاں حساب کا خوف ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

## بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ ایک ہزار قابل انسان مرجانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک ''احمق'' کے صاحب اختیار ہوجانے سے ہوتا ہے۔ (مولانا جلال الدین رومیؒ)

☆ فقیر وہ نہیں جس کا ہاتھ دنیاوی سازو سامان سے خالی ہو بلکہ فقیر وہ ہے جس کا دل ہوس اور خواہشات سے خالی ہو۔ (حضرت داتا گنج بخشؒ)

☆ خدا کے راستے پر چڑھ آئے ہو تو تیز بھاگو، تیز بھاگنا مشکل ہے، تو آہستہ بھاگ لو تھک ہی گئے تو چل لو، یہ بھی نہیں تو گھسٹ لو مگر واپسی کا ہرگز مت سوچنا۔ (امام شافعیؒ)

☆ دولت دنیا کی ہو یا ایمان کی جتنی بڑھتی جائے گی اتنی نیند کم ہوتی جائے گی۔ (الغزالی)

☆ یہ جو تمہارا نفس ہے تم اگر اسے خیر میں مصروف نہیں کرلیتے تو یہ تمہیں شر میں مصروف کرے گا (امام شافعیؒ)

صائمہ مشتاق..... بھاگنوالہ

## بھلے شاہ

نہیں لگدا وقت دچھوڑے دا
بن یار گزارہ کون کرے
دنیا تو کنارہ ہوسکدا
یارا تو کنارہ کون کرے
اک دن ہووے تا لنگ جاوے بلھیا!
ساری عمر گزارہ کون کرے

اقراء ممتاز..... سرگودھا

## عدالت

مقدمے کی سماعت کے دوران وکیل استغاثہ نے گواہ سے پوچھا: ''جناب۔ یہ بتایئے کہ وقوعہ کے روز شام کو جب آپ مسز جمیل کے گھر پہنچے تو مسز جمیل نے آپ سے کیا کہا؟''

''آبجیکشن یور آنر! وکیل استغاثہ کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔'' وکیل صفائی نے کھڑے ہوکر اعتراض کیا۔

اس پر وکیل استغاثہ نے کھڑے ہوکر کہا۔ ''انہیں یہ سوال کرنے کا حق ہے۔'' جج صاحب نے دلیل پوچھی تو وکیل صفائی نے دو گھنٹے لگا کر اٹھارہ مقدمات کے حوالے دے کر بتایا کہ دوسرے وکیل کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔ جواب میں وکیل استغاثہ نے بھی دلائل کے لیے وقت مانگا ابھی ان کا وقت شروع ہوا تھا کہ عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ چنانچہ مقدمے کی سماعت اگلے دن پر ملتوی ہوگئی۔

اگلے دن وکیل نے بھی دو گھنٹے لگا کر درجن بھر ریفرنس سے ثابت کیا کہ انہیں سوال کا حق حاصل ہے۔ بالآخر عدالت نے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

وکیل نے سوال دہرایا: ''جناب سچ سچ بتایئے کہ وقوعہ کے روز شام کو آپ مسز جمیل کے گھر پہنچے تو مسز جمیل نے آپ سے کیا کہا؟''

گواہ: ''جناب مسز جمیل گھر پر ہی نہیں تھیں۔''

ثمینہ اکرم..... کراچی

## نام کی مہر



ایک روز بہادر شاہ ظفر اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ باغ میں ٹہل رہے تھے مرزا غالب بھی ساتھ تھے۔ اس باغ کے آم سوائے بادشاہ یا بیگمات کے اور کسی کو میسر نہ آسکتے تھے۔ مرزا غالب بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

بادشاہ نے پوچھا: ''مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟''

عرض کی: ''حضور والا! یہ جو کسی نے کہا ہے

بر سر دانہ بہ نوشتہ عیاں
کس فلاں ابن فلاں ابن فلاں

(یعنی ہر دانے پر کھانے والے کا نام ہوتا ہے) میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ کسی دانے پر میرے نام کی مہر بھی ہے۔'' بادشاہ یہ سن کر مسکرایا اور اسی روز آموں کا ایک ٹوکرا مرزا کے ہاں بھجوادیا۔

شمع سمیع..... کراچی

## صاف گوئی

چنگیز خان کے بیٹے تنولی کی سرکردگی میں ہرات پر حملہ ہوا۔ وہاں ایک حاکم قاضی وحید الدین بھی موجود تھا۔ حملے کے دوران وہ فصیل سے نیچے گر پڑا مگر تیروں کی بوچھاڑ کے باوجود بچ گیا۔ تنولی نے اسے پکڑوالیا اور پوچھا۔

''اے شخص! حیرت ہے کہ تو کیسے بچ گیا۔ کیا تیرے پاس کوئی تعویذ ہے؟''

وحید الدین نے کہا۔ ''میری نظریں بادشاہ کے چہرے کی طرف تھیں، اس لیے بچ گیا۔'' تنولی نے یہ جواب سن کر سوچا کہ یہ کوئی ذہین اور قابل شخص ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے۔ وہ واپس جاتے ہوئے وحید الدین کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

خراساں پہنچ کر وحید الدین کو چنگیز خان سے بہت قربت حاصل ہوگئی۔ ایک دن چنگیز خان نے اس سے پوچھا۔

''وحید الدین! کیا لوگ میرے کارنامے یاد نہیں کریں گے۔''

وحید الدین نے کہا۔ ''عالم پناہ! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں آپ کے کارناموں کا ذکر اسی صورت میں ہوگا۔ جب لوگ زندہ رہیں گے۔''

## چار دن کی زندگی

بہلول نامی ایک بزرگ غزنی کے رہنے والے تھے۔ یہ اکثر ایسی باتیں کردیا کرتے تھے جو بظاہر سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ ایک دفعہ بارش کی کثرت سے اکثر قبروں میں ایسے شگاف پڑ گئے کہ مردوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں نظر آنے لگیں۔ بہلول قبرستان میں کھوپڑیاں سامنے رکھے دیکھ رہے تھے کہ اتفاقاً بادشاہ کی سواری بھی آنکلی۔ اس نے انہیں اس شغل میں مصروف دیکھ کر پوچھا۔

''بہلول یہ کیا دیکھ رہے ہو۔''

آپ نے فرمایا: ''تمہارا اور میرا دونوں کا باپ مرچکا ہے۔ میں اب یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے باپ کی کھوپڑی کون سی ہے اور میرے باپ کی کون سی؟''

بادشاہ نے کہا۔ ''کیا مردہ، امیر و غریب اور شاہ و گدا کی ہڈیوں میں بھی کچھ ہوا کرتا ہے کہ پہچان لوگے؟''

بہلول نے کہا۔ ''پھر چار دن کی جھوٹی نمود پر بڑے لوگ مغرور ہوکر غریبوں کو حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟'' بادشاہ قائل ہوگیا اور اس دن سے حلیمی اختیار کرلی۔

فضا نور..... روہڑی

## تردد

زہر پینے کی
کیا ضرورت ہے
ہجر
اس کا
بہت ہے مرنے کو

(سباس گل)

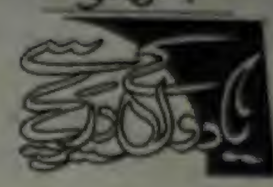

بشریٰ محمود

## یادوں کے دریچے سے

طاہرہ خاتون، کی ڈائری میں تحریر
ناصر کاظمی کی غزل

دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا
یاد نے کنکر پھینکا ہوگا

آج تو میرا دل کہتا ہے
تو اس وقت اکیلا ہوگا

بھیگ چلیں اب رات کی پلکیں
تو اب تھک کر سویا ہوگا

ریل کی گہری سیٹی سن کر
رات کا جنگل گونجا ہوگا

شہر کے خالی اسٹیشن پر
کوئی مسافر اترا ہوگا

آنگن میں پھر چڑیاں بولیں
تو اب سو کر اٹھا ہوگا

شام ہوئی اب تو بھی شاید
اپنے گھر کو لوٹا ہوگا

نیلی دھندلی خاموشی میں
تاروں کی دھن سنتا ہوگا

میرا ساتھی شام کا تارا
تجھ سے آنکھ ملاتا ہوگا

پیاسی کرلاتی کونجوں نے
میرا دکھ تو سنایا ہوگا

میں تو آج بہت رویا ہوں
تو بھی شاید رویا ہوگا

---

ثناء شہزاد، کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی نظم

### سچ کی تلاش،

اپنے ہر جرم کی تاویل ہے ہر شخص کے پاس
کون ایسے میں کرے سے کیسے کرے
جھوٹ کی اوٹ میں پوشیدہ کسی سچ کی تلاش
جتنی قدریں تھیں، بزرگوں کی امانت وہ سب ہی
فالتو بوجھ کی تمثال بنی جاتی ہیں
خواب بازار میں بکنے لگے اشیا صورت
خواہشیں الجھا ہوا جال بنی جاتی ہیں
حق تھے جتنے بھی ہمارے، وہ ہوئے ضبطِ بحق سرکار
جتنے ایوان تھے ہمارے، ان میں
سج گئے اہلِ حشم کے دربار
بے حسی وہ کہ ضمیروں کو یہاں
کوئی ذلت نہیں کرتی بیدار
اس ہمہ گیر زبونی کا گلہ کس سے کریں
اپنی پہچان بھی جس دور میں مشکل ہو وہاں
آئینے سے نہ ملیں ہم تو ملا کس سے کریں
اپنے ہر جرم کی تاویل ہے ہر شخص کے پاس

---

یاسمین فرید، کی ڈائری میں تحریر
احمد فراز کی غزل

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجیب حال تھا جب اس سے ہو رہے تھے الگ

یہ حرف و لفظ ہیں دنیا سے گفتگو کے لیے
کسی سے ہم سخنی کے مکالمے تھے الگ

خیال ان کا بھی آیا کبھی تجھے جاناں
جو تجھ سے دور بہت دور جی رہے تھے الگ

ہم ہی نہیں تھے ہماری طرح کے اور بھی لوگ
عذاب میں تھے جو دنیا سے سوچتے تھے الگ

اکیلے پن کی اذیت کا اب گلہ کیسا
فراز خود ہی تو اوروں سے ہو گئے تھے الگ

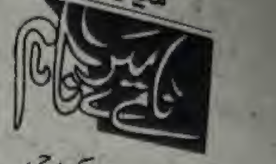



مدیرہ کرن

## نامے میرے نام

ثناء شہزاد...... کراچی

سرورق بس ٹھیک لگا۔ ''حمد و نعت'' کے بعد اداریہ پڑھا اس کے نیچے دیکھا تو سروے کے سوال موجود تھے سوچا پہلے اس کے جواب ہی لکھ ڈالوں مگر ''نامے میرے نام'' پر پہلے انٹری دی، مجھے نہیں پتا تھا کرن کے حوالے سے اتنے لوگ مجھے چاہنے لگے ہیں کہ اگر میں اس محفل میں شامل نہ ہوں تو سب بہنیں میری کمی کو محسوس کرتی ہیں اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد بھی رکھتی ہیں جزاک اللہ خیر۔ آپ سب بھی میری دعاؤں میں ہمیشہ رہتی ہیں گل رعنا سے ملاقات کی لگے ہاتھ کنزہ ہاشمی کی بھی سن لی۔ محمد ہدایت سائر کو بعد کے لیے چھوڑا اور صفیہ ناز کے مقابل جا پہنچے جوابات پسند آئے ان کے لاسٹ میں جو انہوں نے سمجھایا وہ اچھا لگا۔ اس کے بعد ہم نے نگہت عبداللہ کے ناول ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' کی طرف دوڑ لگائی میرا سب سے من پسند ناول ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کے لیے دل دکھ رہا ہے ربیکا بھی خوش نہیں رہ سکے گی کیونکہ اس نے اپنے ماں باپ کا بھی دل توڑا ہے اور حمزہ شہرینہ کا بھی۔ رخ چوہدری کا ''شب نم کی سحر'' نام تو بہت پیارا ہے کہانی بھی اچھی ہے ''شام رنگ سیاہ'' ایمل رضا اور ساگر کنارے ام طیفور کا دونوں سپرہٹ جا رہے ہیں۔ منشا محسن علی تو ہمیں اپنا گرویدہ کر رہی ہیں ہر اسٹوری بے مثال ہوتی ہے، ''ابا کی صفیہ گل'' بہت پسند آئی۔ ماں باپ کی اور بہن بھائیوں کی بے حسی پر بہت غصہ آیا سنبل جیسی دوست نصیب سے ملتی ہے اطلس نام پیارا لگا اس بار تو افسانے دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ میری پیاری ریحانہ آپی بھی کرن میں جلوہ گر نظر آئیں ان کی کرن میں پہلی تحریر تھی اور بہت زبردست لکھا انہوں نے اب جلدی سے ایک اچھا سا مکمل ناول لکھ ڈالیں آپ۔ طیبہ عنصر میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں ''جہاں تم وہاں ہم'' بہت اچھی لگی۔ نزہت جبیں نے ''غریب ایڈمن'' میں اچھا سبق دیا۔ سیما بنت عاصم نے ''محبت ایک وسیلہ ہے'' شاندار لکھی۔ دانیہ آفرین کی ''کینڈل لائٹ ڈنر'' بھی اچھی لگی فرح انیس ''دل کی خاطر'' اور ''پارس'' ماورا طلحہ نے دل میں گھر کرلیا۔ باقی افسانے بھی بہت پسند آئے اب آتی ہوں اس کہانی کی طرف جو اس بار کرن کی جان تھی جو سب سے زیادہ پسند آئی جی ہاں صحیح پہچانا وہ تحریر ہے ''آتش عشق'' ندا حسنین کی کیا کمال کا لکھا انہوں نے پوری کہانی تجسس سے بھرپور تھی حویلی کے پیچھے کیا بھیانک پہلو چھپا ہوا تھا اتنا اچھا ناول لکھنے پر ندا آپی کو میری طرف سے بہت بہت مبارک قبول۔

ج: ثناجی! ہمیں اپنے ایسے قارئین، جو تفصیل سے ہر کہانی پر تبصرہ لکھتے ہیں، ان کے خط پڑھ کر بہت خوشی ملتی ہے۔ کیونکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو کرن سے کتنی محبت ہے۔

ماریہ نذیر...... سرگودھا

میں نے پہلا خط لکھا اور بڑی مشکل سے پوسٹ کروایا مگر آپ نے شائع نہیں کیا۔ پھر میں نے سوچا تھا اب خط نہیں لکھنا۔ مگر فروری 2019ء کے خط پڑھے تو آپ نے کہا کہ ''ہم تو ان کی کمی بھی محسوس کرتے ہیں جو ''نامے میرے نام'' میں شامل ہی نہیں ہیں۔ بس اس جملے نے ہمیں خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ فروری 2019ء کا کرن ''14 فروری کو مل گیا۔ بہت انتظار کے بعد۔ ٹائیٹل بس ٹھیک تھا۔ ''اداریہ'' میں مدیرہ صاحبہ نے خاص ایشو کی جانب توجہ دلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ملک کے حالات ٹھیک کرے اور صاحب اقتدار کو ہدایت دے۔ (آمین) ''حمد اور نعت سے فیض یاب ہوتے ہوئے ''گل رعنا'' پر پہنچے تو اک ہی نظر میں میڈم گل رعنا، کنزہ ہاشمی اور ہدایت کو نظر انداز کر کے آگے بڑھے وجہ یہ ہے کہ مجھے ذرا دلچسپی نہیں ہے۔ شوبز سے۔ اور نہ ہی ایکٹر اور ایکٹریس کا پتا ہے۔

''ہوائیں رخ بدل گئی'' اور ''شب نم کی سحر'' دونوں ناولز بہت اچھے ہیں۔ نگہت عبداللہ کی میں فین ہوں۔ دونوں ناولز کی اس ماہ کی قسط لاجواب رہی۔ بہت بہت تعریف ان کے لیے۔ ''جہاں تم وہاں ہم'' طیبہ عنصر مغل کا افسانہ اچھا لگا۔ ''اک ادھوری کہانی'' مریم شہزاد۔ بہت بڑا سبق دیا آپ نے افسانے میں ونڈرفل ''ساگر کنارے'' ام آپی آپ کا ناول بہت اچھا ہے۔ بہت بہت مزے کا پلیز ماہی اور مومن کی جوڑی بنایے گا۔ دادا کی نوک جھوک شاندار حصہ ہے اس میں۔ ''شام رنگ سیاہ'' ایمل رضا آپ کے تو کیا کہنے آپ کا ہر ناول شاندار ہوتا ہے۔ بہت لاجواب قسط۔ اس زیادہ مزا آرہا ہے۔ ''کینڈل لائٹ ڈنر'' دانیہ آفرین بہت اچھا افسانہ۔ سب کچھ عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ گھ

جنت بنانا بھی اور جہنم بھی۔ ''کہانی گھر گھر کی'' ریحانہ اعجاز واہ کمال، واقعی ٹھیک کہا آپ نے اب اچھے رشتے ملتے ہی نہیں ہیں۔ اللہ سب بہنوں کے نصیب اچھے کرے۔ آمین۔

''دل کی خاطر'' فرح انیس بہت اعلا۔ رشتوں کی بقا کے لیے انا کو کچلنا پڑتا ہے۔ پتا نہیں انسان اپنی ''میں'' سے کیوں نہیں نکلتا۔ ''غریب ایڈمن'' فرحت جبیں واہ واہ افسانہ آف دا منتھ۔ بہت بہت اعلا۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں تعریف کے لیے۔ باقی سارے سلسلے لاجواب رہے۔ ''کرن کتاب'' ہمیشہ کی طرح شاندار رہی۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے کیونکہ 14 فروری کو شام 5 بجے رسالہ ملا تو رات میں پڑھ کر 15 فروری کی صبح صبح خط پوسٹ کیا ہے۔ دیکھ لیں اتنے شارٹ ٹائم میں بھی کرن سے محبت شاندار ہے۔ آخر میں صفیہ ناز میری دعا ہے اللہ آپ کی خواہش ضرور پوری کرے۔ ٹیلرنگ شاپ والی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اعلا پائے کی ڈیزائنر بنائے۔

ج: ماریہ جی! امید ہے اب آپ کی شکایت دور ہو جائے گی۔

ماہا بشیر حسین......ڈنگہ

اس دفعہ سارا کا سارا شمارہ بیسٹ رہا ٹائٹل اچھا تھا۔ گل رعنا سے ملاقات سو سو رہی۔ کنزہ ہاشمی سے بھی کافی بار مل چکے ہیں۔ ماورا، انجل یا مہوش کا انٹرویو کریں پلیز۔ ''ابا کی صفیہ گل'' نشا محسن کی ہر کہانی مجھے ایک جیسی لگتی ہیں۔ ''عشق آتش'' کمال کا ناول تھا۔ ''ساگر کنارے'' اور ''شام رنگ سیاہ'' فکر کی کہانیاں ہیں دونوں کی ہر قسط زبردست ہوتی ہے۔ افسانے سارے ہی اچھے اور سبق آموز تھے پر ماورا طلحہ کا ''پارس'' زیادہ پسند آیا۔ ''نامے میرے نام'' میں زہرہ اقبال اور اقرا امتیاز کے خط زبردست تھے۔

ج: ماہا بشیر جی! آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی گئی ہے۔

تبسم بشیر حسین......ڈنگہ

ٹائٹل دیکھ موڈ آف ہو گیا جسے ''کرن'' کتاب کے ٹائٹل نے آن کر دیا برائیڈ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ''اداریہ'' پڑھ کر دکھ ہوا۔ ''حمد و نعت'' سبحان اللہ۔ کنزہ ہاشمی کا انٹرویو اچھا لگا۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں صفیہ ناز کے جوابات باقی سب سے ذرا ہٹ کر رہے ویری گڈ! موسٹ فیورٹ ناول ''ہوائیں رخ بدل گئیں''۔ اس دفعہ کی قسط کافی افسردہ رہی۔ اس دفعہ تیمور وغیرہ کا ذکر نہ تھا؟

''عشق آتش'' ندا حسنین کا مکمل ناول شاندار رہا ویری گڈ۔ ہماری فیورٹ رائٹر نشا محسن علی ''ابا کی صفیہ گل'' زبردست ناولٹ تھا نشا آئی لو یو! ''کینڈل لائٹ ڈنر'' واقعی مسائل ہمارے اپنے کھڑے کیے ہوتے ہیں۔ اچھی تحریر تھی۔ ''ادھوری کہانی'' ہر کہانی ایک جیسی اس لیے ہوتی ہے کہ سب کے مسائل ہی ایک جیسے ہیں وسیم کے لیے حرا نے اپنا آپ رول دیا اور یہ مسٹر چلے دوسری شادی کرنے حرا نے وقت پر سب سنبھال لیا اچھا کیا ''غریب ایڈمن'' واقعی آج کل کے دور میں سب مطلب کے یار ہیں۔ عنبرین جن رائٹرز کے کام آتی رہی انہوں نے کتنی آسانی سے اسے ایک طرف رکھ دیا خیر سب برے نہیں ہوتے جیسے عائزہ نعیم وسیلہ بنی۔ ''کہانی گھر گھر کی'' ماہ رو کی زیادہ پڑھائی اور ماہ پارہ کی کم تعلیم، واقعی دنیا کسی طور جینے نہیں دیتی ہے ہر بات پر نکتہ چینی پتا نہیں لوگ کسی کی ذات کو نشانہ بنانے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اپنی باری بھی ہے۔ ''جہاں تم وہاں ہم'' بورنگ سا تھا (معذرت)۔ یسما عاصم، ماورا طلحہ اور فرح انیس نے بھی اچھا لکھا۔ ''کچن اور آپ'' میں اقرا امتیاز کے جوابات مختصر تھے مگر اچھے تھے۔ اور ڈیئر اقراء! ڈش کرنے پر شکریہ۔ فوزیہ ثمر اس دفعہ غائب تھیں؟

ج: تبسم جی! کرن کی کہانیوں کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ آپ قارئین کی پسندیدگی ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہے۔

نام پتا......نامعلوم

پہلی دفعہ خط لکھا تو شائع نہیں کیا آپ نے۔ کیا بات ہے؟ معیار کے مطابق نہیں تھا یا آپ صرف ان کے خط ہی شائع کرتے ہیں جو مستقل ہوں؟ کم از کم اتنا تو بتا دیں ''مقابل ہے آئینہ'' میں جوابات دوبارہ لکھ کر بھیجوں یا باری آنے پر شائع ہو جائیں گے؟ اور باری کب آئے گی؟ پلیز ضروری بتایئے گا۔ مہربانی ہوگی۔

''مقابل ہے آئینہ'' اچھی رہی ملاقات سفینہ جی سے۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' اچھی اسٹوری ہے۔ حمزہ پتا نہیں کیا کرنے جا رہا ہے اب۔ جلدی سے لاسٹ قسط کر دیں اب پلیز۔ ''چمکتا آسمان'' (صدف آصف) واقعی کچھ مائیں بہت ظالم ہوتی ہیں۔ میری آنکھوں دیکھی ہیں ایسی مائیں۔ اللہ ہدایت دے ایسوں کو۔ ''آس گلی'' نشا محسن علی پسند نہیں آئی۔ بورنگ ''راز'' نظیر فاطمہ واقعی پیسے کے لیے کوئی بھی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ رشتے کہاں [illegible] آج کل۔

''ساگر کنارے'' (ام طیفور) بہت بہت مزے کی اسٹوری ہے۔ بہت زیادہ مبارکباد اور تعریف۔ ماحور اور مومن کو ایک ہونا چاہیے۔

''تعویذ'' منعم ملک اچھی اسٹوری تھی۔ اعتدال میں رہے تو ٹھیک رہتا ہے سب۔

''صرف تم'' (انعم خان) بس سو سو تھی۔ اپنے حق کے لیے بولنا اچھا لگا رانیہ کا۔ مگر موضوع بھی پرانا تھا اور کہانی بھی۔ ''خوشیوں کی بہار'' (حنا اشرف) ہلکی پھلکی سٹوری اچھی رہی۔ غلط فہمی بہت مسائل جنم لیتی ہے۔ ''محبت کیمیاگر'' قرۃ العین خرم بس ٹھیک ہی تھا ناول۔ ''نازو'' مزمل سلیم ہاہاہا اب نازو ساری عمر روتی ہی رہے گی۔ ناشکری ''شام رنگ سیاہ'' ایمل رضا۔ آپ تو میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ بہت بہت عمدہ ناول ہے۔ باہر جا کر بین مصیبت میں پھنس جائے گی اور میران مدد کرے گا۔ آپ کا ناول ''پیال ساز'' ابھی تک یاد ہے۔ اتنا اچھا کیسے لکھ لیتی ہیں آپ؟ اللہ آپ کو اور زیادہ ترقی اور شہرت سے نوازے۔ (آمین)

''احساس برتری'' عندلیب زہرا۔ اچھی اسٹوری تھی۔ عمران بے چارہ ذہنی مریض ''شب نم کی سحر'' رخ چودھری شکر ہے اب کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ پہلے اتنے رشتے تھے کہ دھنیے کی چٹنی بن جاتی ہے۔ اب مزے کا ہو گیا ہے ناول۔

''کرن کتاب'' ساری کی ساری بہت اچھی رہی۔ بار ایک ویلوٹ کا گاؤن ہی بھیج دیں کراچی سے۔ ہاہاہا۔ یا پھر شال نئے سال کی خوشی میں۔

ج: کیا کہہ کر آپ کو مخاطب کروں آپ نے تو نام ہی نہیں لکھا۔ آپ کا نام معلوم ہو گا تو ''مقابل ہے آئینہ'' میں جگہ دی جائے گی۔ آپ کا یہ خط بھی ہمیں دیر سے موصول ہوا لیکن آپ کی فرمائش پر ہم نے اس محفل میں شامل کر دیا۔

طلعت ثنا......سیال شریف

کرن کی سالگرہ کی بہت بہت مبارک ہو۔ کرن پورا سال مجموعی طور پر بہت اچھا رہا۔ اب بات ہو جائے کرن کے اس ماہ کے شمارے کی۔ سب سے پہلے ''حمد و نعت'' سے دل و نظر کو سیراب کیا اور پھر بہنوں کی محفل نامے میرے نام کے بعد ''کچن اور آپ'' پر پہنچے تو دل چاہا اس میں مجھے بھی شرکت کرنی چاہیے آخر کو ہمارا اپنا کچن ہے لیکن پھر قلم کو روک لیا۔ دل کو سمجھا لیا یہ کرن والی جو باجی ہیں یہ ہمارے ساتھ ہمیشہ ناانصافی کر جاتی ہیں اتنی دفعہ ''مقابل ہے آئینہ'' بھیجا ہر دفعہ خوش ہو کے رسالہ کھولا لیکن نہیں کہیں نام نہ آیا۔

''مقابل ہے آئینہ'' میں صفیہ ناز کے جوابات کچھ بچکانہ اور کھرے لگے۔ گل رعنا سے ملنا اچھا لگا بہت اچھی اداکارہ ہیں تمام افسانے اور ناولٹ اچھے تھے مکمل ناول ابھی نہیں پڑھے۔ ''ابا کی صفیہ گل'' پر بہت غصہ بھی آیا آج کل کے دور میں کون ایسا ہوتا ہے اور مجھے اس وقت بہت غصہ آیا جب دیار غیر میں سے خود غرض لوگوں کو پیسے بھیجتی ہے اور اپنے لیے کافی پینے تک کے پیسے نہیں ہوتے آج کل ایسے لوگ کہاں ہیں بے وقوف سے۔

اور یہ بھی بتا دیں اگر ہم نے ''کرن کتاب'' کے سلسلوں میں شرکت کرنی ہے جیسے ''کچن اور آپ''، بیوٹی بکس وغیرہ تو ان کے لیے کیسے ایڈریس لکھنا ہے اور کیا ایک ہی لفافے میں تمام سلسلے ڈال سکتے ہیں ضرور بتائیں۔

ج: طلعت ثنا جی! آپ مقابل ہے آئینہ دوبارہ بھیجیں۔ ان شاء اللہ ضرور آپ کی خواہش پوری کریں گے۔ بعض اس لیے شامل نہیں کیے جاتے کہ انہوں نے جوابات مختصر دیے ہوتے ہیں۔ آپ اسی پتے پر ایک ہی لفافے میں سارے سلسلے بھیج سکتی ہیں۔

فاطمہ ناز......گجرانوالہ

آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں جنوری کا کرن میرے ہاتھ میں اور سب سے پہلے دوڑ لگائی ''نامے میرے نام'' میں تاکہ اپنا نام دیکھ سکوں لیکن ایسی قسمت کہاں کہ اتنی جلدی کوئی خواہش پوری ہو جائے۔ بے دلی سے سائیڈ پہ رکھ دیا اور پورا مہینہ بے قصور پریوں کے بھی خط نہ پڑھے اور مزے کی بات یہ ہے جب پڑھا تو خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ نامعلوم کے نام سے بے چاری بے خبری میں ماری فاطمہ ناز کا خط شائع ہو چکا ہے اور غصے سے خبر ہی نہیں لی۔ وہ تو خط پڑھ کر معلوم ہوا یہ تو میرا خط ہے خوشی خوشی امی کو بتایا اور مسکراہٹ ہی نہیں جا رہی بہت شکریہ آپ کا جناب۔ اب ہم ہر مہینے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے سمیرا احمید اور مصباح علی سید کہاں غائب ہیں۔ پلیز ان سے درخواست ہے کہ زبردست سا ناول لکھیں یہ میری سب سے زیادہ پسندیدہ رائٹر ہیں اس کے علاوہ نمرہ احمد، عمیرہ احمد، سعدیہ راجپوت، (گم شدہ) سائرہ رضا، ایمل رضا، صائمہ اکرم، عفت سحر طاہر، نعیمہ ناز اور نبیلہ عزیز میری موسٹ فیورٹ رائٹرز ہیں۔

"کرن کتاب" کا سرورق بہت بہت زبردست تھا۔ حمد، نعت کے بعد گل رعنا کو سرسری سا دیکھا کنزہ ہاشمی میری پسندیدہ ہے۔ پڑھ کر بہت مزا آیا۔ صفیہ ناز کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ حیرت بھی ہوئی کہ خود اتنی جھگڑالو اور لوگ جھگڑوں سے دور رہنے والے البتہ کتے پیچھے لگنے سے بہت ہنسی آئی۔ فرحت جبیں کا "غریب ایڈمن" ہم سب کے لیے بہت بڑا سبق تھا۔ تمام افسانے زبردست تھے۔ لیکن "محبت ایک وسیلہ ہے" سب پر بازی لے گیا محبت عبداللہ بہت ہلکا پھلکا لکھ رہی ہیں۔ اب آئے گا کہانی میں ٹوئسٹ "شب نم کی سحر" رخ چوہدری سلام ہے آپ کی ذہانت اور قابلیت کو جو اتنے کرداروں اور رشتوں کو لے کر چل رہی ہیں۔ "ساگر کنارے" اور "شام رنگ سیاہ" پر تبصرہ ادھار۔ کرن کے تمام سلسلے کمال کے ہوتے ہیں۔ "کرن کرن خوشبو" میرا سب سے پسندیدہ ہے۔ اور کرن کتاب کی تو کیا ہی بات ہے ایک کمی ہے پیغام کا سلسلہ بند کر کے آپ نے ہم جیسوں کے لیے بہت مشکل پیدا کر دی مدیرہ جی! پچھلے خط میں میرا جملہ کہ رسالے آخری سانس تک پڑھوں گی یہ امی جان کو پسند نہیں آیا بہت غصہ آیا اب آپ ہی بتائیے کہ ایسا کیوں ہوا میرے لیے۔

ج: فاطمہ جی! کرن سے آپ کی محبت دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ امی کی ناراضی کی وجہ یہ ہے کہ — انہوں نے سوچا ہوگا کہ بیٹی آخر وقت کلمہ پڑھنے کی دعا مانگے نہ کہ ڈائجسٹ لیکن ہمیں بہت اچھا لگا۔

فائزہ بھٹی..... پتوکی

ٹائٹل اچھا لگا، بالوں میں پھول لگا کر لڑکی شبو کا کردار بخوبی نبھا رہی تھی۔

فہرست پر نظر ڈالی۔ افسانوں کی لمبی چوڑی لائن کہا تھا اگر یہی لمبی لائن مکمل ناولز کی ہوتی تو مزا آجاتا۔ اب سالگرہ نمبر پر ہمیں مکمل ناول نمبر چاہیے۔

"ہوائیں رخ بدل گئیں" ریکا ہم تو اسی بات پر یقین رکھتے تھے کہ محبت میں محبوب کی خوشی دیکھی جاتی ہے نا کہ اپنی..... مگر تم نے تو ہمارے نظریے پر لات ماری ہے وہ بھی خاصی زور سے۔

"شب نم کی سحر" کرن کی سب سے ماٹھی کہانی..... جسے پڑھو یا چھوڑ دو کوئی افسوس نہیں ہوتا..... ہر انسان پہلے ہی اپنے اپنے مسئلوں میں الجھا ہوا ہے اوپر سے یہ کہانی رہی سہی کسر پوری کر جاتی ہے۔

رخ چوہدری کو چاہیے۔ جتنی جلدی ہو اسے "ختم شد" کی فہرست میں ڈال دیں۔ "ساگر کنارے" پورے کرن کی جان ہے یہ کہانی۔ پڑھ کر مزا آجاتا ہے۔ ساری کزنز میں یہ کہانی مشہور ہو گئی ہے۔ مومن تم تو ہارٹ فیورٹ بنتے جاتے ہو۔ تم اتنے اچھے لگتے تو نہ تھے..... ہر فن مولا ہو تم۔ اب ذرا اپنے باس سے اپنی ماحور کو بچا کر رکھنا ہم نے سنا ہے "جو اچھی چیز ہوتی ہے وہ ہمیشہ کھو ہی جاتی ہے"

"شام رنگ سیاہ" ایمل رضا بھی اپنے ناول کے ساتھ خوب انصاف کر رہی ہیں۔

سبین جلد ہی تم منہ کے بل گرنے والی ہو۔ مجھے خطرہ ہے کہیں میران کو بھی اپنے ساتھ نہ لے ڈوبنا..... اور ویسے سبین بندہ کام اچھے طریقے سے نہ کرے مگر دعا تو اچھے سے مانگ لے۔ اب جو تم نے دعا مانگی ہے۔ اس کی کوئی تک بنتی تھی بھلا..... اب بھگتنا خود ہی، مجھے تو لگتا ہے۔ اس کالے دھندے کا جو سربراہ ہے وہ اس سبین بی بی پر لٹو ہو جائے گا۔ بس پھر رقیب روسیاہ کہانی میں آجائے تو ہیرو کا ستیاناس مار دیتا ہے۔

میران ہمیں بھی یقین ہے کہ تمہارا ابا زندہ ہوگا "عشق آتش" پڑھنی شروع کی ہے مگر ختم نہیں کر سکی۔ جتنی پڑھ چکی ہوں اتنی کہانی نے تو مزا دیا ہے اب آگے کا پتا نہیں مگر امید ہے بور نہیں کرے گی۔

منشا محسن بہت معذرت کہ میں تمہاری کہانی نہیں پڑھ سکی۔ اور اب اس پر تبصرہ نہ کر سکوں گی۔ جس کا مجھے خود بھی افسوس ہے۔

"مقابل ہے آئینہ" صفیہ ناز تمہیں پڑھ کر اچھا لگا۔ جیتی رہو آباد رہو۔ "نامے میرے نام" صائمہ مشتاق کو عرصے بعد دیکھ کر اچھا لگا۔ جیو ہزاروں سال۔

"پچن اور آپ" اقرا ممتاز آخر تم بھی نمبر لے ہی گئیں۔ مکھڈی حلوہ پوری امی کے ہاتھ کی بھی بہت مشہور ریسپی ہے۔ باقی کسی کو نہیں پڑھا۔

ج: فائزہ جی! آپ کے توسط سے تمام بہنوں سے گزارش ہے کہ کہانی کے بارے میں فون کر کے معلوم کیجیے۔

☆☆

# روغنِ ارجن...... لیکویڈ گولڈ

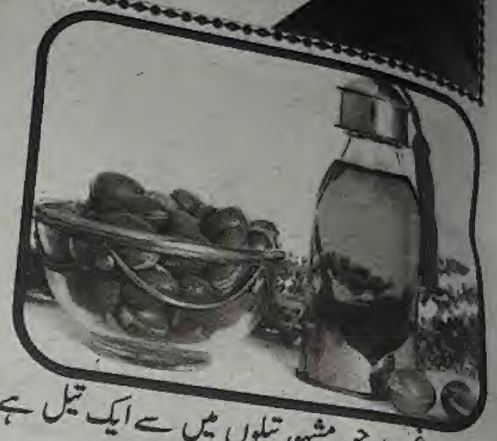



روغن ارجن مشہور تیلوں میں سے ایک تیل ہے جس میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں فوائد موجود ہیں۔ وہ لوگ جو قدرتی چیزوں اور ان کے جادوئی فوائد کے بارے میں جانتے ہیں وہ اسے ''لیکویڈ گولڈ'' کہتے ہیں۔ روغن ارجن انگریزی زبان میں ''آرگن آئل'' کہلاتا ہے اس کے ایک سے زیادہ فوائد کی وجہ سے جو یہ بالوں، جلد اور انسانی جسم کو فراہم کرتا ہے۔ مراکش میں وسیع پیمانے پر مختلف آرائش حسن کی اشیاء میں استعمال کیا جارہا ہے۔ روغن ارجن مختلف امراض میں دوا کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ روغن ارجن ایک نامیاتی مصنوعات ہے جو ارجن کے درخت کے پھل کے بیج سے کشید کیا جاتا ہے۔ اس تیل میں وٹامن اے، سی اور ای پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اینٹی آکسیڈنٹ، لینولک ایسڈ اور اومیگا۔6 فیٹی ایسڈ بھی شامل ہوتے ہیں۔

**اسکن موئسچرائزر:۔** روغن ارجن موسم سرما میں خشک جلد کو نمی فراہم کرتا ہے اور آسانی سے جذب ہوجاتا ہے۔ اس تیل میں شامل وٹامن ای اور فیٹی ایسڈ چہرے کو قدرتی حسن فراہم کرتے ہیں اور عمر کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکتے ہیں اور چہرے کی جھریوں کو ختم کرتے ہیں۔

اپنی ہتھیلی پر ایک قطرہ تیل کا لیں اور چہرے پر لگائیں، چہرہ نرم اور ہموار ہوجائے گا۔

**اسکن ٹونر:۔** اسکن کی دیکھ بھال کے لیے اسکن ٹوننگ ایک اہم اقدام ہے۔ اپنے ٹونر میں روغن ارجن کے دو سے چار قطرے ڈال کر استعمال کیجیے۔ اسکن ٹونر آپ خود بھی بنا سکتی ہیں۔ ایک گرین ٹی بیگ پر ابلا ہوا پانی ڈالیں اور سات سے دس منٹ کے بعد ٹی بیگ کو نکال لیں۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد اس میں کوئی Essential Oil (نباتاتی تیل) مثلاً ٹی ٹری آئل کے دو سے چار قطرے ڈال لیں اور دو، چار قطرے روغن ارجن کے شامل کرلیں اور ایک بند جار میں محفوظ کرلیں۔ صبح اور رات کو کلینزنگ اور موئسچرائزنگ کے بعد استعمال کریں۔

**ایکسفولی ایشن (Exfoliation):۔** روغن ارجن ایکسفولی ایشن کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے بطور فیشل اسکرب استعمال کیجیے۔ ایک کھانے کا چمچہ گڑ کی شکر میں چند قطرے روغن ارجن کے شامل کرکے چہرے پر لگائیں اور دو چار منٹ تک چہرے کو آہستہ آہستہ رگڑیں اور پھر گرم پانی سے دھولیں۔ آپ

اسے کہنی پر اور ہوم پیڈی کیور میں بھی استعمال کرسکتی ہیں۔

**مہاسوں کا علاج:۔** مہاسے اکثر جلد پر چکنائی کی وجہ سے ہوتے ہیں کیونکہ روغن ارجن چکنائی سے مبرا ہوتا ہے تو جلد کو قدرتی نمی فراہم کرتا ہے۔ اس میں شامل اینٹی آکسیڈنٹ اور لینولک ایسڈ جلد کے خلیوں کو شفا دینے اور کیل مہاسوں کی سوزش کو ختم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

**لپ کنڈیشنر:۔** روغن ارجن بہتر بام ہے ہونٹوں کے لیے۔ یہ چیپ اسٹک کا بہترین نعم البدل ہے۔ ایک سے دو قطرے ہونٹوں پر مل کر زائد تیل صاف کردیں۔ نتیجتاً یہ پھٹے اور زخمی ہونٹوں کے زخموں کو مندمل کرے گا بلکہ ہونٹوں کو نرم اور ہموار بھی بنائے گا۔

**پھٹی ایڑیاں:۔** اگر آپ کے پاؤں اور ایڑیاں سردی سے متاثر ہورہی ہوں تو انہیں نرم و ملائم اور ہموار بنانے کے لیے دو سے چار قطرے ارجن کا تیل لے کر متاثرہ پاؤں یا ایڑیوں پر ملیں اور ان پر موزہ پہن ... تیل کو پاؤں میں جذب ہونے دیں، بعد ازاں ... کردیں۔ موسم سرما میں بھی آپ کے پاؤں نرم و ملائم رہیں گے اور ایڑیاں بھی پھٹنے سے محفوظ رہیں گے۔

**بالوں کی خشکی اور چمک:۔** روغن ارجن نہ صرف جلد کے لیے بلکہ بالوں کے لیے بھی نہایت مفید پایا گیا ہے۔ ارجن کے تیل کا اگر دو مرتبہ بالوں میں ہفتہ میں ایک بار مساج کی صورت میں استعمال کیا جائے اور رات بھر تیل بالوں میں لگا رہنے دیا جائے تو بال آہستہ آہستہ صحت مند ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور ان میں خشکی ختم ہوجاتی ہے۔ روغن ارجن کیونکہ چکنائی سے مبرا ہوتا ہے، بالوں میں چمک پیدا کرنے کے لیے آپ اسے لگا سکتے ہیں، بال چکنے محسوس نہیں ہوں گے۔

**پریگننسی کے نشانات:۔** بچے کی ولادت کے بعد پیٹ اور ٹانگوں پر پڑنے والے نشانات کو صاف کرنے کے لیے ارجن کے تیل کے دو سے تین قطرے ہتھیلی پر اچھی طرح مل لیں اور نہایت آہستگی سے ان نشانات پر مل لیں۔ تیل میں شامل وٹامن اے اور ای جلد کو نرم و ملائم اور نشانات کو مدھم کردیں گے۔ زیادہ گہرے اور پرانے نشانات کو مدھم کرنے کے لیے تیل میں گڑ کی شکر ملا کر نشانات پر ملیں، نتائج سے آپ خوش ہوجائیں گے۔



اس ماہ کا پھل

# بیر......!!
## پاکستانی سیب

بہار کا موسم شروع ہوتے ہی بازار میں لال سنہرے بیر آنا شروع ہوجاتے ہیں، ان کھٹے میٹھے بیروں کو دیکھ کر ہر شخص کے منہ میں پانی بھر آتا ہے جس نے کبھی ان کا ذائقہ چکھا ہو۔ عمدہ بیر کو "پاکستانی سیب" بھی کہتے ہیں۔ بیر میں کیلشیم، فاسفورس اور فولاد کے علاوہ حیاتین الف، ب اور ج کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ اس میں گلوکوز بھی ہوتا ہے۔ بیر کی تین اقسام ہیں۔ تخمی، پیوندی اور جھڑ بیری۔ پہلی دو قسمیں باغی کہلاتی ہیں اور تیسری قسم کو ضال کہتے ہیں۔

تخمی بیر کی شکل گول ہوتی ہے، ان کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ ان کا ذائقہ کھٹا میٹھا ہوتا ہے۔ پیوندی بیر اوپر سے سبز ہوتے ہیں اور ان کا گودا سفید ہوتا ہے۔ اس بیر کی شکل لمبوتری اور لمبائی ایک سے دو انچ تک ہوتی ہے۔ یہ بیر بڑے خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ جھڑ بیری بیر بہت چھوٹے ہوتے ہیں، ان میں ترشی ہوتی ہے اور یہ پہاڑی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

بیر کے بے شمار فوائد ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے۔

- بیر دیر ہضم ہوتا ہے۔
- صفرا اور خون کے جوش کو تسکین دیتا ہے۔
- پیاس بجھاتا ہے۔
- گرم مزاجوں کے لیے نہایت موافق ہے۔
- بیر کی لکڑی کا برادہ خون کے بہنے کو بند کرنے کے لیے انتہائی مفید ہوتا ہے۔

❖ اس کا پانی جگر کا سدہ کھولتا ہے۔
❖ بیر کا استعمال آنتوں اور معدہ کے کیڑوں کو مارتا ہے۔
❖ اس کے پتوں کا ورم پر لیپ مفید ہوتا ہے۔
❖ اس کو بھون کر دست اور پیچش میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پیچش اور مروڑ کے فوری علاج کے لیے جنگلی بیر کی جڑ ایک تولہ، کالی مرچ سات عدد پانی میں گھوٹ کر دن میں تین بار پلانا مفید ہوتا ہے۔ خشک بیر قابض ہوتا ہے اس سے بھی دست بند ہو جاتے ہیں۔
❖ بیر کے استعمال سے خون صاف ہو جاتا ہے اور اس کے زہریلے مادے خارج ہو جاتے ہیں۔
❖ پیٹانی بڑھاتا ہے۔
❖ بیر کے پتے (ایک چھٹانک) ڈیڑھ سیر پانی میں جوش دے کر ٹھنڈا کر کے سر دھونے سے بخار کی شدت، سر درد اور سرسام میں مفید ہے۔
❖ بیر کی راکھ موٹاپا کم کرنے کی بہترین دوا ہے۔ بیر کی راکھ ڈیڑھ ماشہ بارہ روز تک روزانہ دن میں کسی بھی ہمراہ پانچ تولے عرق بادیان (سونف) استعمال کریں۔ صبح ناشتا کے ایک گھنٹے بعد اس کا استعمال نہایت مفید ہے۔

❖ بیر کا گوند خشک کھانسی میں پھیپھڑوں کے لیے مفید ہے اور بلغم رقیق کرتا ہے۔
❖ بلڈ پریشر کو دور کرنے کے لیے برادہ صندل سفید، خشک دھنیا، چوب چینی تینوں ہم وزن لے کر سفوف بنا لیں۔ تین ماشہ سفوف بکری کے دودھ کے ساتھ کھائیں۔ اس کے ساتھ ہی ترش بیری کے پتے ایک تولہ صبح پانی میں بھگو کر شام کو مل کر چھان کر پئیں، انتہائی مفید ہے۔
❖ بیر وٹامن بی کمپلیکس کا خزانہ ہے، اس میں وٹامن اے، بی اور سی ہوتے ہیں۔
❖ اگر کسی کا دل گھبراہٹ سے ڈوب رہا ہے تو چار دانے بیر کھلانے سے ٹھیک ہو جائے گا۔
❖ بیر کی جڑ کا چھلکا چھ تولے ایک پاؤ پانی میں اچھی طرح جوش دیں، اب چھان کر چینی ملا کر چند روز تک پلائیں۔ اس سے بدن موٹا ہو جاتا ہے اور چہرے کا رنگ نکھر آتا ہے، بچوں کے لیے مفید نسخہ ہے۔
❖ بار بار پیشاب آنے کی صورت میں کچے بیر یا گٹھلی چند روز تک کھانا انتہائی مفید ہے۔
❖ تلی کی بیماری میں بیری کے پتے تین کلو پانی میں جوش دیں۔ جب ایک کلو رہ جائے تو چھان کر روزانہ پانچ تولہ پانی استعمال کرنا مفید ہوتا ہے۔
❖ ضعف جگر میں بیری کی جڑ اچھی طرح دھو کر پانی میں جوش دیں پھر چھان کر چینی ملا کر دوبارہ آگ پر رکھیں اور شربت تیار کریں، دو چمچے صبح و شام پینا مفید ہے۔
❖ اعصابی تھکن، کمر کی مضبوطی، بھوک کی زیادتی اور جوڑوں کے درد میں بیری کی جڑ کو صاف کر کے پانی میں جوش دیں۔ جب تیسرا حصہ رہ جائے تو اس کو چھان کر چینی ملا کر شربت بنا لیں۔ یہ شربت جوش دے کر نہیں بنانا بلکہ صاف چینی ملا کر رکھ لینا ہوتا ہے۔
❖ بیر کی گٹھلی پیس کر ٹوٹی ہوئی ہڈی کے مقام پر لگانے سے ہڈی جڑ جاتی ہے۔
❖ بواسیر کے مقام پر بیری کے درخت کی جڑ پانی میں پیس کر لیپ کرنا مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جڑ کو پیس کر جگر کے مقام پر مقامی طور پر لیپ کرنے سے بڑھا ہوا جگر کم ہو جاتا ہے۔
❖ اس کے پتوں کا جوشاندہ بنا کر اس سے سر دھونے سے بال مضبوط ہوتے ہیں اور گرنے بند ہو جاتے ہیں۔ ☆☆

کرن کتاب



نفسیاتی اور معاشرتی مسائل

# خود اعتمادی بنائے پرسنالٹی

اس دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جسے کہ اپنے آئندہ حالات کے متعلق کوئی نہ کوئی اندیشہ یا فکر لاحق نہ ہو۔ صرف سوال یہ ہے کہ ہم سب لوگ اس دنیا کے تلخ حقائق سے دوچار ہونے کے بعد بھی اپنے اندیشوں اور فکروں کو کس حد تک روکے رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے کاموں میں حارج نہ ہوں۔ اندیشے اور افکار تو ہر انسان کی زندگی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ان سے کسی کو بھی مفر نہیں ہو سکتا..... البتہ ہم انہیں کسی نہ کسی حد تک کم ضرور کر سکتے ہیں۔ اندیشوں اور افکار کو کم کرنے سے ہماری تعمیری صلاحیتیں ابھریں گی اور کام میں جی لگے گا لیکن اگر ہم اپنے افکار اور اندیشوں کو اپنے اوپر غالب رکھیں گے تو پھر ہم اپنے ضروری کام پوری تن دہی سے ہرگز نہ کر سکیں گے۔

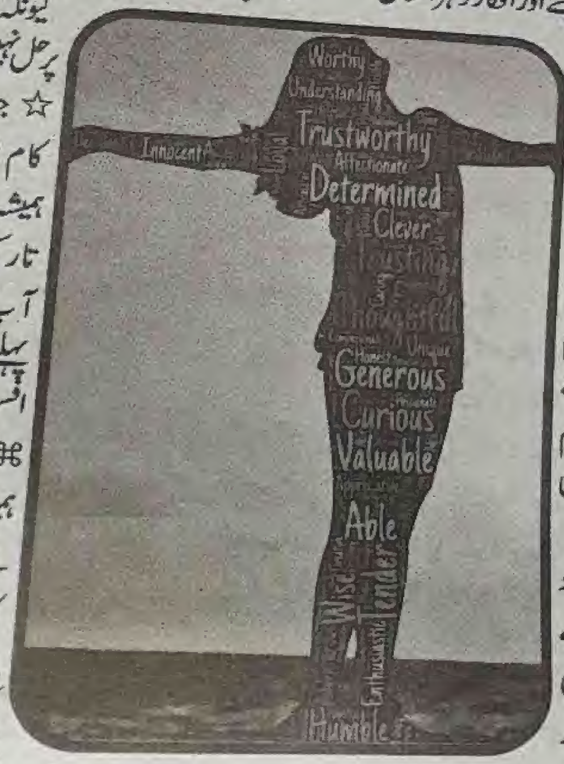


یہاں ہم آپ کو خود اعتمادی کو مستحکم کرنے کے لیے کچھ طریقے بتاتے ہیں جن پر عمل کر کے آپ اپنی تفکرات اور اندیشوں کو بہت حد تک کم کر سکتے ہیں اور اپنی تعمیری صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے بہت سے مسائل خود بخود حل کر سکتے ہیں۔

☆ آپ اپنی راہ میں پیدا شدہ کسی قسم کی بھی رکاوٹ پر اپنی تمام تر توجہ کو مبذول کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس قدر زیادہ اس کا خیال کرتے ہیں۔ اسی قدر رکاوٹ آپ کو زیادہ سے زیادہ بڑی محسوس ہونے لگتی ہے۔

⌘ آپ اپنی کسی رکاوٹ یا مشکل پر زیادہ توجہ دینے کی نسبت اسے جلد از جلد دور کرنے کے وسائل پر غور کرنے کی کوشش کریں اور اپنی اس صلاحیت کو استعمال کریں جس سے مسائل کے حل کرنے میں مدد ملتی ہے لیکن اپنے مسائل کے مکمل طور پر حل کی کبھی توقع نہ رکھیں کیونکہ اکثر مسائل کامل طور پر حل نہیں کیے جا سکتے۔

☆ جب آپ اپنا کوئی نیا کام شروع کرتے ہیں تو ہمیشہ آپ کی نظر اس کے تاریک پہلو پر ہوتی ہے اور آپ اس کام کو کرنے سے پہلے ہی اس کی ناکامی پر افسوس کرنے لگتے ہیں۔

⌘ اس قسم کی وہمی ذہنیت ہمیشہ ناکامیوں کو دعوت دیتی ہے۔ جب آپ اپنا کوئی نیا کام شروع کریں تو ہمیشہ ہر بات کے روشن پہلو کو مدنظر رکھیں اور بہتر امیدیں اور توقعات قائم کریں کیونکہ ہماری یہ دنیا اچھی امیدوں پر ہی قائم ہے۔ اگر ہر شخص ہمیشہ تاریک پہلوؤں پر غور کرے تو اس دنیا کا سارا کاروبار تلپٹ ہو جائے۔

☆ آپ ہمیشہ کچھ کہتے یا کرتے وقت جھجک محسوس کرتے ہیں؟

⌘ جھجک صرف اس لیے ہے کہ آپ خود کو دوسروں

کرن کتاب

سے گرا ہوا خیال کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنے احساسِ کمتری پر غالب آجائیں تو آپ کی یہ جھجک دور ہوسکتی ہے۔

☆ جب آپ اپنا کوئی کام نہایت بہتر طور پر انجام دیتے ہیں اس وقت بھی آپ اپنے اس کام سے مطمئن نہیں ہوتے کیونکہ آپ یہ سوچتے ہیں کہ وہ آپ کی توقعات کے مطابق بہتر طور پر انجام نہیں پاسکا ہے۔

⌘ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگ نفسیاتی زبان میں Perfectionists کہلاتے ہیں جو کہ کبھی اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوسکتے۔ اس قسم کے لوگوں کو یہ بات خاص طور پر جاننا چاہیے کہ اگر وہ ہمیشہ اپنا ہر کام نہایت بہتر اور اچھا ہی کرتے رہیں گے تو ان کے لیے سب سے مناسب جگہ ایک میوزیم ہی ہوسکتی ہے کیونکہ کوئی شخص اس بات کا دعوا نہیں کرسکتا کہ اس کے کام ہمیشہ ہر طرح کے نقائص سے پاک ہوتے ہیں۔

☆ آپ اپنی بدصورتی یا کسی جسمانی عیب کی وجہ سے خود الگ تھلگ اور دوسرے لوگوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں جو لوگ اپنے عیوب اور خامیوں پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں، ان میں آخر کار احساسِ کمتری پیدا ہوجاتا ہے۔

⌘ آپ اپنے عیوب کو بہت زیادہ سمجھتے ہیں حالانکہ اگر آپ دوسرے لوگوں کو بغور دیکھیں تو ان میں بھی آپ کو عیب ملیں گے۔ آپ اپنے جسمانی عیوب اور خامیوں کا بدل اپنی دوسری خوبیوں کے ذریعے کرسکتے ہیں۔

آپ ہر کام کی خرابی کا سبب خود اپنی ذات کو گردانتے ہیں؟

⌘ بعض لوگوں میں یہ احساس بڑا شدید ہوتا ہے۔ یہ بھی احساسِ کمتری کی ایک شکل ہے۔ بعض حالات یقیناً آپ کے قابو یا دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ خود اپنے آپ پر الزام عائد کرنے سے کوئی بگڑا ہوا کام نہیں بنا کرتا۔ اس قسم کے شدید احساسات کہ آپ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں، وہ خراب ہوجاتا ہے۔ آپ کے اچھے خاصے کاموں کو بھی خراب کردینے کا باعث ہوتے ہیں۔ کوئی کام کرتے وقت اپنے دل و دماغ سے اس قسم کے خیالات اور احساسات مطلق نکال دیں اور ہمیشہ اس یقین کے ساتھ اپنے کام کریں کہ وہ بحسن و خوبی انجام پائیں گے۔

☆ آپ اکثر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی زیادتیوں کے شاکی رہتے ہیں اور انہیں پسند نہیں کرتے ہیں۔ اپنی ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار بھی کھلے بندوں نہیں کرتے اور اس طرح آپ اپنی خود اذیتی میں اور اضافہ کرلیتے ہیں؟

⌘ آپ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو ضرورت سے زیادہ اپنے آپ سے وابستہ کیوں سمجھتے ہیں۔ آپ کے عزیز اور رشتہ دار بھی آخر آدمی ہیں۔ ہر انسان اپنی عادات و اطوار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ سگے بھائی بھی بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اس لیے ہر شخص کو دنیا میں یاروں، دوستوں اور احباب کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ طبائع اور عادات میں کچھ نہ کچھ یکسانیت رکھتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ جس طرح دوستوں سے تعلقات استوار رکھنے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح رشتہ داروں سے بھی تعلقات کو استوار کرنے میں احتیاط سے کام لیں۔ اعزہ سے آپ کو صرف اس لیے شکایت ہوا کرتی ہے کہ وہ آپ کے عزیز ہیں غیر نہیں۔ اگر آپ انہیں بھی دنیا کے دوسرے لوگوں میں شمار کریں تو شاید آپ اس قدر ذہنی کوفت میں مبتلا نہ ہوں۔ اپنے تعلقات میں درمیانہ روی سے کام لیں۔ جب آپ اپنوں سے تعلقات قائم نہیں رکھ سکتے تو دوسروں کے ساتھ کیونکر قائم رکھ سکتے ہیں۔

☆ آپ اکثر اپنے کاموں کو ملتوی کرنے کے عادی ہیں، جب اس کام کے کرنے کا مناسب وقت نکلنے لگتا ہے تو آپ اپنے اس ٹالے ہوئے کام کو جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح اسے خراب کردیتے ہیں۔

⌘ جو کام کرنا ہو، اسے ہمیشہ مناسب وقت پر کیجیے کیونکہ ملتوی کرنے اور ٹالنے سے وہ کام زیادہ سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہوتا جائے گا اور آپ اسے کبھی بخوبی انجام نہ دے سکیں گے۔



صحت

# دمہ..... ایک موروثی مرض

دراصل دمہ (Asthma) سانس کی بیماری ہوتی ہے جس میں فضائی آلودگی یا پھیپھڑوں کی خرابی کی وجہ سے سانس لینے کا عمل بری طرح متاثر ہوجاتا ہے۔

اس مرض کی علامات میں سانس کا رک رک کر آنا، سینے کی جکڑن اور ہلکی سی فضائی آلودگی سے بھی زوردار کھانسی کا ہونا شامل ہے۔ اس کا دورہ اکثر رات کو ہی شدت پکڑتا ہے۔ دمہ کی تکلیف سردیوں میں بڑھ سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس میں سانس کی نالیاں متاثر ہوتی ہیں۔ ان کے پٹھے سخت ہوجاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں سانس کی نالیاں تنگ بھی ہوجاتی ہیں۔ دمہ ایک موروثی مرض بھی ہے اور اس کے مرض پر مکمل شفا پانا ممکن نہیں ہے لیکن مناسب ادویات کے استعمال سے اس پر مکمل طور پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

## اسباب اور بچاؤ کی تدبیریں

دمہ کے دورے کے اسباب مختلف ہوسکتے ہیں۔ بعض لوگوں کو ٹھنڈی ہوا، دھواں، گھریلو گرد و غبار میں موجود بیکٹیریا، یہاں تک کہ جذبات میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے بھی یہ دورے پڑسکتے ہیں۔ دمہ کی محرک بننے والی بعض چیزیں واضح ہوتی ہیں مثلاً سگریٹ کا دھواں، مخصوص غذائی اشیاء یا کیمیکلز جبکہ بعض غیر واضح چیزیں بھی اس دورے کا سبب بن سکتی ہیں مثلاً ٹھنڈی ہوا، ورزش اور جذبات میں تبدیلی۔ دمہ کے اکثر مریضوں کو دورے اس وقت پڑتے ہیں جب ایک سے زیادہ محرک اشیاء ان میں ملوث ہوں مثلاً اگر کوئی مخصوص غذاؤں سے حساسیت رکھتا ہے اور وہ ان غذاؤں کے ساتھ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرے ماحول میں سانس لے تو ایسی صورت میں اس کے دورے میں مبتلا ہونے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ ان محرک اشیاء کو پہچاننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک ڈائری ساتھ رکھیں اور اس میں اپنی علامتیں مثلاً کھانسی، سینے سے سیٹی جیسی آواز کا اخراج اور سانس لینے میں دشواری وغیرہ درج کرتے جائیں۔ اگر ان حالات میں آپ ٹریفک کے آلودہ ماحول میں سانس لیں یا دو مختلف موسمی حالات کا سامنا کریں یا آپ کو نزلہ، زکام اور کھانسی کی شکایت ہو تو یہ دیکھیں کہ ان میں سے وہ کون سی چیز ہے جس نے آپ کو دورے میں مبتلا کیا ہے۔ اپنے ان نوٹس کو ڈاکٹروں کو دکھا کر بھی ان سے مشورے لے سکتے ہیں۔ اگر مریض کو کسی الرجی کی وجہ سے دمہ کی شکایت ہوتی ہے تو خصوصی ٹیسٹ کے ذریعے وہ اس الرجی کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتا ہے اور بعض میں الرجی کا سبب بننے والی اشیاء سے پرہیز کرکے دورے سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ دمے کے مریضوں کو دورے سے بچاؤ کے لیے جو دوائیں تجویز کی جاتی ہیں انہیں کبھی بھی ترک نہیں کرنا چاہیے۔

دمے پر مکمل قابو پانے کا مطلب ہے کہ.....

☆ جب دمے کا حملہ نہیں ہوتا تو رات کے وقت جاگنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

☆ ہنگامی حالت میں ہسپتال جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

☆ پھیپھڑے ہر وقت معمول کے مطابق کام کرتے رہتے ہیں۔

☆ روزمرہ کی سرگرمیوں میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

باغبانی

# گھر میں مشکل نہیں سبزیاں اُگانا

سبزیاں وہ غذائی خزانہ ہیں جو قدرت نے ہمیں وافر مقدار میں عطا فرمایا ہے۔ سبزیاں جہاں دیکھنے میں خوش نما اور دل فریب نظر آتی ہیں، وہیں انسانی صحت کے لیے ہی بہت فائدہ مند ہیں۔

سبزیاں اگانا ایک دلچسپ مشغلہ ہے، ساتھ میں آپ کو یہ طمانیت بھرا احساس بھی ہوتا ہے کہ آپ تازہ



سبزیاں اپنے ہاتھوں سے توڑ کر پکا رہی ہیں۔ محض تھوڑی سی محنت سے آپ روزانہ تازہ سبزیاں پکا کر سبزیوں کے اصل مزے اور ذائقے سے لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔

مہنگائی کے اس دور میں سبزیاں اگانے سے پیسوں کی بھی بچت ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سبزیاں اگانے سے گھر خوب صورت اور دلکش نظر آنے لگتا ہے اور

اگر آپ کا سبزیوں کا باغیچہ کچن کے پاس ہو تو نا صرف اس کی دیکھ بھال میں آسانی ہوتی ہے بلکہ فالتو پانی پودوں میں ڈال کر ہم پانی کی بچت بھی کر سکتے ہیں۔

گھر میں سبزیاں اگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ سبزیاں اگانے کے لیے آپ کے گھر میں زمین کا ٹکڑا موجود ہو بلکہ آپ با آسانی گملوں، لکڑی کی پیٹیوں، ہانڈیوں اور دیگر کھلے منہ والے گہرے برتنوں میں بھی لگا سکتے ہیں اور اگر گھر میں جگہ کی کمی ہے تو فکر کی کوئی بات نہیں، ہانڈیوں اور گملوں کو لٹکا کر بھی آپ سبزیاں اگانے کا شوق پورا کر سکتی ہیں۔ اس میں توری، کریلے، ہری مرچیں، دھنیا، ٹماٹر پودینہ وغیرہ لگا سکتی ہیں۔



سبزیاں اگاتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔ سب سے پہلے یہ کہ جہاں سبزیاں لگائی ہوں وہاں روشنی اور دھوپ کا مناسب انتظام ہو تاکہ ان کی بہتر نشوونما ہو، پودوں کو سخت دھوپ اور سردی سے بچایا جائے۔ دوپہر کے وقت پودوں کو پانی نہ دیا جائے۔ پودوں کو پانی دینے کے مناسب اوقات صبح اور شام ہیں۔ پودوں کی صفائی کا خاص خیال رکھیں، غیر ضروری گھاس پھونس کو فوراً صاف کر دینا چاہیے۔ اسی طرح بیمار پودے کو فوراً دوسرے پودوں سے الگ کر دیں۔

سبزیاں اگانے سے پہلے ہمیں ان کے صحیح وقت اور موسم کا علم ہونا چاہیے۔ پودے لگانے کا بہترین وقت اور موسم، برسات کے آغاز سے کچھ عرصہ قبل ہے۔ اس لحاظ سے ملک کے بیشتر حصوں میں جون، جولائی، اگست کا مہینہ بہتر ہے تاکہ تیز بارش کے باعث پودے جڑ سے اکھڑ نہ جائے۔ برسات اور جاڑے کے ابتدائی دنوں میں پتوں والی سبزیاں اگانا زیادہ بہتر ہے۔ بعض سبزیاں بیج بونے سے اور بعض پنیری لگانے سے حاصل ہوتی ہیں۔

پنیری لگانے کا یہ طریقہ ہے کہ تمام بیج ایک گملے اور چھوٹی جگہ پر بوئے جاتے ہیں۔ جب وہ پودے نکل کر ذرا بڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں اکھاڑ کر دوسری جگہ لگایا جاتا ہے۔

اگر آپ پہلی مرتبہ گھر میں سبزیاں اگا رہی ہیں تو وہ سبزیاں اگائیں جو آسانی سے اگ آئیں۔ مثلاً بھنڈی، بینگن، ٹماٹر اور ہری مرچیں وغیرہ۔ یہ نا صرف جلدی اگتی ہیں بلکہ پیداوار بھی زیادہ دیتی ہیں۔

ہری مرچوں کی پنیری مئی کے مہینے میں بوئی جاتی ہے اور اسے ہفتے میں صرف ایک دن پانی دینا کافی ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹماٹر اور بینگن کا مہینہ جولائی ہے۔ ان کی بھی پنیری لگائی جاتی ہے ان کو لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ جب پھل نکل آتے ہیں تو پودا ان کا وزن سہار نہیں سکتا، اس لیے ضروری ہے کہ اسے لکڑی کا سہارا دیں۔

گاجر اور مولی بونے کا وقت اگست سے اکتوبر تک ہوتا ہے۔ پالک بھی اکتوبر کے مہینے میں بوئی جاتی ہے۔ پیاز اگست سے نومبر تک لگائی جاتی ہے، اس میں زیادہ پانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چقندر ستمبر کے مہینے میں بوئے جاتے ہیں، ان کو بھی بہت کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہری مرچیں، ہرا دھنیا، پودینہ ہر موسم میں لگائے جا سکتے ہیں۔ بوئے جانے والے پودوں کا انتخاب مختلف علاقوں میں مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً اکثر علاقوں میں کیلے، ناریل، آم، پپیتہ، ہری مرچ، ٹماٹر اور بینگن کی کاشت بہت اچھا پھل دیتی ہے، اسی طرح چولائی کا ساگ اور پالک پتوں والی سبزیاں ہیں، جو ہری مرچوں، ٹماٹر اور بینگن کے ساتھ بڑی آسانی سے اگ آتی ہیں اور بوقت ضرورت آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

# کچن سے متعلق اقصیٰ ماہ نور کے دلچسپ جوابات

کچن اور آپ

س: ''آپ کیا سمجھتی ہیں، کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟''

ج: ''میرے خیال میں تو جناب جینے کے لیے ہی کھایا جاتا ہے۔''

س: ''گھر کے کام کاج خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے؟ یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان سے دور رکھتا ہے؟''

ج: ''بالکل جی، کچن سے دلچسپی ہے۔ مجھے کچن صاف رکھنے اور سجانے کا بہت شوق ہے اور زیادہ وقت تو کچن میں ہی گزرتا ہے۔ کبھی کچن کی صفائی اور کبھی نئی نئی ڈشوں کی ٹرائی اور میری بڑی آپی (الفت زہرہ) شعاع اور کرن سے کھانوں کی ترکیب دیکھ کر بناتی ہیں۔

س: ''ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا مزے دار بنے، کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والوں کے کیا تبصرے ہوتے ہیں؟''

ج: ''میرے ساتھ تو اکثر ہو جاتا ہے کہ پکاتی کچھ ہوں اور بن کچھ جاتا ہے۔ کبھی پانی زیادہ ڈال دیتی ہوں، کبھی مرچ ڈالنا بھول جاتی ہوں اور کبھی سالن جل جاتا ہے لیکن آپی پھر کوئی نہ کوئی حل نکال لیتی ہیں۔''

س: ''کون سی رائٹر کو پڑھتے ہوئے کھانا دھواں ہوا؟ اس کے متعلق کوئی یادگار واقعہ؟''

ج: ''اکثر کرن اور شعاع کو پڑھتے ہوئے کوئی نہ کوئی سانحہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ تو حد ہو گئی، مریم جہانگیر کا ناول ''رحرحب'' پڑھتے ہوئے پلاؤ جلا بیٹھی۔ ہوا کچھ یوں کہ چاولوں کو دم پر لگا کے کمرے میں آ کر رسالہ پڑھنے بیٹھ گئی اور چاولوں کو بھول گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب جلنے کی بو پھیلی گھر میں تو پھر بھاگی کچن میں لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئی کھیت۔ نیچے سے سارے چاول جل گئے تھے۔''

س: ''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ''ان'' کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کہاں تک اتفاق کرتی ہیں؟''

ج: ''بالکل جی۔ دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہی ہو کر گزرتا ہے لیکن اگر بیوی اچھا کھانا بنا کے، تیار شیار ہو کے پیش کرے تو پھر دل میں بہت جلدی اتر جاتی ہے۔

س: ''لوگ آپ سے زیادہ تر کس ڈش کی فرمائش کرتے ہیں؟''

ج: ''کھیر کی۔ میں کھیر بہت اچھا بناتی ہوں اور ہر قسم کے پراٹھے بھی بنا لیتی ہوں۔ آلو کے پراٹھے، مولی کے، گوبھی کے پراٹھے بہت مزے کے بناتی ہوں۔ آپی کو میرے ہاتھ کے پراٹھے اور احمد حسن کو کھیر بہت پسند ہے۔''

س: ''پہلی ڈش کون سی بنائی تھی؟''

ج: ''پہلی ڈش پندرہ سال کی عمر میں بنائی تھی جو ناکام بنی۔ پہلی دفعہ آلو اور مٹر کا سالن بنایا تھا جس میں پانی زیادہ ڈال دیا اور دو گھنٹے لگے پانی ختم ہونے میں جب پانی ختم ہوا تب تک آلو اور مٹر بھی ختم ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد ہمیشہ آپی کی نگرانی میں بناتی ہوں، اب کچھ صحیح بنا لیتی ہوں سالن وغیرہ۔''

س: ''ایسے کون سے رشتہ دار ہیں جن کی خاطر تواضع کے لیے کچن میں جانا ناگوار گزرتا ہو؟''

ج: ''ایسا کوئی نہیں۔ ویسے بھی مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔''

س: ''آپ کے خاندان کی اسپیشل ڈش۔''

ج: ''ہمارے خاندان والے گوشت کافی کھاتے ہیں۔ مٹن کڑاہی، مٹن قورمہ بہت بنتا ہے ہمارے گھر۔''

☆☆



کرن کتاب

# کرن کا دستر خوان

اقصیٰ ماہ نور، ہراج

## دم پخت چکن

اشیاء:-

| | |
|---|---|
| چکن | ایک کلو |
| پسی لال مرچ | آدھا چائے کا چمچہ |
| چاٹ مسالا | ایک چائے کا چمچہ |
| ہلدی | ایک چٹکی |
| سرکہ | دو کھانے کے چمچے |
| دہی | آدھا کپ |
| بیسن | دو سے تین کھانے کے چمچے |
| لہسن ادرک پیسٹ | ڈیڑھ کھانے کا چمچہ |
| تیل | حسب ضرورت |

ترکیب:-

گوشت کو دھو کر خشک کر لیں۔ اس میں سرکہ لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد اس میں دہی، لال مرچ، چاٹ مسالا، ہلدی، لہسن ادرک اور نمک ملا کر دو سے تین گھنٹے کے لیے میرینیٹ کریں۔

ساس پین میں تیل گرم کریں۔ اس میں گوشت کے ٹکڑے ڈال کر درمیانی آنچ پر فرائی کریں۔ رنگت سنہری ہو جائے تو نکال کر سرونگ ڈش میں رکھیں اور کوئلوں کا دھواں دے دیں۔ مزے دار دم پخت چکن تیار ہے، گرم گرم سرو کریں۔

## مدراسی کٹلس

اشیاء:-

| | |
|---|---|
| قیمہ بھنا ہوا | آدھا کپ |
| بیسن | آدھا کپ |
| انڈا | ایک کپ |
| بریڈ سلائس | چار عدد |
| ڈبل روٹی کا چورا | حسب ضرورت |
| ہرا دھنیا | چند پتے |
| پھینٹا ہوا انڈا | ایک کپ |

ترکیب:-

قیمے کو ایک پیاز، ایک چائے کا چمچہ ادرک پیسٹ اور ایک چائے کا چمچہ لہسن، ایک ہری مرچ، سرخ مرچ ایک چائے کا چمچہ، آدھا چمچہ گرم مسالا اور تیل ڈال کر بھون لیں۔ پھر اس میں بیسن، انڈا اور ڈبل روٹی کے سلائس ملا دیں اور اچھی طرح میش کر لیں۔ ہری مرچ اور ہرا دھنیا کے پتے ملا کر کٹلس کی شیپ دے دیں۔ پہلے انڈے میں ڈبو ئیں پھر ڈبل روٹی کے چورے میں لپیٹ کر شیلو فرائی کر لیں۔ سنہرا ہونے پر اتار کر کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

کرن کتاب

# دال ماش

اجزاء:۔

| | |
|---|---|
| دال ماش | ایک پاؤ |
| گھی | ایک چوتھائی کپ |
| نمک | سو گرام |
| ادرک (باریک کٹی ہوئی) | ایک چائے کا چمچہ |
| پیاز (باریک کٹی ہوئی) | ایک عدد |
| ثابت لال مرچ | چھ عدد |
| ہری مرچ | چھ عدد |
| کٹی ہوئی کالی مرچ | آدھا چائے کا چمچہ |
| زیرہ پسا ہوا | ایک چائے کا چمچہ |
| پودینہ | آدھی گڈی |
| ہرا دھنیا | آدھی گڈی |
| پانی | حسب ضرورت |
| نمک | حسب ذائقہ |
| گرم مسالا | چٹکنے کے لیے |

ترکیب:۔

کٹی ہوئی پیاز آدھی لے کر اس کو گھی میں ڈال کر سوتے کر لیں اور ساتھ ہی ادرک لہسن شامل کر دیں۔ ایک پاؤ دال میں آدھا کلو پانی ڈال کر پکنے دیں۔ ثابت لال مرچ کو توڑ کر ڈال دیں اور پسی کٹی ہوئی کالی مرچ، زیرہ اور نمک ڈال دیں۔ دال کو گلنے کے لیے چھوڑ دیں۔ جب گل جائے تو ایک دیگچی میں گھی ڈال کر پیاز ڈال لیں۔ دال کو پیاز کا تڑکا لگا لیں اور لہسن شامل کر دیں۔ گرم مسالا چھڑک لیں اور گارنش کرنے کے لیے پودینہ، دھنیا اور ہری مرچ ڈال کر گارنش کر لیں۔



# کھجور کا حلوہ



اجزاء:۔

| | |
|---|---|
| گندم کا آٹا | دو سو گرام |
| کھجوریں (گٹھلیاں نکال دیں) | دو سو گرام |
| عرق گلاب | آدھی پیالی |
| چینی | آدھی پیالی |
| پسی ہوئی الائچی | ایک چائے کا چمچہ |
| تازہ گرم دودھ | ایک کھانے کا چمچہ |
| گھی | تین چوتھائی کپ |
| بادام، پستہ اور چاندی کا ورق | سجانے کے لیے |

ترکیب:۔

دیگچی میں گندم کا آٹا مسلسل چمچہ چلاتے ہوئے بھونیں۔ اس میں آہستہ آہستہ کر کے گھی شامل کریں اور گھی کے آٹے میں مل جانے تک پکائیں۔ اس میں کھجوریں، عرق گلاب، الائچی اور چینی ملائیں اور چینی کا پانی خشک ہونے تک پکائیں اور ٹرے میں نکال کر اس کو بادام، پستے اور چاندی کے ورق سے سجا کر پیش کریں۔

# نو بیک چاکلیٹ کیک

# گجریلا

اجزاء:۔

| | |
|---|---|
| پلین چاکلیٹ | تین سو گرام |
| | (کدوکش کی ہوئی) |
| مکھن | پانچ اونس |
| کنڈینسڈ ملک | ایک ٹن |
| ڈائجسٹو بسکٹ | ایک سو دس گرام |

ترکیب:۔

لوف ٹن کو بٹر پیپر کے ساتھ لائن کر لیں۔
پلین چاکلیٹ کو پگھلائیں اور اس میں مکھن شامل کر کے مکس کریں، یہاں تک کہ وہ پگھل جائے۔
پھر اس میں کنڈینسڈ ملک ڈال کر مکس کریں۔
اب اس مکسچر کا ایک چوتھائی حصہ بیس پر ڈال کر تھوڑے ڈائجسٹو بسکٹ ڈالیں۔
پھر دوبارہ چاکلیٹ کا مکسچر ڈال کر باقی بچے بسکٹس ڈال دیں۔



اشیاء:۔

| | |
|---|---|
| گاجر | ایک کلو |
| دودھ | دو کلو |
| چاول | ایک چھٹانک |
| چینی | ایک پاؤ یا حسب ذائقہ |
| گھی | آدھا پاؤ |
| الائچی | سبز آٹھ یا دس عدد |
| کیوڑہ | حسب مرضی |
| چاندی کے ورق | حسب ضرورت |
| بادام | ایک چھٹانک |

ترکیب:۔

گاجروں کو چھیل کر ان میں سے گٹھلی نکال دیں اور کدوکش کر لیں۔ دودھ کو ایک پتیلی میں چڑھائیں اور ایک جوش آنے پر اس میں گاجر اور پہلے سے بھیگے ہوئے چاول ایک ساتھ ڈال دیں۔ کوئی گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دیکھیں کہ گاجر گل گئی ہے اور دودھ خشک ہو کر اندازے کے مطابق رہ گیا ہے تو اس میں چینی اور گھی ایک ساتھ شامل کر لیں اور چمچے سے خوب حل کریں تاکہ گھٹ کر کھیر کی شکل ہو جائے اب اس میں الائچی پیس کر اور کیوڑہ ڈال دیں اور نیچے اتار لیں اور ڈش میں نکال لیں یا پلیٹوں میں ڈال دیں اور اگر آپ کو پسند ہو تو اوپر بادام کاٹ کر ڈال دیں اور ورق لگا کر پیش کریں۔

# مجھے یہ شعر پسند ہیں

حافظ سمیرا ______ 57-این بی

یہ میری زیست کی سب سے بڑی تمنا تھی
کہ وہ شخص میرے پاس میرے نام کی طرح رہتا

شنا رحیم ______ ہریالی

تم کیا جانو محبت کے میم کا مطلب
اگر مل جائے تو معجزہ اور نہ ملے تو موت

عزوہ رئیس ______ کورنگی کراچی

محبت ہی محبت کاشت اب کے سال کرتے ہیں
چلو پھر آنے والی رُت کا استقبال کرتے ہیں
کہ اب ہم سب کو بہاروں کی ضرورت ہے
نئے سال میں آنے والی بہاروں کی ضرورت ہے

سیدہ وہ باسجاد ______ کھروڑپکا

گونجتی ہیں تیرے ذہن کے گنبد میں رات دن
جس کو نہ تو بھلا سکے وہ گفتگو ہوں میں

حورالعین اقبال ______ کراچی

نئی رُتیں نئے خواب ہیں اور چاہتوں کے سلسلے
سالِ نو کے سنگ ہیں تیری گلاب رفاقتوں کے سلسلے
کبھی دن بھر تجھے سوچنا کبھی رات بھر جاگنا
تیری یاد میں ہوں اور جنوری کی شاموں کے سلسلے

ایشال فاطمہ ______ کراچی

ایک چھوٹا گناہ محبت کا
زندگی بھر حساب لیتا ہے

تبسم بشیر حسین ______ ڈنگہ

دکھتا ہے دل تو روٹھے لبوں پر فغاں نہ ہو
یہ حکم ہے کہ آگ جلے اور دھواں نہ ہو
زخموں کو بول، اشک کو شبنم کہو کہ اب
صاحب یہ چاہتے ہیں کہ غم کا بیاں نہ ہو

ارم کمال ______ فیصل آباد

کتنی ٹھنڈک ہے تیری ہر بات میں لیکن
بات کرتا ہے تو پھر آگ لگاتا کیوں ہے
یہ تو سچ ہے کہ مجھے بننا ہے کندن لیکن
تو مگر مجھے سرِعام جلاتا کیوں ہے

گلشن چوہدری ______ گجرات

کون جانے یہ زرد رو سورج
بوجھ کیوں روشنی کا ڈھوتا ہے

صائمہ سحر ______ فیصل آباد

عجیب تماشا گر ہیں ستی کے پتلے ساقی
بے وفائی کرو تو روتے ہیں، وفا کرو تو رلاتے ہیں

ماریہ نذیر ______ سرگودھا

کتنے انمول ہوتے ہیں یہ یادوں کے رشتے بھی
کوئی یاد نہ بھی کرے تو چاہت پھر بھی رہتی ہے

تبسم فاطمہ ______ بھکر

ان کی بے رُخی کا گلا کیا کروں
دل ہی ہے نا، بھر گیا ہوگا

عریبہ ______ کراچی

اس کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت میری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

حرا نوشین ______ کراچی

بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں !
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

اقصیٰ ناصر ______ کراچی

اشعار میرے یوں تو زمانے کے لیے ہیں
کچھ شعر فقط ان کو سنانے کے لیے ہیں
یہ علم کا سودا، یہ رسالے، کتابیں
ایک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہیں

نمرہ، اقرأ ______ کراچی

معذرت دُور کر نہیں پاتے
کچھ خطائیں عجیب ہوتی ہیں
دیے امید کے بجھاتی ہیں
کچھ ہوائیں عجیب ہوتی ہیں

سحر نور ______ کراچی

اب رُتوں میں وہ تازگی ہی نہیں
جیسی ہوتی تھی روشنی ہی نہیں
لوگ بدلے ہیں رُت بھی بدلی ہے
اب وہ پہلے سی زندگی ہی نہیں

نضہ بلال ______ ڈیفنس کراچی

وہ مکاں، وہ گلی، وہ لوگ تو ہیں
کوئی اپنا وہاں نہیں ہے تو کیا
جو مرے روز و شب کا قصہ ہے
وہ تری داستاں نہیں ہے تو کیا





# مسکراتی کرنیں

## کرپشن

اسکول میں ایڈمیشن کے لیے میڈم نے فوٹوگرافر کو بلایا اور دس روپے فی اسٹوڈنٹ پر بات پکی ہوئی۔ میڈم نے ٹیچر سے کہا۔ ''بیس روپے ہر بچے سے جمع کرو۔'' ٹیچر نے کلاس میں اعلان کیا کہ صبح ہر بچہ فوٹو کے لیے پچاس روپے لے کر آئے۔ ایک بچے نے گھر جا کر ماں سے کہا۔ ''اسکول والے فوٹو کے لیے سو روپے مانگ رہے ہیں۔'' شام کو بچے کی ماں نے باپ کو بتایا، سننے کے والوں نے فوٹو کے لیے دو سو روپے مانگے ہیں۔

اب بتائیں! اس ملک سے کرپشن کیسے ختم ہو۔

(ثناء ذوالفقار......نورے والی، رحیم یار خان)

## بیک سیٹ ڈرائیور

جو عورتیں پچھلی نشست پر بیٹھ کر گاڑی چلاتی ہیں، وہ ان مردوں سے کچھ کم بری نہیں جو کھانے کی میز پر بیٹھ کر کھانا پکاتے ہیں۔

گلشن چوہدری......گجرات

## قید

ایک صاحب اپنے نئے کولیگ کو اپنا طرز زندگی بتا رہے تھے کہ...... ''دس سال سے میرے معمولات گھڑی کی طرح ایک ہی دائرے میں رہے ہیں۔ روزانہ صبح چھ بجے اٹھنا، آدھے گھنٹے بعد ناشتا کرنا، صبح آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک کام کرنا۔ ساڑھے سات بجے رات کا کھانا کھانا...... ساڑھے نو بجے سو جانا...... اور صرف سادہ غذا کھانا...... یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ میں گزشتہ دس سالوں میں کبھی بیمار نہیں ہوا۔''

''خدا کی پناہ......!'' ساتھی حیران ہو کر بولا۔ ''آپ کس جرم کی پاداش میں دس سال کے لیے اندر ہو گئے تھے؟''

صائمہ سحر......فیصل آباد

## ملاقات

ایک مینڈک نے قسمت کا حال بتانے والے کمپیوٹر کا بٹن دبایا تو جواب آیا۔

''یکم جنوری کو تمہاری ملاقات ایک نوجوان اور حسین لڑکی سے ہوگی۔'' مینڈک نے خوشی سے بے تاب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''ملاقات کہاں ہوگی۔ کسی پارٹی میں یا کسی نہر کنارے۔''

کمپیوٹر سے جواب آیا۔ ''میڈیکل کالج کی لیبارٹری میں آپریشن کرنے والی ٹیبل پر۔''

ایشال فاطمہ......کراچی

## علاج

سرکاری ملازم نے معالج سے کہا۔

''براہ کرم مجھے دبلا ہونے کا کوئی موثر طریقہ بتائیں۔'' معالج نے جواب دیا۔

''بے حد آسان طریقہ بتاتا ہوں، آپ بس اتنا کریں کہ صرف اپنی تنخواہ سے کھایا کریں۔''

شازیہ امجد......وزیر آباد

## لائٹ

جب لائٹ چلی جائے تو...... امریکی پاور ہاؤس کال کرتے ہیں۔

جاپانی فیوز چیک کرتے ہیں اور پاکستانی گلی میں جھانک کر کہتے ہیں......

''آ ہو ساریاں دی گئی اے۔''

فوزیہ ثمر بٹ......گجرات

## سیاست دان

کچھ سیاست دانوں سے بھری ہوئی بس بے قابو ہو کر ایک کھیت میں جا گھسی اور بری طرح تباہ ہو گئی۔ شور کی آواز سن کر ایک کسان فارم ہاؤس سے باہر نکلا اور ایک بڑا گڑھا کھود کر سارے سیاست دانوں کو دفنا دیا۔

دو دن بعد پولیس کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے کسان سے بس کا معاملہ دریافت کیا۔

کسان نے تفصیل بتائی تو انسپکٹر نے پوچھا۔

''کیا تمام سیاست دان مر چکے تھے؟''

کسان نے جواب دیا۔ ''کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ زندہ ہیں، مگر آپ کو تو پتا ہے نا جناب، سیاست دان کتنا جھوٹ بولتے ہیں۔''

نورین وقار......کراچی

# کچھ موتی چنے ہیں

## تعریف

سنو خدا نے بے شمار مخلوقات پیدا کی ہیں اور ہر مخلوق کو زیر کرنے کا طریقہ بھی مختلف ہے۔ درندے پکڑنے کے لیے اسے شکار کرتے ہیں۔ پرندے اسیر کرنے کے لیے دانہ ڈالتے ہیں۔ آبی جانوروں کو پھانسنے کے لیے جال ڈالتے ہیں لیکن اشرف المخلوقات کے لیے تعریف کا ایک جملہ کافی ہے اور سنو ہر مخلوق اسیر ہو کر آزادی چاہتی ہے مگر یہ آدم زاد تعریف کے جال میں قید ہو کر کبھی آزادی نہیں چاہتا مگر اب تم قیامت تک اسے اس ہتھیار سے زیر کرتے رہو گے۔

(منورہ نوری خلیق......آزمائش)

صائمہ سحر......فیصل آباد

## خود غرضی

انسانوں کو ایک دوسرے سے کسی نہ کسی غرض نے باندھ رکھا ہے۔ غرض نہ ہو تو شاید ہر انسان اپنے محور میں ایک تنہا زندگی گزارتا، شاید ہم جیسے گناہ گاروں نے خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی غرض اور طلب کا رشتہ باندھ رکھا ہے، یہ نہ ہو تو ہم شاید خدا کو بالکل بھلا ڈالیں۔

(عنیزہ سید......دل من مسافر من)

تبسم بشیر حسین......ڈنگہ

## عزت

ایک کمزور اور وضع دار انسان کے لیے عزت کی فلاسفی بڑی الجھا دینے والی ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ کی عزت سے زیادہ بے عزت کر دینے والی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی۔ اس کے چھن جانے کا خوف اور اس کو قائم و دائم رکھنے کے جتن بعض اوقات انسان کے کندھوں کو بوجھ کے سوا کچھ نہیں دیتے۔

(تنزیلہ ریاض......عہدِ الست)

صائمہ مشتاق......بھاگٹانوالہ سرگودھا

## جوتا چرانے کی رسم

اس موقع پر دولہا کی سالیاں اپنے برادران لاء کو جوتیاں اتار کر بیٹھنے پر زور دیتی ہیں۔ چنانچہ جب وہ جوتیاں اتارتا ہے تو موقع پا کر یہ سالیاں جوتیاں غائب کر دیتی ہیں۔ بعد میں اس جوتی کی واپسی کے لیے دولہا کو منہ مانگی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جوتی چرانے کی یہ رسم شادی بیاہ کے علاوہ ہر جمعے کو مسجدوں کے باہر بھی ادا کی جاتی ہے اور یہ رسم سالیاں ادا نہیں کرتیں۔ ممکن ہے یہ رسم سالے ادا کرتے ہوں تاہم میں نے اس ضمن میں کوئی تحقیق نہیں کی۔

(عطاء الحق قاسمی......قندِ مکرر)

فوزیہ ثمر بٹ......گجرات

## ناقص قانون

اگر تم قانون کو ناقص سمجھتے ہو تو اجتماعی کوششوں سے اسے بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ اگر اس کی ہمت نہیں ہے تو تمہیں اس قانون کا پابند رہنا پڑے گا۔ اگر تم اجتماعی حیثیت سے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس سے متفق ہو۔ اب اگر متفق ہونے کے باوجود بھی تم اس کی حدود سے نکلنے کی کوشش کرو تو تمہاری سزا موت ہی ہونی چاہیے۔

(ابن صفی)

افشاں سمیع......کراچی

## انسانی خیالات

انسان کے دماغ میں اچھے اور برے طرح طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے مگر انسان کی اصل انسانیت یہ ہے کہ وہ اپنے خیالوں کی تطہیر اور تہذیب کرتا رہے۔ اگر انسان اپنے ذہن میں آنے والے خیالات کو جوں کا توں ظاہر کرے گا تو انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔

(منشی فیاض علی......شمیم)

اقرا سرور......ڈی جی خان